

خالد بشیر احمد



شخص، شاعر اور ادیب

ترتیب جاوید انور

خالد بشیر احمد

شخص، شاعر اور ادیب

ترتیب

جاوید انور

جملہ حقوق بحق شاعر محفوظ

کتاب کا نام: خالد بشیر احمد
شخص، شاعر اور ادیب

ترتیب: جاوید انور

اشاعت: مئی ۲۰۱۴ء

تعداد: ۵۰۰

کمپوزنگ و سرورق: عظمیٰ اسکرین، وارانسی

فون: 0542-2450355, 2451300

صفحات: ۳۶۸ صفحات

قیمت: ۵۰۰ روپے

ناشر: تحریک ادب، وارانسی

طباعت: مہاویر پریس، وارانسی

ملنے کا پتہ
کتاب گھر

مولانا آزاد روڈ، سرینگر۔ ۱۹۰۰۰۱ (کشمیر)

Kitab Ghar

Maulana Azad Road, Srinagar-190001 (Kashmir)

جاوید انور

اردو آشیانہ، ۱۶۷، آفاق خان کا احاطہ، منڈا ڈیہہ بازار، وارانسی۔ ۲۲۱۱۰۳

Jawed Anwar

Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata, Manduadeeh Bazar

Varanasi-221103 (UP) Cell: 09935957330

e-mail: jaweanwar@gmail.com

ترتیب

دو حرف جاوید انور ۵

سوانحی خاکہ

خالد بشیر احمد ۱۰
جاوید آذر ۳۷
ایک دیوانے کا کیری کچر

صدائے نیم شب

عصری آگہی سے متصف شاعر
صدائے نیم شب..... ایک تاثر
پر و فیسر حامدی کاشمیری ۴۷
مصور سبزواری ۵۱
زستارہ آفتابے
پورن سنگھ ہنر ۵۵
اردو شاعری میں نئی آواز
ہمایوں اقبال ۶۲
حسی تجربوں کی باز آفرینی
رضوان احمد خان ۶۷
جدید رجحانات کی کامیاب کڑی
مصطفیٰ اکبر ۷۱
جدید ترغزل کی توانا آواز
محمد ابوصالح ۷۴
نئی آواز نئے امکانات
جاوید آذر ۷۶
سچے جذبات کی شاعری
پر و فیسر محمد زماں آزرده ۸۲

خواب پارہ

خواب پاروں کا شاعر
آشوب کا گہرا احساس
پر و فیسر حامدی کاشمیری ۸۶
پر و فیسر غلام رسول ملک ۸۹
خالد بشیر احمد کا طرزِ سخن
جاوید انور ۹۶

۱۰۴	پروفیسر محمد اسد اللہ وانی	خالد بشیر احمد..... بحیثیت شاعر
۱۲۸	ڈاکٹر فرید پریجتی	احتجاجی لب و لہجہ کا شاعر
۱۳۱	ڈاکٹر شفیق سوپوری	خالد بشیر احمد۔ صدائے نیم شب اور خواب پارہ کا شاعر
۱۴۰	ڈاکٹر پریگی رومانی	رنگ اور خوشبو کا شاعر خالد بشیر
۱۴۹	بیٹاب جے پوری	خالد بشیر 'خواب پارہ' کے ناظر میں
۱۵۳	جاوید انور	خوشبو کا پیکر تراش۔ خالد بشیر احمد
۱۶۳	محمد الیاس	خالد بشیر احمد کی شعری خدمات

دیدہ آب رواں

۲۰۳	پروفیسر رحمن راہی	خالد بشیر احمد کی فسون گری
۲۰۵	پروفیسر حامدی کاشمیری	اسلوب نثر جس کی نظیر نہیں
۲۰۹	پروفیسر غلام رسول ملک	ایک قابل قدر تحقیقی کارنامہ
۲۱۳	پروفیسر قدوس جاوید	زندہ رو و کشمیر
۲۲۰	پروفیسر محمد اشرف وانی	دریائے جہلم کی مستند تاریخ
۲۲۳	پروفیسر محمد اسد اللہ وانی	دیدہ آب رواں۔ محققانہ ژرف نگاہی
۲۲۸	ڈاکٹر فریدہ کول	دیدہ آب رواں کی ادبی اہمیت

تاثرات

۲۳۱

سخن ہائے خوشبو

۲۳۵

دو حرف

جاوید انور

جوں و کشمیر اردو زبان و ادب کا ایک ایسا مرکز رہا ہے جس کی چمک ۱۹۸۹ء سے شروع ہوئے نامساعد حالات بھی ماند نہ کر سکے۔ گو کہ پوری دنیا اور ہندوستان و پاکستان کے ادبی مراکز اور رسائل و جرائد کی توجہ آج تک یا تو نہ کے برابر رہی ہے یا بہت کم رہی ہے۔ تاہم یہاں کے ادیب و شاعر اردو ادب کو سینے سے لگائے نظمیں اور نثریہ تخلیقات کے ساتھ ساتھ تاریخی اور دوسرے قسم کے جذبات کا اظہار بھی اردو میں کرتے رہے اور زبان و ادب کی آبیاری کرتے رہے۔

خالد بشیر احمد وادی کشمیر کے ایک ایسے ہی فعال ادیب و شاعر ہیں جنہوں نے اردو غزل اور مضامین کے ساتھ ساتھ تاریخی حقائق کے اظہار کی قابل قدر کاوشیں کی ہیں۔

خالد بشیر احمد کی ان ادبی کاوشوں کے متعلق اظہارات کو ایک کتاب کے محدود صفحات میں پورے طور پر سمیٹنا کارے دارد والا معاملہ ہے۔ درحقیقت ان کے فن اور شخصیت پر جو مضامین اس کتاب میں شامل ہیں وہ ان کی قدر بسیط اور کثیر الجہات ادبی شخصیت تہہ در تہہ اور پرت در پرت امکانات میں معاون تو ہیں لیکن جس طرح ان کی ادبی کاوشیں جاری ہیں اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں شامل مضامین ان کی شخصیت اور فن کے پہلوؤں کی جانب سنجیدگی سے اہل ادب کی توجہ مرکوز کرانے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔

جیسا میں نے عرض کیا کہ خالد بشیر احمد نے کئی اصناف ادب کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا

ہے۔ غزل، ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ تاریخی مضامین اور ان کے متعلق کتب کا اگر تجزیہ کیا جائے کہ ان میں غالب رجحان کس جانب ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ شاید کسی ایک نتیجہ پر نہ پہنچا جاسکے۔ اس کی وجہ یہ ہے اور یقیناً یہ ان کی خصوصیات میں شمار کیا جائے گا کہ کسی ایک صنف کو ان کا غالب رجحان قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ ہر صنف پر ان کی یکساں قدرت کی نشاندہی ان کی تخلیقات کے مطالعے سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

ریاست جموں و کشمیر سے مجھے روحانی لگاؤ ہے۔ یہاں مجھے جو محبتیں اور شفقتیں ملیں ان کا بیان الفاظ میں ممکن نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ جس نے مجھے ایک لفظ سکھایا میں اس کا غلام۔ اس نکتہ نظر کو مزید وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ جس مٹی سے محبت ملے اس کا قرض ادا کرنا فرض ہے۔ پس اس نکتہ نظر کو میں نے اپنی ادبی زندگی کا ایک اہم پہلو بنایا ہوا ہے۔ دلیل کے لیے میرے ادبی جریدہ سہ ماہی 'تحریک ادب' کے اوراق دیکھے جاسکتے ہیں۔

خالد بشیر احمد کی غزلیں 'تحریک ادب' کے صفحات کی زینت بنتی رہی ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ان کے فن اور شخصیت پر ایک گوشہ بھی 'تحریک ادب' کے شمارہ جنوری تا مارچ ۱۹۶۱ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کی غزلوں کے مجموعے تو میری نظر سے گزرے تھے، جب دیدہ آب رواں اور کچھ دوسرے ادبی مضامین میری نظر سے گزرے تو میں نے اپنا فرض جانا کہ ان تمام کو یکجا کر کے جو کہ ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں کو کتابی صورت میں ترتیب دوں۔

کتاب کا آخری حصہ 'نخن ہائے خوشبو' کے زیر عنوان خالد بشیر احمد کی مطبوعہ وغیرہ مطبوعہ غزلوں پر مشتمل ہے جنہیں قارئین کی دلچسپی کے لیے شامل اشاعت کیا گیا ہے۔

میں خالد بشیر احمد صاحب کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ انہوں نے میری اس التجا پر توجہ کی اور مجھے اجازت مرحمت فرمائی کہ اس ادبی کارنیک کو عملی جامہ پہنا سکوں۔

میں ان تمام حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کے مضامین اس کتاب میں شامل ہیں۔ یہ مضامین مجھے دستیاب نہ ہوتے تو اس کتاب کی تکمیل ایک تصور ہی رہتا۔

۲۷ فروری ۲۰۱۲ء

تعارف

سوانحی خاکہ

نام	خالد بشیر احمد
یوم پیدائش	۲۰ فروری ۱۹۵۴ء
جائے پیدائش	سونہ وار، سرینگر، کشمیر
تعلیم	ایم۔ اے (سیاسات) یونیورسٹی آف کشمیر ۱۹۷۷ء
سرکاری ملازمت کی ابتدا	۱۹۸۰ء بحیثیت انفارمیشن افسر
موجودہ عہدہ	سیکریٹری، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لٹریچر
سابقہ عہدے	ڈائریکٹر، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈائریکٹر، لائبریری اینڈ ریسرچ ڈائریکٹر آرکائیوز، آرکیالوجی اینڈ میوزیمز اسٹیشنل سیکریٹری، ہاؤسنگ اینڈ اربن ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ
ادبی سفر کا آغاز	۱۵ جنوری ۱۹۷۲ء کو پہلا افسانہ 'نوکھا ملن' روز نامہ 'آفتاب' میں چھپا۔ اس کے بعد درجنوں افسانے لکھے جو مقامی اخبارات میں چھپتے رہے۔ ۱۹۷۴-۷۵ء کے آس پاس شاعری کی طرف رجحان بڑھا اور ابتداء میں غزلیں اور نظمیں مقامی اخبارات اور جراند میں چھپتی رہیں۔
صحافت	۱۹۷۹ء میں کشمیر کا کثیر الاشاعت روز نامہ 'آفتاب' جوائین کیا۔ محکمہ اطلاعات میں ماہنامہ 'تغیر' اور پندرہ روزہ 'مکتوب' کی ادارت سنبھالی اور ایک دہائی تک یہ فرض منصبی ادا کیا۔ دو دہائیوں سے کشمیر کے متعلق مختلف موضوعات پر لکھنا جاری ہے۔
تصانیف	صدائے نیم شب (شعری مجموعہ) ۱۹۸۳ء جہلم - دی ریور تھر وائی بیک یارڈ (انگریزی) ۲۰۰۱ء Jhelum, The River Through My Backyard خواب پارہ (شعری مجموعہ) ۲۰۰۸ء

- زیر ترتیب
- کشمیر..... مٹھا آف اے نرٹیو (انگریزی) Kashmir, Myth Of A Narrato
- اے واک تھر وکشمیر ہسٹری (انگریزی) A Walk Through Kashmir History
- تالیف
- ماہنامہ 'تعمیر' کے جموں و کشمیر اُردو ادب نمبر، مجوز نمبر، پریم چند نمبر
- ادارت
- ماہنامہ 'تعمیر' پندرہ روزہ مکتوب، اسٹوڈنٹ ایڈیٹر کالج میگزین پرتاپ (اردو)
- انتیاز
- ریاست جموں و کشمیر کی صحافت میں ۱۹۷۹ء میں پہلی مرتبہ روزمرہ کے حالات پر شعری کارٹون اختراع کیا جو روزنامہ 'آفتاب' کے صفحہ اول پر جلی حروف میں شائع ہوتا تھا۔ ریاست کی صحافت میں پہلی بار کسی رپورٹر کی بائی لائن، شائع ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ وادی کے قدیم ترین کالج، ایس پی کالج کے جشن صد سالہ پر کالج کا ترانہ تحریر کیا۔
- انعامات
- 'صدائے نیم شب' پڑ جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لٹریچر کی جانب سے سال ۱۹۸۳ء کی بہترین اُردو کتاب کا ایوارڈ
- دیدیہ آب رواں پڑ جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لٹریچر کی جانب سے سال ۲۰۱۰ء کی بہترین اُردو کتاب کا ایوارڈ۔
- تحقیق
- جموں یونیورسٹی نے 'خالد بشیر احمد کی شعری خدمات' کے موضوع پر محمد الیاس کے تحقیقی مقالہ پر ایم فل کی ڈگری عطا کی۔
- ٹریننگ
- (۱) اسپیشل کورس ان جرنلزم، انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونی کیشن، نئی دہلی
- (۲) اسپیشل کورس ان ای گوننس، سینٹر فار گڈ گورننس، حیدر آباد ممبئی، ممبئی رائیٹرز کلب، سرینگر
- رہائش
- وی ایوڈ، لین۔ ۱، سیکٹر بی، گلشن نگر، بائی پاس، سرینگر کشمیر۔ ۱۹۰۰۱۵
- The Abade, Lane-1, Sector-B, Gulshan Nagar, Bypass,
- Srinagar-190015 (Kashmir)
- +91-9419011323
- kbahmad05@gmail.com
- موبائل فون
- ای میل

خودنوشت

خالد بشیر احمد

میری زندگی میں حیرت انگیز اور پرازفسوں واقعات بدرجہ قلیل تر بھی موجود نہیں ہیں۔ کبھی ایسا کوئی کارنامہ سرزد نہیں ہو سکا جس پر فخر سے سینہ پھولتا۔ ساری زندگی سست رفتار سے، مگر اپنی شرطوں پر گزاری۔ اللہ کا شکر ہے کہ کبھی کچھ عجلت میں کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئی۔ اپنی مختصر سی دنیا میں مگن ہوں، جس میں چھوٹی چھوٹی خوشیاں مسرت فراہم کرتی ہیں اور ذرا ذرا سے مسائل پریشان کرتے ہیں۔ پیدائش سرینگر شہر کے معروف علاقہ سونہ وار میں ہوئی۔ اُس دن کشمیر نے دبیز سفید چادر اوڑھ لی تھی۔ گھر کے بڑوں کے مطابق غضب کی سردی تھی اور برف گھنٹوں اونچی جمع ہو کر جم گئی تھی۔ پانی کے نلوں کے ساتھ ساتھ سارا ماحول منجمد تھا۔ ایسے میں گھر میں پانی موجود نہیں تھا جو جمی ہوئی برف آگ پر پگھلا کر میسر کیا گیا۔ اسی پانی سے مجھے پہلی بار نہلایا گیا۔

میرے آبا و اجداد سونہ وار میں ہی آباد کشمیری الاصل تھے جو میری پیدائش سے کئی نسلیں قبل مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ والد صاحب محکمہ کسٹمز میں ملازم تھے۔ چار بھائیوں اور دو بہنوں پر مشتمل ہم والدین کی چھ اولادیں تھیں جن میں سب سے بڑی ہمیشہ اور سب سے چھوٹا میں ہوں۔ سب سے بڑے بھائی محمد شفیع صاحب ڈاکٹر ہیں اور مدینہ منورہ (سعودی عرب) میں ڈیڑھ دہائی تک نوکری کر کے اب فراغت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ دوسرے برادر غلام محی الدین صاحب کا انتقال فروری ۲۰۰۸ء میں ہوا۔ اُن کے بعد دوسری ہمیشہ ہیں۔ تیسرے برادر ڈاکٹر محمد اسماعیل صاحب کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ جیا لوجی اینڈ جیو فزیکس کے

پروفیسر اور سربراہ کی حیثیت سے فروری ۲۰۱۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ وہ طبقات الارض کے مقتدر سائنسدان ہیں۔

تعلیمی ریکارڈ کے مطابق میری پیدائش ۲۰ فروری ۱۹۵۴ء کو ہوئی ہے۔ اُن دنوں فروری کے مہینہ میں شدید سردی اور برفباری کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اگر برفباری شام کو شروع ہوتی تو صبح تک برف کی کئی فٹ اونچی تہہ جمع ہو جاتی اور بازار سے ناشتے کی روٹی لانے کے لئے پہلے برف ہٹا کر راستہ بنانا پڑتا تھا۔ اس طرح جو تگ راستہ بن جاتا تھا اُس کے دونوں طرف برف کے پہاڑ جمع ہو جاتے جو اکثر سات آٹھ سال کے بچے کے قد سے بلند ہوتے۔ برف کے ساتھ پیدائشی قربت کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مجھے گرتے ہوئے برف کے گولے اور گھٹنوں تک اونچی برف کیوں پسند ہے۔ بچپن میں برف سے کھیلنا محبوب مشغلہ تھا۔ صاف و شفاف سفید برف کی موٹی تہہ پر چل کر اپنے جوتوں کے نشان چھوڑنا بہت اچھا لگتا تھا۔ پاؤں کے نیچے دبنے والی برف کی چرماتی آواز طربہ سنگیت سے زیادہ مزہ دیتی۔ ایسا ہی مزہ موسم خزاں میں گزرے ہوئے چنار کے سرخی مائل پتوں پر چلنے میں آتا۔ ہم عمر بچوں کے ساتھ برف کے انسان بنانا بھی بے حد اچھا لگتا تھا گو کہ اس کھیل میں اُن گلیوں کے پور سن ہو جاتے۔

جب میری سرکاری ملازمت کی ابتدا ہوئی تو برفباری کے دوران اکثر امیر اکدل میں واقع اپنے دفتر سے دریائے جہلم کے کنارے کنارے پیدل چل کر گھر جاتا اور چھتری کے بغیر گرتی ہوئی برف کا مزہ لیتا۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں نے اُردو کے نامور شاعر مظہر امام جو اُن دنوں دُور درشن کی ملازمت کے سلسلے میں سرینگر میں مقیم تھے، کو اچانک رُک کر اپنے ساتھی سے کہتے سنا کہ ”دُنیا میں برفباری ایسا خوبصورت منظر اور کوئی نہیں ہے“۔ آج بھی جب برف گرتی ہے تو میں اس کا مزہ لینے کے لئے کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ اور اگر گھر سے باہر ہوں تو میرے دوست برف کے ساتھ میری وارفتگی کو دیکھتے ہوئے ٹیلی فون کے ذریعہ برفباری کی نوید دیتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ برف کے ساتھ اس وارفتگی کے باوجود میری شاعری میں شاید اس ایک شعر کے سوا برف کہیں بھی موجود نہیں۔

کہہ دے ورنہ لب پر بول اٹک جائیں گے
بھاری برف میں گھر، آنگن سب ڈھک جائیں گے

بچپن کی یادوں میں جو بات اب تک ذہن میں تازہ ہے، یہ کہ وہ بڑی بے فکری کے دن تھے۔ ایسا معاملہ شاید سب کے ساتھ ہوتا ہوگا، لیکن میں آج بھی وہ دن جینا چاہتا ہوں اور کئی بار تصور میں ایک ایسی کیفیت سے گزرتا ہوں جس میں اُن دنوں کے مناظر اور آوازیں دکھائی اور سنائی دیتی ہیں۔ سونہ وار میں جہاں ہم رہتے تھے، وہ دریائے جہلم اور شاہراہ کے درمیان واقع ایک چھوٹا سا محلہ ہے جس کی انفرادیت اس بات میں تھی کہ وہاں سب گھر ایک ہی بڑے خاندان کی منقسم اور پھیلی ہوئی اکائیاں تھے۔ یوں جو ہمارے ہمسایے تھے وہی رشتہ دار بھی تھے۔ اس ماحول میں جن بچوں کے ساتھ اٹھنا، بیٹھنا، کھیلنا کو دنا تھا، وہ سب میرے کزن تھے۔

والد صاحب کا نام محمد احسن بٹ تھا جو ہر اچھے والد کی طرح بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ علاقہ کے اصحابِ عزت و توقیر میں تھے اور شرافت اور دیانت اُن کا خاصہ تھی۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ وہ جب بھی محلہ یا بازار سے نکلتے تو لوگ اُن کی تعظیم کرتے۔ گھر کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اور اس پر چھ اولادوں کو پالنا پوسنا اور تعلیم دلانا، دو دو بیٹیوں کی شادی کرنا، نیا مکان تعمیر کرنا اور بڑے بیٹے کو ڈاکٹری کی تعلیم دلانا واقعی کارے دار دوالا معاملہ تھا لیکن انہوں نے اپنے جیتے جی یہ ذمہ داری اپنے اسم گرامی کی طرح احسن طریقے سے نبھائی۔ اس کا رستہ میں انہیں قرض بھی لینا پڑا اور پستیٰ زمین بیچنے کا دل شکن فیصلہ بھی کرنا پڑا۔ بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں والدین کا چہیتا تھا۔ ۷ جولائی ۱۹۶۹ء کو جب میں نے نویں جماعت کا امتحان پاس کر کے دسویں میں داخلہ لیا ہی تھا کہ والد صاحب کا اچانک انتقال ہوا۔ انتقال کے وقت اُن کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ اُن کے سنگ مزار پر اس نسبت سے علامہ اقبال کا یہ شعر کندہ ہے:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم

چوں مرگِ آید تبسم بر لبِ اوست

والد صاحب کے انتقال سے قبل بڑے بھائی صاحب ایم بی بی ایس کر کے ڈاکٹر کی

حیثیت سے سرکاری ملازم ہو گئے تھے اور عمر میں اُن سے چھوٹے بھائی صاحب غلام محی الدین بھی محکمہ میکینکل اینڈ اسٹورز میں ایک نچلی اسامی پر تعینات تھے۔

والدہ محترمہ ایک باہمت، غیرت مند اور ہٹ کی پکی خاتون تھیں۔ وہ اُن پر بڑھ تھیں لیکن معاملات کو سمجھنے اور سلجھانے میں اُن کی ذہانت کا جواب نہیں تھا۔ محلے کی اکثر خواتین اُن سے کئی معاملات میں مشورہ لیتیں۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد انہوں نے گھر کو سنبھالا۔ صحت کے معاملے میں وہ دھان پان سی خاتون اور بلڈ پریشر کی دائمی مریضہ تھیں۔ اُن کی صحت اکثر خراب رہتی لیکن انہوں نے خرابی صحت کو کبھی بھی اپنے اعصاب پر سوار نہیں ہونے دیا۔ زندگی کے آخری ایام تک کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور گھر کی صاف صفائی اپنے ہاتھوں سے کرتی تھیں۔ میں اپنی والدہ کے بہت قریب رہا اور اس وجہ سے اُن کی عنایت اور محبت کو بطور خاص بڑھتا رہا۔ بڑے بھائی صاحب نوکری کے سلسلہ میں گھر سے باہر ہی رہے اور دوسرے بھائی صاحب علی گڑھ سے پی ایچ ڈی کرنے کے بعد دہرہ دون کے انسٹیٹیوٹ آف ہمالین جیالوجی میں بطور سائنسدان تعینات ہو کر وہیں منتقل ہوئے۔ ہمیشہ اُن کی شادی والد صاحب کی حیات میں ہی ہوئی تھی۔ اس طرح میں اور برادر غلام محی الدین ہی زیادہ تر والدہ کی قربت میں رہے۔ آخری دو ایک برسوں میں برادر محمد اسماعیل بھی دہرہ دون سے منتقل ہو کر کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر اور شعبہ جیالوجی اینڈ جیوفزیکس کے سربراہ کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ میں جب کبھی بیمار یا پریشان ہوتا تو والدہ محترمہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتا۔ ایسے میں وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتیں جس سے سارے درد اور پریشانیاں دُور ہوتیں۔ ایسا اُن کی زندگی کے آخری ایام تک رہا۔

دُنیا کی سب مائیں اچھی ہوتی ہیں

ان کے دست شفقت گویا ایک دُعا ہوتے ہیں

جن کے لمس سے سارے درد ہوا ہوتے ہیں

اولادوں کے حق میں سچی ہوتی ہیں

دُنیا کی سب مائیں اچھی ہوتی ہیں

عمر کے آخری برسوں میں والدہ محترمہ عارضہ قلب میں مبتلا ہو گئیں جو بالآخر ۸ نومبر ۲۰۰۳ء کو اُن کی جان لے بیٹھا۔ آخری چند مہینوں میں جب وہ بستر مرگ پر تھیں میں تقریباً ہر لمحہ اُن کے ساتھ رہا۔ اُن کے بغیر میں زندگی کا تصور بھی نہیں کر پا رہا تھا اور اکثر اللہ سے دُعا کرتا کہ ہم دونوں کا اختتام بالآخر ایک ساتھ ہو، تاکہ ایک کو دوسرے کی جدائی کا غم برداشت نہ کرنا پڑے۔ مگر اللہ کے فیصلوں کے آگے کس کی چلتی ہے؟ والدہ محترمہ کا انتقال میری زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اس سانحہ نے اچانک جیسے مجھے بے سہارا اور تنہا کر دیا۔ اگرچہ وہ مجھ سے بہت خوش تھیں لیکن شادی نہ کر کے میں نے انہیں بڑی ذہنی تکلیف پہنچائی تھی جس کا ذکر وہ اگرچہ مجھ سے نہیں کرتیں لیکن اُن کے چہرے سے صاف عیاں تھا۔ میرے دوستوں سے البتہ وہ اس دُکھ کا اظہار کرتیں۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

گھر کا ماحول سخت نظم و ضبط والا تھا۔ اگرچہ والد صاحب اپنے شانت سو بھاد کی وجہ سے بچوں پر غصہ نہیں کرتے تھے تاہم بڑے بھائی صاحب چھوٹی سے چھوٹی غلطی پر بھی نہ صرف جھاڑ پلاتے بلکہ مار پیٹ بھی کرتے تھے۔ دو واقعات کا ذکر خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔ بچپن میں ایک دن شام سے پہلے میں محلہ کے دیگر بچوں کے ساتھ گھر سے لگتی ہوئی شاہراہ کے پار کھلے میدان، جسے لولی باغ کہتے تھے اور جو بعد میں بھارتیہ فوج نے اپنی تحویل میں لیا، میں کھیل رہا تھا۔ اچانک بادل زور کی گرج کے ساتھ پھٹ گئے۔ ہم سب گھبرا گئے۔ سارے بچے گھر لوٹے لیکن اُس شام جو میری پٹائی ہوئی وہ آج تک حافظے میں محفوظ ہے۔ بھائی صاحب نے بڑی فراخ دلی سے ہاتھ چلایا اور بچھو بوٹی سے میری پٹائی کی۔ اُس شام امر ناتھ یا ترا کی چھڑی روانہ ہونے والی تھی اور سارا سونہ واریہ منظر دیکھنے کے لیے شاہراہ پر اُٹھ آیا تھا۔ میں بدن پر مٹی کا لیپ لگا کر گھر کے برآمدے میں دردسہلا رہا تھا۔ ایسے ہی نوجوانی کے ایام میں ایک مرتبہ میں گھر کے باہر شاہراہ کے کنارے کھڑا تھا کہ مجھے بھائی صاحب بس سے اُترتے ہوئے دکھائی دیے۔ چنانچہ میں جلدی سے بھاگ کر گھر پہنچا۔ اس پر بھی زبردست پٹائی ہوئی اور وجہ اُن کے اس سوال میں موجود تھی کہ تمہیں کیا لگا میں نے تمہیں سڑک پر نہیں دیکھا تھا؟ ایسے ماحول میں آوارہ گردی یا خرمستی، جو عام طور پر بچوں اور نوجوانوں کا معمول ہے، کرنے کا سوال ہی پیدا نہ

ہوتا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ سختی فائدہ مند رہی۔ میں کم و بیش کتابی کیرئیر این گیا اور اول جماعت سے لے کر ایم اے تک میں ہر امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا گھر کا ماحول نظم و ضبط اور نگرانی والا تھا جہاں حصول علم کے علاوہ کسی اور سرگرمی کی گنجائش بہت کم تھی۔ سینما بینی اور سگریٹ نوشی شجر ممنوعہ تھے۔ سگریٹ نوشی نہ صرف یہ کہ میں نے کبھی نہیں کی بلکہ اسے نفرت کی حد تک ناپسند کرتا ہوں۔ مجھے سگریٹ کے دھوئیں سے بہت پریشانی ہوتی ہے۔ سولہ سال کی عمر تک میں نے سینما کا دروازہ نہیں دیکھا تھا۔ ہائی اسکول بادی باغیہ وارہ میں واقع تھا۔ گھر اور اسکول کے درمیان براڈ وے سینما واقع تھا لیکن اسکول جاتے ہوئے یا واپسی پر میں کبھی بھی سڑک کے اُس طرف نہیں چلتا تھا جہاں سینما موجود تھا اور ارادتا کبھی اُس طرف نہیں دیکھا۔ پہلی فلم میں نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد دیکھی۔ یہ جیمس بانڈ سیریز کی انگریزی فلم You only live twice تھی جس میں مشہور اداکار شان کانری نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ میرے لیے داخلے کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے بٹہ وارہ کے میرے ایک ہم جماعت بشیر احمد کو پولیس والوں کے ڈنڈے کھانے پڑے جس سے اُن کے چہرے سے خون بھی نکل آیا۔ موصوف نے میرے لیے یہ سزا خوشی خوشی سہہ لی۔ معلوم نہیں آجکل وہ کہاں ہیں۔ بہر حال جہاں بھی ہوں اللہ انہیں خوش رکھے کہ میرے لئے انہوں نے اپنا خون بہایا ہے۔ یہاں یہ اعتراف کرنا مناسب ہوگا کہ فلم دیکھ کر میرے پلے کچھ نہیں پڑا جبکہ سینما ہال میں موجود اکثر ظاہر اُن پڑھ لوگ فلم کے ہر مکالمے کا بھرپور لطف لے رہے تھے۔ اس سے قبل بچپن میں جب بھائی محمد اسماعیل صاحب نے فلم ماں کے آنسوں دیکھی تھ تو انہوں نے فلم کی کہانی سنائی جس میں ایک سین اس طرح کا تھا کہ ایک کردار دوسرے کردار سے اپنا پیسہ وصول کرنے کے لیے ایک سال بعد اُس کے پاس جاتا ہے۔ ایک لمبے عرصہ تک میں اس شش و پنج میں تھا کہ بھائی صاحب تو تین گھنٹوں میں ہی فلم دیکھ کر واپس آگئے تو اس دوران ایک سال کیسے گزر گیا۔

میرے کزن نیاز احمد خوب فلمیں دیکھتے تھے اور ہر نئی فلم دیکھ کر اُس کی کہانی اور مکالمے ایک ہفتے تک چٹخارے لے لے کر سُنا تے تا ایں کہ دوسری فلم دیکھ کر نہ آتے جس کے

بعد یہ سلسلہ پھر شروع ہوتا۔ میرے ہم عمر کنز میں محمد رفیع نے سب سے پہلے فلمیں دیکھنی شروع کی۔ اُن کے ماموں زاد بھائی فاروق احمد پرانے شہر میں واقع اپنے گھر سے ہر جمعہ کو فلم دیکھنے سونہ وار آتے اور انہیں ساتھ لے کر سینما جاتے۔ اُن دنوں 'براڈوے سینما' نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ اکثر فلم بین سڑک کے کنارے کھڑے لوگوں سے پوچھتے براڈوے کو کونسا راستہ جاتا ہے؟ نہ جانے مجھے کیوں یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوگ اس طرح جوق در جوق سینما دیکھنے آتے ہیں۔ میں اگلی بار پوچھنے والے کو غلط راستے پر ڈالنے کی سوچتا لیکن ہر مرتبہ صحیح راستہ ہی بتا دیتا۔ خود میں نے کالج میں پڑھائی کے دوران ہی فلمیں دیکھنی شروع کیں جس میں محمد رفیع ہمیشہ ساتھ ہوتے۔ دراصل ہمارے ایک مشترکہ دوست اور ہم جماعتی عبدالسلام، جن کا ہاتھ کشادہ تھا، ہمیں فلمیں دکھانے لے جاتے اور ساتھ ہی سٹیفڈ پف کے ساتھ چائے بھی پلاتے۔ اُن دنوں میں نے اُن تمام فلموں کی فہرست تیار کی تھی جو میں نے دیکھی تھیں۔ یونیورسٹی اور ملازمت کے ابتدائی برسوں میں یہ شوق باقی رہا لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس میں کمی آگئی اور آج کئی برس ہوئے ہیں کوئی فلم دیکھے ہوئے۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ آخری مرتبہ سینما کب گیا تھا۔ ایسی ایک ہی فلم ہے جو میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ یعنی چار دفعہ دیکھی ہے اور وہ ہے 'امراؤ جان'۔

اسکول میں داخلے کا واقعہ بھی دلچسپ ہے۔ اکثر بچوں کی طرح میں نے بھی پہلے پہل اسکول جانے میں آنا کانی کی۔ گھر والوں کی کوششیں رنگ لاتے ہوئے نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ ایک دن والد صاحب نے تنگ آ کر ایک چھڑی اور مٹی کا ایک برتن میرے ہاتھ میں تھا کر کہا کہ اگر اسکول نہیں جانا ہے تو یہ پکڑو اور جا کر مویشی چراؤ۔ اس ایک جملے نے صورتِ حال ہی بدل دی اور مجھے اتنا جھنجھوڑ دیا کہ میں اسکول جانے پر راضی ہو گیا۔ ہمشیرائیں کہتی ہیں کہ والد صاحب کے اس طنزیہ جملے نے میرے حساس ذہن پر کچھ کے لگا دئے۔ آج تک یہ حساس طبیعت میرا سرمایہ بھی ہے اور کمزوری بھی۔ اسکول میں داخلہ کے لیے چچا کے ساتھ بھیجا گیا۔ اُن کے فرزند جو عمر میں مجھ سے ایک دو سال بڑے ہیں، بھی اپنے داخلہ کے لیے ساتھ تھے۔ مجھے چھوٹا اول میں جبکہ اُسے بڑا اول میں داخل کر دیا گیا۔ اُس زمانے میں بچوں کو پانچ سال کی عمر میں اسکول میں داخل کیا جاتا تھا۔ اسکول ریکارڈ میں دونوں کے ایام پیدائش میں صرف ایک

ماہ کا فرق رکھا گیا۔ میں اساتذہ کا پسندیدہ طالب علم تھا اور کئی اساتذہ کے ساتھ مجھے بھی عقیدت کی حد تک محبت تھی۔ ان میں سب سے پہلے نمبر پر ہیڈ ماسٹر غلام حسن گیلانی صاحب تھے جنہوں نے پورے علاقے میں ایک اساطیری کردار کا درجہ حاصل کیا تھا۔ وہ اساتذہ کے لیے ایک بہترین نمونہ تھے اور انہیں صدر ہند نے حسن کارکردگی پر انعام سے بھی نوازا تھا۔ اُنکا بدبہ دیکھتے ہی بنتا تھا۔ سارا علاقہ انہیں عزت اور احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔ سالانہ زلٹ کے دن وہ اسکول کے آگن میں وقفے وقفے سے پانی پی کر انفرادی طور پر ہر جماعت کے ایک ایک بچے کا زلٹ پڑھ کر خود سناتے۔ اُس دن سارا علاقہ اسکول میں اُٹا آتا۔ اگرچہ میں ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتا لیکن زلٹ کے دن جیسے دل کی دھڑکنیں رُک ہی جاتیں۔ اُنکا زلٹ سنانے کا انداز نرالا تھا۔

بڑے بھائی صاحب کہتے ہیں کہ گورنمنٹ لوڈ رہائی اسکول سونہ وار پہلے گیلانیہ مڈل اسکول کے نام سے ایک پرائیویٹ اسکول تھا جہاں انہی ہیڈ ماسٹر صاحب کی وجہ سے تعلیم کا معیار اتنا بلند تھا کہ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے بچے مشنری اسکولوں کے بچوں کے ساتھ انگریزی زبان میں ڈراموں کے مقابلوں میں حصہ لیتے اور اعزاز حاصل کرتے۔ اسکول میں ایک بلیک بورڈ تھا جس پر مڈل کا امتحان، جو اُن دنوں بورڈ آف سکندری ایجوکیشن کی طرف سے لیا جاتا تھا، میں امتیاز کے ساتھ پاس کرنے والے طلباء کے نام درج تھے۔ ان میں بھائی صاحب کا نام بھی تھا۔ جب میں چوتھی یا پانچویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھا تو ہیڈ ماسٹر صاحب کا پانپور کے اسکول میں تبادلہ کر دیا گیا جس پر سونہ وار، درگن، گگری بل، بنہ وارہ اور سوپورہ کے لوگوں نے احتجاج کیا اور ایک بہت بڑا جلوس نکال کر اُس وقت کے وزیر اعلیٰ غلام محمد صادق کی رہائش گاہ واقع گگری بل گئے اور تبادلہ کے حکم کی منسوخی کا مطالبہ کیا۔ بد قسمتی سے صادق صاحب کو ہیڈ ماسٹر صاحب کی یہ مقبولیت ایک آنکھ نہ بھائی اور انہوں نے نخوت سے کہا کہ جو طلباء اُن سے پڑھنا چاہتے ہیں وہ اُس اسکول میں داخلہ لیں جہاں ان کا تبادلہ ہوا ہے۔ اُس دن سارے علاقے پر مایوسی چھائی رہی۔

اسکول میں میرے پسندیدہ اساتذہ میں غلام احمد راتھر صاحب، عادل بشیر صاحب،

غلام سرور صاحب اور سید صاحب تھے۔ ماسٹر غلام محمد میر صاحب اور رفیق علی صاحب غلطی پکڑنے پر طلباء کی خوب مرمت کرتے اور اکثر بچے اُن کے تباد لے کی دُعائیں کرتے۔ ماسٹر مکھن لال جی کلاس میں بچوں سے کہتے کہ آنکھیں بند کرو اور خواب دیکھ کر بتاؤ کہ کیا دیکھا۔ یہ کہہ کر وہ خود کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ جب کلاس ختم ہونے کو آتا تو وہ آنکھیں موندتے ہوئے جاگ جاتے اور ہر بچے سے پوچھتے بتاؤ کیا خواب دیکھا؟ بچارے بچے جاگتے کیا خواب دیکھتے مگر ماسٹر جی کے سوال کا جواب تو دینا ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ بچے سانپ، گھوڑا وغیرہ دیکھنے کا سوانگ بھرتے اور ماسٹر جی کا پیر یڈ ختم ہوتا۔ ایک دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے انہیں کلاس میں سوتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا اور خوب کھری کھری سنائی۔ ہائی اسکول بادامی باغ میں ہیڈ ماسٹر غلام علی شہید سلمانی صاحب، علی محمد خان صاحب، اشوک کمار جی اور عبدالغنی مسعود میرے پسندیدہ اساتذہ تھے۔ عادل بشیر صاحب آٹھویں جماعت میں میرے فارم ماسٹر تھے۔ اُن کے ہاتھ کا لکھا ہوا مارکس کارڈ آج بھی میری متاعِ عزیز ہے جس میں انہوں نے میرے بارے میں لکھا تھا: The boy is a shining star شہید سلمانی صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ رقعہ بھی میرے پاس قیمتی اثاثہ کی صورت میں محفوظ ہے جس میں انہوں نے میٹرک کے میرے مارکس کارڈ میں انگریزی زبان میں ۵۰ نمبرات میں سے صرف ۸۸ نمبرات دیکھ کر بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے سیکریٹری سے میرے نمبرات دوبارہ چیک کرانے کی گزارش کی تھی۔ اُن کے لکھے ہوئے یہ الفاظ میرے لیے کسی بڑے انعام و اکرام سے کم نہ تھے۔ "He is

no case deserves 88 marks only in English as he is the best boy of the School." لیکن انفرادی مضامین کے مارکس جمع کر کے نمبرات کا حاصل کم آتا تھا۔ میں ہیڈ ماسٹر صاحب کی چھٹی لے کر سائیکل پر سوار بورڈ کے دفتر واقع لال منڈی گیا جہاں سیکریٹری، جن کا نام غالباً یوسف صاحب تھا، نے متعلقہ ملازم کو طلب کر کے فوری جانچ کرنے کا حکم صادر کیا۔ پتہ چلا کہ انگریزی کے مضمون میں ۱۲۶ نمبرات کے بجائے غلطی سے میرے مارکس کارڈ میں صرف ۸۸ نمبرات درج کئے گئے تھے جو دراصل میرے ہی ہم نام ہم جماعت کے اس مضمون میں حاصل

کردہ نمبرات تھے۔

میرے کزن محمد رفیع اسکول اور کالج میں میرے ہم جماعت تھے۔ ہم دونوں اکٹھے اسکول جاتے اگرچہ یہ مرحلہ میرے لیے ہمیشہ صبر آزما ہوتا۔ میں ہر صبح وقت پر تیار ہو کر، وردی پہن کر اور کتابوں کا بستہ کمر میں لٹکائے اُن کے گھر جاتا لیکن ہر بار پتہ چلتا کہ وہ ابھی تیار ہی نہیں ہوئے ہیں۔ تیار ہونے میں انہیں کافی وقت لگتا اور بالآخر جب اُن کی اماں انہیں تیار کرتی، غسل خانے میں دیوار میں لگے آئینے میں دیکھ کر پانی سے بالوں کو سنوارنے میں اچھا خاصا وقت صرف کرتے۔ میری حالت پطرس بخاری کے مشہور مزاحیہ انٹائیپ سینما کا عشق، کے میر صاحب ایسی ہوتی جو ہر جمعرات کو فلم دیکھنے کی غرض سے اپنے دوست میرزا صاحب کے گھر جاتے اور بڑے جتن، کے بعد انہیں ساتھ لے کر جب سینما کی طرف نکلتے تو راستے میں ہر چار قدم پر میرزا صاحب رُک رُک کر لوگوں سے حال احوال پوچھتے اور میر صاحب فلم کا وقت نکلتے ہوئے دیکھ کر ہر بار قسم کھاتے کہ اگلی مرتبہ اکیلے سینما دیکھنے جائیں گے۔ اگلی صبح میں بھی پھر اسی مرحلے سے گزرنے کے لیے اپنے کزن کے گھر جاتا۔ اسکول میں داخلے کے ابتدائی دنوں میں اپنی جماعت کے بجائے برادر محمد اسماعیل جو مجھ سے دو تین جماعتیں آگے تھے، کی جماعت میں بیٹھتا تھا۔ ایک دن ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے وہاں پا کر ٹوکتے ہوئے بھائی صاحب سے پوچھا 'اس سہروردی کو کہاں سے لائے ہو؟' مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے مجھے سہروردی کیوں کہا۔ میں نے واسکٹ پہنا تھا شاید اس وجہ سے انہوں نے مذاق کیا۔ اُن دنوں پاکستان کے وزیر اعظم حسن شہید سہروردی تھے۔ اس سرزنش کے اگلے روز سے میں اپنی کلاس میں بیٹھنے لگا۔

میٹرک کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں اور اسکول میں اول آکر پاس کرنے کے بعد میں نے وادی کے قدیم ترین کالج، ایس پی کالج میں داخلہ لیا جہاں میرے مضامین انگریزی، اردو، تاریخ اور سیاسیات رہے۔ ۱۹۷۵ء میں بی اے آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد میں نے کشمیر یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۷۷ء میں سیاسیات کے مضمون میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔

کشمیر یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے قبل میں نے ۱۹۷۵ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

میں ایم۔ اے۔ سوشیالوجی میں داخلہ لیا تھا اور قریباً ڈیڑھ ماہ تک وہاں زیر تعلیم رہا۔ ادھر ساتھ ہی میں نے کشمیر یونیورسٹی میں بیک وقت اُردو، قانون اور سیاسیات کے شعبوں میں داخلے کی عرضیاں بھی داخل کی تھیں اور تینوں شعبوں میں منتخب اُمیدواروں میں میرا پہلا نام نکلا۔ علی گڑھ میں قیام کے دوران میں سخت بیمار ہوا۔ شاید ملیریا کا حملہ تھا اور ایک رات اسپتال میں بھی زیر علاج رہا۔ اُن ایام میں میرے برادر محمد اسماعیل صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ جیالوجی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے مگر جب میں علی گڑھ میں تھا تو وہ گھر آچکے تھے۔ میں نے ایک خط میں اپنے کزن نیاز احمد کو اپنی علالت کی خبر دی اور تاکید کی کہ وہ گھر میں نہ بتائیں۔ اُن سے یہ خبر چھپائے نہ بنی۔ انہوں نے گھر میں خبر کر دی جس پر گھر کے سبھی افراد، خصوصاً والدہ محترمہ، سخت پریشان ہوئیں۔ چنانچہ مجھے بڑے بھائی صاحب کی طرف سے ایک تار ملا جس میں ہدایت کی گئی تھی کہ فوراً گھر واپس آؤ۔ اندھا کیا چاہے دوا نکھیں۔ میں جیسے اسی کے انتظار میں تھا۔ اکتوبر کا مہینہ تھا۔ یونیورسٹی میں پوجا کی چھٹیاں تھیں اور میں ٹرین میں سوار ہو کر نا کام سپاہی کی طرح واپس لوٹا۔ تب سے آج تک گھر میں برابر یہ طعنہ سنتا آ رہا ہوں کہ معمولی سی بیماری کی وجہ سے میں علی گڑھ چھوڑ کر آ گیا۔ مقابلے میں خود برادر محمد اسماعیل صاحب کی مثال موجود تھی۔ جو تعلیم کے دوران ایک مرتبہ وہاں بے حد علیل ہوئے اور یونیورسٹی انتظامیہ نے تار کے ذریعہ ہمیں خبر کر دی اور مشورہ دیا کہ انہیں واپس گھر لے آئیں۔ اس کے باوجود اُن کے قدم وہیں جمے رہے اور ایم۔ اے۔ (جیالوجی) کا امتحان فرسٹ کلاس فسٹ میں پاس کر چکنے کے بعد پی ایچ ڈی کر کے جیالوجی کے مضمون میں جموں و کشمیر کے پہلے مسلم ڈاکٹریٹ ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ میں ایسی قوت برداشت کا مالک نہیں ہوں اور ذرا سی تکلیف اور مشکل مجھے بے حد پریشان کر دیتی ہے۔ علی گڑھ سے واپسی کے بعد میں نے کشمیر یونیورسٹی میں قانون اور اُردو کے بجائے سیاسیات کے شعبے میں داخلہ لیا جہاں نیاز احمد آخری سال کے طالب علم تھے۔ اُن کی موجودگی سے میں رینگ جیسے عذاب سے بچ گیا جبکہ میرے ہم جماعتوں کو اس مرحلہ سے گزرنا پڑا۔ میرا تعلیمی ریکارڈ اس لحاظ سے اچھا رہا کہ چھٹی جماعت سے کہ جب سے میرے مارکس کارڈ میرے پاس موجود ہیں، میں نے ہر امتحان امتیازی نمبرات سے اور اسکول اور کالج میں

اول رہ کر پاس کیا۔ ایم اے کے امتحان میں البتہ یہ امتیاز برقرار نہ رکھ سکا اور یونیورسٹی میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

اسکول، کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم کے علاوہ میرا اور کوئی خاص مشغلہ نہیں تھا۔ البتہ لڑکپن اور نوجوانی میں محلہ کے دیگر لڑکوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا۔ گھر کے نزدیک واقع ریڈنگ روم کے پچھواڑے خالی زمین پر میں نے لڑکپن میں بہت کرکٹ کھیلی ہے جہاں ہماری وکٹ بجلی کا کھمبا ہوتا۔ مجھے بیننگ سے زیادہ باؤلنگ کرنے کا شوق تھا اور اڑدس پڑوس کے معیار کے مطابق فاسٹ باؤلر تھا۔ ایک بار کالج میں ہم جماعتوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے سات وکٹیں لیں۔ میرے ہم جماعت جو مجھے صرف بحیثیت پڑھا کو جانتے تھے اس 'کارنامہ' پر حیران ہوئے۔ خورشید شیر خان نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ارے یار تم تو چھپے رستم نکلے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے کبھی کوئی کھیل کھلاڑی بننے کی نیت سے نہیں کھیلا۔ کرکٹ کے کھیل سے البتہ ہمیشہ دلچسپی رہی خصوصاً دیکھنے کی حد تک۔

میرے لڑکپن کے دنوں میں سونہ وار میں کرکٹ کے میدان میں سالانہ رنجی ٹرافی چیمپئن شپ کے میچ منعقد ہوتے تھے جہاں بھارت کی مختلف ریاستوں کی کرکٹ ٹیمیں جموں و کشمیر کی ٹیم کے ساتھ کھیلنے آتی تھیں۔ ان میں سابق اور موجودہ ٹیسٹ کھلاڑی بھی ہوتے۔ ایسے ہی کھلاڑیوں میں سرومز کے ایچ۔ ٹی۔ دانی بھی تھے جنہوں نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں پاکستان کے خلاف کھیلا تھا اور اس نسبت سے اُن کی کوٹ کی اوپری جیب پر ایک بیج لگا رہتا تھا۔ دیگر نامور کھلاڑیوں میں کامیاب اسپن باؤلر بشن سنگھ بیدی اور میڈیم پیس باؤلر مدن لال تھے۔ ایک میچ کے دوران جموں و کشمیر ٹیم کے کپتان عبدالرؤف نے بیدی کی باؤلنگ کی کرکری کردی اور چوکوں اور چھکوں کی بارش کر کے ۹۶ رن بنائے۔ عبدالرؤف کشمیر کے سب سے معروف آل راؤنڈر اور تماشا شیوں کے محبوب کھلاڑی تھے۔ اُن کو کھیلتے دیکھنے کے لیے دور دراز سے لوگ آتے اور جتنی دیر وہ بیننگ یا باؤلنگ کرتے لوگوں کی دلچسپی قائم رہتی۔ اس کے بعد اکثر اُٹھ کر چلے جاتے۔ عبدالرؤف لمبے قد کے خوب رو نوجوان تھے جن کے مداحوں میں ایک ادھیڑ عمر کا شخص بھی تھا جو پاکستان کے مشہور 'چاچا کرکٹ' کی طرح ہر دن اُن کا کھیل دیکھنے آتا

اور انہیں buck up کرتا۔ کرکٹ کے ان مقابلوں کے دوران میں اور میرے بعض کزن سارا دن کرکٹ میدان میں گزارتے۔ جب ایمپائر لیج کا اعلان کرتا تو ہم بھی کھانا کھانے گھر آتے۔ اسی طرح چائے کے وقفے میں ہم جلدی جلدی گھر سے چائے پی کر میدان میں لوٹ آتے۔ بچپن میں میں نے پاکستان اور بھارت کے درمیان ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ہوئی کرکٹ سیریز کا تصویری البم بنایا تھا جس میں حنیف محمد، محمد حسین، امتیاز احمد، انتخاب عالم ایسے کھلاڑیوں کی کئی تصویریں موجود تھیں۔ ایسا ہی ایک اور البم اُن تصاویر پر مبنی تھا جو امریکہ کے خلائی شٹل اپالو، کے کئی بار چاند پر اترنے سے متعلق تھیں۔ یہ دونوں البم بہت دنوں تک میرے پاس تھے لیکن ۲۰۰۳ء میں نقل مکانی کے وقت کہیں کھو گئے۔ تسخیر قمر کے فوٹو میں نے ریڈنگ روم کے اخباروں سے نظریں بچا کر جمع کیے تھے۔

کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔ اے کرنے کے بعد میرے لیے ابھی روزگار کا وسیلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۷۹ء کا سال تھا۔ کالم نویس جی ایم زاہد اُن دنوں محکمہ اطلاعات میں ملازم تھے۔ وہ میرے پھوپھی زاد بھائی شیخ منظور احمد کے دوست ہیں اور اس ناطے میرے بھی اُن سے مراسم تھے۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ روزنامہ 'آفتاب' کو ادارتی عملے کے لیے ایک نوجوان کی تلاش ہے جسے اُردو زبان سے اچھی خاصی واقفیت ہو اور صلاح دی کہ مجھے وہاں جانا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ وہ مجھے اُن صاحب سے ملوائیں گے جنہیں مدیر آفتاب نے ایسا کوئی نوجوان تلاش کرنے کو کہا تھا۔ میں نے حامی بھری۔ چنانچہ میں اُن کے دفتر گیا جہاں سے اُن کے افسر مظفر احمد خان مجھے ادارہ آفتاب میں لے گئے اور مدیر آفتاب خواجہ ثناء اللہ بٹ سے متعارف کرایا۔

خواجہ صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی حالانکہ روزنامہ آفتاب کے قارئین کے لیے میں غیر معروف نہ تھا۔ میرا اور آفتاب کا رشتہ سات سال قبل جڑا تھا۔ ۱۵ جنوری ۱۹۷۲ء کو جب میں ایس پی کالج کا طالب علم تھا، میری پہلی کہانی 'انوکھا ملن' روزنامہ آفتاب میں شائع ہوئی تھی۔ وہ لمحہ آج بھی میرے حافظے میں تازہ ہے۔ اُن دنوں ہمارے یہاں اخبار یا تو دُستہ خالق مرحوم کے سیلون میں آتا تھا یا پھر مرحوم کمال صوفی کی دُکان پر۔ سیلون میں جا کر اخبار

پڑھنا میری ہمت سے باہر تھا کیونکہ وہاں محلہ کے تمام بڑے اور بزرگ حقے کے کش لے لے کر 'آفتاب' کا پرچہ باری باری پڑھتے اور چٹخارے لے لے کر حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہتے۔ اس محفل میں مجھ ایسے نوجوان کا جانا اور اخبار مانگ لینا حد ادب سے باہر تھا۔ میں حسب معمول صبح سویرے روٹیاں لینے بازار گیا اور نانوائی کی دکان پر اپنی باری کا انتظار کر رہا تھا۔ اخبار کا 'کر' آفتاب' کا پرچہ دکان پر چھوڑ گیا تھا اور مرحوم کمال صوفی کے فرزند مرحوم فاروق احمد اس کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں اس انتظار میں تھا کہ کب وہ مطالعہ ختم کریں اور میں اُن سے اخبار مانگ کر پڑھ لوں۔ کچھ دن قبل میں نے ایک کہانی لکھ کر 'آفتاب' میں اشاعت کے لیے بھیجی تھی اور اب مجھے بے چینی سے انتظار تھا کہ کب کہانی اخبار میں شائع ہو۔ جب 'آفتاب' میرے ہاتھوں میں آیا اور پہلے صفحے پر سرسری نظر ڈال کر میں نے اخبار کار و ورق اُلٹا تو نہ صرف یہ کہ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا بلکہ پورے جسم پر عجیب قسم کی کپکپی چھا گئی۔ یہ خوشی کا کیسا احساس تھا مجھے آج تک معلوم نہیں۔ اُن دنوں 'آفتاب' چار صفحات پر شائع ہوتا اور دوسرے صفحہ کے دو تہائی حصے پر میری کہانی چھپی تھی 'انوکھا ملن'، تحریر خالد بشیر سونہ وار سرینگر۔ یہ ادبی دُنیا سے میرا پہلا تعارف تھا۔ اُس کے بعد میری کہانیاں متواتر 'آفتاب' میں چھپیں اور پھر جب میرا میلان شاعری کی طرف بڑھا تو میری غزلیں اور نظمیں بھی پہلے پہل 'آفتاب' کی وساطت سے ہی سامنے آئیں۔

اُن دنوں کے یہ اشعار میرے حافظے میں اب بھی تازہ ہیں:

سکستی رہی ہیں، تڑپتی رہیں

مگر آرزوئیں مچلتی رہیں

مجھے لیکے تنہائیاں اپنے ساتھ

یہ کن راستوں پر بھٹکتی رہیں

یہ وہ زمانہ تھا جب 'آفتاب' نے کشمیر کی ادبی دُنیا سے کئی نئے نام متعارف کرائے

تھے۔ اُن دنوں جو اصحابِ تواتر سے چھپتے تھے اُن میں عمر مجید، م۔م۔ صدیق اور ایس ایم قمر

تینوں میرے ہم محلہ تھے۔ اُن کے مقابلے میں میں نو آموز تھا۔ بشیر گاش، شمس الدین شمیم، محمد

یعقوب بافندہ، یسین فردوسی، نذیر مشتاق بڑی باقاعدگی کے ساتھ چھپتے تھے۔ اُن کے علاوہ بھی کئی نام تھے جنہیں اس وقت میں بھول رہا ہوں۔ اُمید ہے میرے وہ دوست مجھے معاف فرمائیں گے۔ بہر حال مجھے ادارہ آفتاب میں رکھا گیا اور اولاً خبر رساں ایجنسیوں یو این آئی اور پی ٹی آئی کی کچھ خبریں ترجمہ کرنے کو دی گئیں۔ میں نے فوراً ترجمہ خواجہ صاحب کے پاس بھجوادیا۔ خواجہ صاحب نے سرخیاں جمادیں اور خبریں اخبار میں چھپ گئیں۔ اُن دنوں بڈشاہ چوک میں اخبار کا دفتر جیسا کہ شاید آج بھی ہے، تین کمروں اور ایک راہداری پر مشتمل تھا۔ پہلے کمرے میں ادارے کا منیجر اور دیگر اسٹاف، دوسرے میں مدیر آفتاب اور تیسرے میں اخبار کے خوشنویس حضرات بیٹھتے تھے۔ ادارتی عملے میں طاہر محی الدین اور یوسف جمیل مستقل ارکان تھے۔ یوسف جمیل، خواجہ صاحب کے بالمقابل بیٹھتے تھے اور خبروں اور دیگر کالموں کے لیے خواجہ صاحب سے ڈکٹیشن بھی لیتے اور خود بھی خبریں تیار کرتے تھے۔ طاہر محی الدین راہداری میں براجمان تھے اور میری نشست بھی وہیں مقرر ہوئی۔ یوسف جمیل اُن دنوں خواجہ صاحب کے خاص الخاص تھے۔ اُن کی بات کا پاس رکھا جاتا تھا۔ اس سے قبل طاہر محی الدین کو یہ مرتبہ حاصل تھا جبکہ اُن سے قبل غلام نبی رتن پوری اس منصب پر فائز تھے۔ رتن پوری میرے ادارہ جوائن کرنے سے قبل ہی وہاں سے جا چکے تھے۔ چنانچہ طاہر محی الدین کہا کرتے تھے کہ اگر یوسف جمیل خواجہ صاحب سے کہے کہ کل چھٹی کریں گے تو سمجھو کل چھٹی ہے۔ بہر حال، مجھے آفتاب میں ایک اچھا اور دوستانہ ماحول میسر آیا۔ طاہر محی الدین اور یوسف جمیل دونوں شفقت کی حد تک مجھ سے مانوس ہوئے۔ طاہر محی الدین کا قلم اپنے شباب پر تھا۔ اُن کے تجزیاتی کالم پیشہ ورانہ ہوتے تھے۔ یوسف جمیل کی شرافت اور قابلیت دونوں مسلم تھیں۔ اول الذکر سیاست پر خامہ فرسائی کرتے تھے جبکہ آخر الذکر زیادہ تر اسلامی اور فلمی صفحات ترتیب دیتے تھے۔ جمیل صاحب کے ذمہ اتوار کو شائع ہونے والا بارہ صفحات کا Tabliod سائز ہفتہ وار شمارہ بھی تھا۔ میں بھی اس کے لیے خبروں کے علاوہ مضامین اور فیچر لکھتا تھا۔

میرے ادارہ آفتاب میں آنے کے تیسرے یا چوتھے روز خواجہ صاحب نے مجھے طلب کیا۔ میں راہداری میں نکلنے والے دروازے سے اُن کے کمرے میں داخل ہوا۔ غالباً وہ

اُس وقت اکیلے تھے۔ میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ مجھ سے یوں مخاطب ہوئے ”میں نے تمہارا کام دیکھا۔ دو تین دن میں ہی تم نے اچھی طرح سے pick-up کیا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرو کہ آیا تم یہاں کام کرو گے۔ میرے لیے یہ الفاظ بے حد حوصلہ افزا تھے۔ چنانچہ مجھ میں اعتماد ظاہر کرنے پر میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور جواباً عرض کیا کہ میں کام کرنے کی غرض سے ہی آیا ہوں۔ یہ کہہ کر میں واپس اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔ مجھے اچھی طرح سے یاد نہیں لیکن شاید جون کا مہینہ تھا جب میں ادارہ ’آفتاب‘ کے ساتھ وابستہ ہوا تھا۔ یہ غالباً وسط ماہ تھا۔ اختتام ماہ پر جب عملے کو اپنے کام کا مختانہ دیا گیا تو میں اُن خوش نصیبوں میں شامل نہیں تھا۔ میں نے کسی سے پوچھا بھی نہیں کہ کیوں؟ البتہ اگلے ماہ کے اختتام پر مجھے دو سو روپے تنخواہ دی گئی۔ میرے حساب سے یہ ایک قلیل رقم تھی لیکن میں نے کوئی سوال نہیں کیا اور ادارے میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔

بچپن سے ہی کہ جب سے میں روزنامہ ’آفتاب‘ پڑھتا تھا خواجہ ثناء اللہ بٹ کی شخصیت کا ایک اسطوری خاکہ میرے ذہن میں تھا۔ اصل میں اُن دنوں کشمیر کی صحافت میں اسی نام کا سکہ چلتا تھا۔ آفتاب محلہ محلہ، قصبہ قصبہ پڑھا جاتا تھا اور سرینگر شہر میں تو اُن لوگوں کے لیے جنہیں اخبار خریدنے کی استطاعت تھی یہ ناشتے کا ایک اہم جز تھا۔ دیگر لوگ اکثر حجاموں کی دکانوں پر لگنے والی بیٹھکوں میں یا ریستورانوں میں اس کا مطالعہ کرتے تھے۔ شہر میں خال ہی نالی کی کوئی دکان ہوگی جہاں ’آفتاب‘ نہ آتا ہو اور یوں یہ دکانیں کیمونٹی ریڈنگ روم کے طور پر استعمال ہوتیں۔ ’آفتاب‘ میں چھپنے والی خبروں اور مضامین کو لوگ اعتبار کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ’خضر سوچتا ہے ولر کے کنارے‘ ایسے مزاحیہ کالم کو بھی حقیقت تسلیم کر لیتے۔

’آفتاب‘ میں میرے قیام کا وقت افغانستان میں سوویت یونین کی جارحیت اور قبضے کا دور تھا۔ سوویت استبداد اور ظلم و جبر کے روٹے کھڑے کر دینے والے قصبے یا تو بی بی سی کے ذریعہ یا مغربی اخباروں اور جرائد کی وساطت سے لوگوں تک پہنچتے تھے۔ روزنامہ ’آفتاب‘ افغان مجاہدین کی جرات اور جوانمردی کے قصبے بڑے چاؤ اور کسی حد تک عقیدت مندانہ طریقے پر شائع کرتا تھا۔ اس کے پیچھے طاہر محی الدین کی کاوش تھی جو اخبارات اور بی بی سی کے سیرین

پروگرام سے خبریں اکٹھا کرتا رہا۔ یونین کی پسپائی کی نوید دے رہے تھے۔ انہی دنوں جو کہ 'آفتاب' میں میرے ابتدائی ایام تھے امریکی جریدے 'ٹائم' میں افغانستان پر سوویت حملے اور سرخ فوج کی عسکری قوت کے بارے میں ایک طویل مضمون شائع ہوا تھا۔ خواجہ صاحب اس مضمون کو اخبار میں نقل کرنا چاہتے تھے چنانچہ ترجمے کا کام مجھے سونپا گیا جسے میں نے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں مکمل کر دیا۔ اس ترجمے نے اُن کی نظروں میں میری وقعت بڑھادی۔ دوسرے روز یہ مضمون اخبار کے صفحہ اول پر شائع ہوا لیکن ترجمہ نگار کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ بہر حال، مجھے یہ تسلی رہی کہ یہ کام میں نے ہی کیا ہے۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے مجھے اپنی زیر ترتیب کتاب 'کشمیر ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک کے دو تین ابواب انگریزی میں ترجمہ کرنے کو دیے۔ وہ کتاب کا انگریزی پرنٹ شائع کرنا چاہتے تھے۔ ترجمے کا کام صحافی ایم ایل کاک کر رہے تھے اور خواجہ صاحب کی نظر میں یہ دو تین ابواب بڑے دھماکہ خیز تھے جنہیں وہ کاک صاحب کو دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ ان میں ایک باب پر میثوری کے قبول اسلام اور پنڈت ایچی ٹیشن اور دوسرا مومئے مقدس تحریک کے بارے میں تھا۔ خواجہ صاحب پہلے کتاب کا عنوان 'کشمیر شعلوں کی لپیٹ میں' رکھنا چاہتے تھے لیکن بعد میں اسے بدل دیا۔ اُن کے خیال میں اس طرح کا عنوان آتش گیر مادہ تھا۔

میرے اوقاتِ کار صبح دس بجے سے رات کو نو بجے تک تھے۔ دن بھر طاہرہ مجی الدین، یوسف جمیل اور میں ٹیلی پرنٹر روم سے اہم خبریں منتخب کر کے اُن کا ترجمہ کرتے اور وادی کے مختلف حصوں سے حاصل ہونے والی رپورٹوں اور پریس نوٹس سے خبریں تراش کر مدیرِ آفتاب کی میز تک پہنچاتے جو حسب ضرورت ایڈیٹنگ کر کے سرخیاں جما کر خوشنویسوں تک پہنچا دیتے۔ دن بھر کی مشقت کے باوجود تھکن کا احساس نہیں ہوتا تھا کیونکہ پورا عملہ ایک دوستانہ ماحول میں کام کرتا تھا۔

میری پہلی outdoor assignment ایک پریس کانفرنس تھی جس سے گورنر جموں و کشمیر، ایل کے جھا، راج بھون چشمہ شاہی میں خطاب کرنے والے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ صحافیوں کو محکمہ اطلاعات کی طرف سے گورنمنٹ پریس بلڈنگ سے راج بھون تک لیجایا

جائے گا۔ محکمہ اطلاعات کے صوبائی دفتر میں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی بتایا گیا کہ مجوزہ پریس کانفرنس ملتوی کی گئی ہے۔ اس کے بعد پہلی بار کسی واقعہ کی رپورٹنگ کرنے کا موقع مجھے اُس وقت ملا جب حکمران نیشنل کانفرنس آنے والے پارلیمانی ضمنی انتخابات کے لیے اپنے اُمیدواروں کا عوامی اجتماع میں اعلان کرنے والی تھی۔ یہ اجتماع مجاہد منزل میں تھا اور ناموں کا اعلان سہ پہر کو خود وزیر اعلیٰ شیخ محمد عبداللہ کرنے والے تھے۔ ایک بڑا سٹیج تیار کیا گیا تھا جس پر شیخ صاحب کے علاوہ پارٹی کے دیگر زعماء براجمان تھے۔ مجھے بھی دیگر صحافیوں کے ساتھ اسٹیج پر ہی جگہ ملی۔ شیخ صاحب کو اتنا قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے تھے اور اُن کے عقب میں، میں بیٹھا جلسہ شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اُن کے چہرے اور جسم پر عمر رسیدگی کے اثرات نمایاں طور پر اُبھرے تھے اور لگ رہا تھا کہ کشمیر کی وادیوں میں دھاڑنے والا شیر، اب بوڑھا ہو چکا ہے۔

میں اس خیال سے کہ جلسے کی کاروائی کا کوئی حصہ نہ چھوٹے، بہت پہلے ہی مجاہد منزل پہنچ گیا تھا اور جب تک کہ جلسہ اختتام پذیر ہوا اور شیخ صاحب نے پارٹی کے اُمیدواروں کو عوام سے متعارف کرا کے اپنی تقریر ختم کر دی شام رات کی دہلیز پر دستک دے چکی تھی۔ میں جلدی جلدی واپس دفتر پہنچا، شیخ صاحب کی تقریر اور جلسے کی کاروائی پر خبر تیار کی جو نسبتاً طویل تھی اور خواجہ صاحب تک پہنچا کر گھر لوٹا۔ صبح جب اخبار دیکھا تو میری تحریر کردہ خبر ’آفتاب‘ کی شہ سرنخی تھی اور اس سے زیادہ حیرت اور مسرت کی بات یہ تھی کہ خبر کے ساتھ بائی لائن بھی شائع ہوئی تھی۔ خالد بشیر، نمائندہ خصوصی۔ یہ پہلی مرتبہ تھا کہ اس طرح ’آفتاب‘ میں کسی رپورٹر کی بائی لائن شائع ہوئی ہو۔ وادی سے چھپنے والے دیگر اخباروں کی تو بات ہی نہیں۔ اب تک صرف مضامین، تبصروں، تجزیاتی رپورٹوں یا مستقل کالموں کے ساتھ ہی کالم نگار کا نام آتا تھا۔ نامہ نگار کی حیثیت سے یہ افتخار میرے حصے میں تھا۔ خواجہ صاحب میرے کام سے خوش تھے اس کا احساس مجھے تھا اور یہ بات بھی صاف تھی کہ مجھ میں اُن کا اعتماد بڑھ گیا تھا۔

سرینگر میں ریاستی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ پہلے ہی دن ایوان میں دھیدگا مشتی اور ہاتھ پائی ہوئی۔ جنتا پارٹی کے رہنما عبدالغنی لون کو نیشنل کانفرنس کے ارکان اسمبلی نے زد و کوب

کیا اور کہا گیا کہ یہ سب کچھ شیخ صاحب کی ایما پر ہوا۔ اخبار کے دفتر میں یہ خبر پہنچ چکی تھی اور میں تقریباً فراغت میں تھا۔ میں نے قلم اٹھایا اور یہ قطعہ تحریر کیا۔

شروع جب ہوگئی قانون سازی

بڑی اُدھم مچائی ممبروں نے

جناب شیخ بھی برہم ہوئے جب

لتاڑا لون کو کچھ دلبروں نے

یہ اشعار لکھ کر میں نے طاہر محی الدین کو دکھائے جو انہیں لے کر خواجہ صاحب کے پاس گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بلاواہ آیا۔ میں کمرے میں گیا تو انہوں نے بڑے تپاک کا مظاہرہ کیا اور شاباشی دے کر کہا کہ ”یہ real contribution ہے۔ خبریں وغیرہ تو معمول کی چیزیں ہیں۔ یہ سن کر میرا حوصلہ ساتویں آسمان کو چھو گیا۔ صبح کے اخبار میں یہ قطعہ صفحہ اول پر میرے نام کے ساتھ زریں بکس (box) میں شائع ہوا اور یوں کشمیر کی صحافت میں روزمرہ کے حالات و واقعات پر مبنی شعری کارٹون کی ابتداء ہوئی جس کی بعد میں کئی اخبارات نے تقلید کی۔ شعری کارٹون سے آفتاب کی مقبولیت میں کوئی اضافہ ہوا یا نہیں لیکن مجھے اچھی خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ قارئین کی پسندیدگی کا feedback کسی نہ کسی طرح تو ملتا ہی تھا۔ اس سلسلے میں ایک دل کو چھونے والا اور بڑے دنوں تک میرے احساس پر چھائے رہنے والا واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک دن میں حسب معمول دفتر میں اپنے کام میں مشغول تھا کہ کسی نے، غالباً عبدالسلام تھے، اطلاع دی کہ کوئی خاتون باہر تمہیں پوچھ رہی ہیں۔ میں حیرت اور اشتیاق کے تاثرات لے کر باہر والے کمرے میں گیا تو وہاں ایک پنجابی مسلم بزرگ خاتون، جولاٹھی ٹیک کر آئی تھی، منتظر تھی۔ عمر رسیدہ، چہرے پر جھریاں اور آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی محبت جو صرف ماؤں کا حصہ ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ میں ہی خالد بشیر ہوں جنہیں تلاش کرتے ہوئے وہ یہاں آئی ہیں۔ ان کے ساتھ ہی وہ خاتون والہانہ طور پر مجھ سے ملیں، میرا ماتھا چوما اور مجھے ڈھیروں دعائیں دیئے لگیں۔ مجھے اب یاد نہیں کہ انہوں نے کیا الفاظ کہے تھے لیکن وہ مجھے دعائیں اور شاباشی دے رہی تھیں، یہ کہہ کر کہ میں یونہی لکھتا رہوں۔ میرے لیے وہ لمحات نہایت انمول

تھے اور یہ ایسی حوصلہ افزائی تھی جو میرے وہم و گماں سے بھی زیادہ تھی اور جس کا اثر بڑے دنوں تک باقی رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ خاتون کون تھیں لیکن جس شفقت اور محبت کا انہوں نے اظہار کیا تھا وہ یقیناً کسی بڑے سے بڑے انعام سے بھی فزوں تھا۔

بہر حال، شعری کارٹونوں کو بے حد سراہا گیا، اگرچہ خواجہ صاحب نے قارئین کی پسندیدگی کا مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا سوائے اُس دن جب شیخ صاحب کے اس اعلان کے بعد کہ وہ اپنی کابینہ میں وزراء کی تعداد کم کر رہے ہیں، انہوں نے اس کے برعکس ایک وزیر کا اضافہ کر دیا۔ اس سے قبل کابینہ میں وزراء کی متوقع کمی سے جو نیر وزراء تذبذب کی حالت میں تھے اور انہوں کا بازار گرم تھا کہ فلاں وزیر گیا، فلاں کا پتہ کٹا۔ میں نے اس واقع پر یہ شعری کارٹون تحریر کیا:

شیخ صاحب کے اشاروں کو سمجھنا چاہیے
خوامخواہ چھوٹے وزیر اُن کے بیاں سے ڈر گئے
کر رہے تھے گرچہ وہ تخفیف کابینہ کی بات
کرتے کرتے اک منسٹر کا اضافہ کر گئے

اُس روز دفتر پہنچتے ہی خواجہ صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ یہ قطعہ پسند کیا گیا اور مجھے آفتاب کے محب حاجی محمد جمال صاحب نے کہا ہے کہ تمہیں اس کے لیے مبارکباد دوں۔ کچھ دنوں سے خواجہ صاحب، طاہر محی الدین کو اتنی اہمیت نہیں دے رہے تھے جتنی کہ انہیں پہلے ملا کرتی تھی۔ دفتر میں دیگر کارکن خصوصاً خوشنویس حضرات اس بات کا برملا ذکر کر رہے تھے کہ طاہر صاحب پر خواجہ صاحب کہ وہ پہلی والی نظر عنایت نہیں ہے۔ ادھر یوسف جمیل کے معاملے میں بھی شفقت و محبت میں کچھ نہ کچھ کمی واقع ہو رہی تھی۔ تب میں نے سنا کہ عنایات و التفات کا، ابھی ہے اور ابھی نہیں، والا سلسلہ اس سے قبل غلام نبی رتن پوری کے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ اُن کے رہتے ہی طاہر محی الدین ادارہ آفتاب کے ساتھ وابستہ ہوئے تھے اور عنایات و توجہ کا مرکز دھیرے دھیرے طاہر محی الدین کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ یہی معاملہ طاہر محی الدین اور یوسف جمیل کے بارے میں رہا اور جب میں ادارہ آفتاب میں داخل ہوا تب، جیسا

کہ میں نے پہلے ذکر کیا، یوسف جمیل کا وہاں طوطی بولتا تھا۔ میرے ابتدائی ایام میں ہی ادارے میں بعض کرم فرماؤں نے مجھے خواجہ صاحب کے التفات کی ناپائیداری کے بارے میں بتایا تھا اور یوں بھی میری فطرت کے پیش نظر میں اُن کے پاس بلا ضرورت نہیں جاتا تھا۔ میں نے خود ہی ایک آڑ قائم کی تھی جس کی وجہ سے اُن کی شاباشیوں اور حوصلہ افزائیوں کا مجھ پر کوئی منفی اثر نہیں پڑا۔

ایک دن خواجہ صاحب نے مجھے بلایا۔ جب میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اکیلے تھے۔ مجھ سے یوں مخاطب ہوئے 'تم سارا دن یہاں کام کرتے ہو جب کہ اور لوگ بھی ہیں۔ تم باہر جایا کرو فنکشن وغیرہ cover کیا کرو۔' اشارہ طاہر محی الدین اور یوسف جمیل کی طرف تھا۔ اس سے قبل وہ میری تنخواہ دوگنی کر کے چار سو روپے ماہوار کر چکے تھے۔ اگرچہ مجھے ایک گونہ خوشی ہوئی اور میرا حوصلہ بڑھا کہ میرے کام کا نوٹس لیا جا رہا ہے تاہم اس سے میرا دماغ خراب نہیں ہوا۔ مجھے پہلے ہی 'ناپائیداری التفات' کی گھنٹی سنائی گئی تھی۔

۱۹۸۰ء کے ابتدائی مہینے تھے ایک روز میں اپنی بڑی ہمشیرہ کے ہاں رات کو ٹھہرا تھا۔ اُن دنوں ہفتے میں ایک مرتبہ دور درشن سرینگر سے روزگار بلیٹن ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا۔ اُس روز کے بلیٹن میں انفارمیشن آفیسروں کی اسامیوں کے لیے درخواستیں دینے کی پہلے ہی نشر شدہ 'آخری تاریخ' بڑھائے جانے کا اعلان کیا گیا۔ اس سے پہلے میں نے اس بارے میں نہیں سنا تھا۔ چنانچہ اسامیوں کے لیے قابلیت کا جو معیار مقرر تھا میں اس پر پورا اُترتا تھا۔ اگلے دن میں نے مقررہ فارم وصول کر کے درخواست دی۔ اس کے بعد انٹرویو کے لیے بلاوا آ گیا۔ میں نے نوکری کے لیے درخواست دینے کی بات طاہر محی الدین اور یوسف جمیل سے کی لیکن خواجہ صاحب سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ دراصل مجھے اس بات کا احساس کرایا گیا تھا کہ خواجہ صاحب مجھے نوکری کے لیے ادارہ سے جانے نہیں دیں گے اور اس کے لیے اگر ضرورت پڑی تو وہ انٹر ویو پر بھی اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ میں اپنے برادر، جو ایک ماہ قبل ہی دہرہ دُون کے واڈیا انسٹیٹیوٹ آف ہمالین جیالوجی میں بطور سائنٹسٹ مامور ہوئے تھے، سے ملنے کے بہانے کچھ دن کی چھٹی پر چلا گیا۔ اس طرح کی رخصت پر جانے کی ادارہ میں کوئی روایت نہیں تھی۔ بہر

حال انٹرویو ۱۳ مارچ کو جموں میں ہونا تھا۔ میں اپنے بچپن کے دوست محمد شفیع، جن کی خود حال ہی بنک میں نوکری لگی تھی، کو ساتھ لیکر جموں چلا گیا جہاں میرا انٹرویو ہوا اور میں مطمئن ہو کر دلی سے ہوتا ہوا دہرہ دون چلا گیا۔ اس سے پہلے میں نے ریڈیو کشمیر میں ٹرانسمیشن ایکریکٹیو کی اسامی کے لیے بھی انٹرویو دیا تھا لیکن اس کا نتیجہ ابھی نہیں آیا تھا۔ بعد میں اس اسامی پر بھی میری تقرری کا حکم نامہ آیا لیکن اس سے قبل میں محکمہ اطلاعات میں ملازم ہو گیا تھا۔ دہرہ دون سے واپسی پر میں نے 'آفتاب' میں اپنا کام دوبارہ شروع کیا۔

۱۶ اپریل ۱۹۸۰ء کی سہ پہر کو دفتر میں میرے لیے فون آ گیا۔ دوسری طرف جی ایم زاہد تھے جنہوں نے مجھے اطلاع دی کہ انفارمیشن افسر کے طور میری تقرری کا حکم جاری ہوا ہے اور میں آکر نوکری جوائن کر لوں۔ انہوں نے اپنے ڈپٹی ڈائریکٹر مرحوم محمد امین پنڈت کو فون دیا جنہوں نے مجھے مبارکباد دی اور پوچھا کہ کیا میں نوکری کا پروانہ لینے اُن کے دفتر آؤں یا کہ وہ یہ پروانہ میرے پاس بھیج دیں گے؟ پھر کہا کہ اگر میں اُدھر ہی آؤں تو ایک پیالی قہوہ میرے انتظار میں ہے۔ یہ انتہائی پر خلوص اور مشفقانہ دعوت تھی جسے رد کرنا نہ صرف دائرۂ اخلاق کے باہر تھا بلکہ ایک سینئر افسر کا اپنے ہونے والے ماتحت ملازم کو اس طرح بلانا اپنے آپ میں شرافت کی ایک مثال تھی۔ چنانچہ میں یوسف جمیل اور طاہر محی الدین سے اس خوشخبری کا تذکرہ کر کے محکمہ اطلاعات کے لیے نکل پڑا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ خواجہ صاحب کو اس کی اطلاع دیں۔ میں خود اس طرح اچانک یہ بات انہیں نہیں کہہ پار ہا تھا۔ میں محکمہ اطلاعات میں نوکری کا حکم نامہ لینے گیا لیکن وہاں مجھے جوائن کرنے کے لیے کہا گیا۔ میری جوائننگ رپورٹ پر امین صاحب نے Welcome (خوش آمدید) لکھا۔ اس کے بعد میں خواجہ صاحب اور 'آفتاب' میں اپنے رفقاء سے رسمی رخصت لینے کے لیے واپس گیا۔ اس دوران مجھے بتایا گیا کہ خواجہ صاحب ناراض ہیں۔ بہر حال! شام کو جب وہ صورہ میں اپنی رہائش گاہ کے لیے روانہ ہونے والے تھے میں طاہر محی الدین کے ساتھ اُن کے کمرے میں گیا۔ یوسف جمیل پہلے ہی وہاں موجود تھے۔ طاہر محی الدین نے اُن سے کہا، خالد صاحب کی انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں نوکری لگ گئی ہے اور یہ رخصت چاہتے ہیں، خواجہ صاحب جو گھر جانے کے لیے کھڑے ہو گئے

تھے، نے ایک ترچھی نظر مجھ پر ڈالی اور کہا I am happy but I will not congratulate you (میں خوش ہوں لیکن تمہیں مبارکباد نہیں دوں گا)۔ الفاظ میں جو غصہ تھا وہ عیاں تھا۔ ایک اور بات جو انہوں نے کہی وہ یہ تھی کہ چونکہ تم حال ہی میں کئی دنوں کی چھٹی پر تھے اس لئے اس مہینے کے ۱۶ دنوں کی تنخواہ تمہیں نہیں دی جائے گی۔ تنخواہ کی بات کس نے کی تھی اور دنوں کا کس نے حساب رکھا تھا؟ اُلٹا مجھے ایسا لگا کہ میں نے جو خواجہ صاحب سے سرکاری ملازمت کا ذکر نہیں کیا تھا تو ان کے فیصلے سے اس گناہ کا گویا کفار ادا ہو گیا۔ اس واقعہ سے پہلے جو حضرات وہاں سے رخصت ہوئے وہ فارغ کیے گئے تھے۔ میں پہلا شخص تھا جو خود رخصت ہو رہا تھا۔ اس بات کی تلخی رہی ہوگی۔ ’آفتاب‘ میں کام کرنے والے کل وقتی صحافیوں میں سے، میں نے سب سے کم یعنی کوئی نو، دس مہینے ہی وہاں کام کیا۔ میرے ہم عصر طاہر محی الدین اور یوسف جمیل کئی برس تک ٹکے رہے۔ وہ مجھ سے پہلے آئے تھے اور میرے بعد وہاں سے رخصت ہوئے۔ بہر حال، میں خواجہ صاحب کا شکریہ ادا کر کے نکل آیا۔ اپنی حساس طبیعت کے باعث میں نے پھر کبھی مڑ کر اُس طرف نہیں دیکھا۔ اُن کے انتقال سے قبل البتہ جب ۲۰۰۸ء میں میں نے محکمہ اطلاعات کے ناظم کا عہدہ سنبھالا تو دو مرتبہ اُن سے ملنے گیا۔ ایک مرتبہ سرینگر میں اور دوسری مرتبہ جموں میں۔ یہ ۲۸ سال کے بعد ہماری پہلی ملاقات تھی۔ وہ علیل تھے اور انہوں نے کسی قسم کی رنجش کا احساس نہیں دلایا۔

روزنامہ ’آفتاب‘ کے ساتھ مختصر وابستگی کے بعد اپریل ۱۹۸۰ء میں میرا تقرر حکومت جموں و کشمیر کے محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ میں بطور انفارمیشن افسر ہوا۔ یہاں میں نے ’ماہنامہ تعمیر اور پندرہ روزہ‘ مکتوب‘ کی ادارت سنبھالی۔ اس دوران ’تعمیر‘ کے کئی خصوصی نمبر شائع کیے جن میں ’جموں و کشمیر میں اُردو ادب نمبر‘، ’پریم چند نمبر‘ اور ’مہجور نمبر‘ کی خاصی پذیرائی ہوئی۔ محکمہ اطلاعات میں پبلک ریلیشنز، ایڈورٹائزنگ اور پبلیکیشنز کے شعبوں کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد جولائی ۲۰۰۸ء میں ناظم اطلاعات کی حیثیت سے اسی محکمہ کے سربراہ کا عہدہ سنبھالا۔ جن دیگر عہدوں پر کام کیا اُن میں ڈائریکٹر لائبریریز اینڈ ریسرچ، ڈائریکٹر آرکائیوز، آرکیالوجی اینڈ میوزیمز، سپیشل سیکریٹری محکمہ ہاؤسنگ اینڈ اربن ڈیولپمنٹ،

ایڈیشنل ٹو سیکریٹری ٹو، چیف منسٹر اور جوائنٹ ڈائریکٹر انسٹیٹیوٹ آف مینجمنٹ اینڈ رورل ڈیولپمنٹ شامل ہیں۔ آج کل سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لیگو بیجر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔

اُردو ادب سے بچپن سے ہی شغف رہا گو کہ ہمارے خاندان میں شعر گوئی کا شوق رکھنے والا میں پہلا اور اب تک واحد فرد ہوں۔ ادب کے تئیں میرے شوق کو سونہ وار میں ہمارے آبائی گھر کے سامنے واقع پبلک ریڈنگ روم نے خوب اُبھارا جہاں جانا میرا روز کا معمول تھا۔ یہاں انگریزی اور اردو اخبارات کے علاوہ کچھ ادبی رسالے بھی آتے تھے جن کے مطالعہ نے مجھے لکھنے پر اُکسایا۔ ابتدا طور پر افسانے لکھے جو مقامی اخباروں میں شائع ہوئے۔ میرا پہلا افسانہ 'انوکھا ملن' کے عنوان سے ۱۵ جنوری ۱۹۷۲ء کو روزنامہ 'آفتاب' میں شائع ہوا۔ اس کے بعد کئی افسانے لکھے جو زیادہ تر اسی اخبار میں شائع ہوئے۔ اس دوران میری توجہ اُردو شاعری کی طرف گئی اور میری غزلیں 'آفتاب' میں تو اتر کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔ 'آفتاب'، 'اُن دنوں کشمیر کے لکھنے والوں خصوصاً نوآموز قلم کاروں کے لیے ایک اہم پلیٹ فارم تھا۔ مینہاں سے کئی معروف ادبی شخصیات منظر عام پر آئیں۔ اُردو شاعری سے میرا میلان اس حد تک بڑھ گیا کہ میں نے افسانوں سے اپنی توجہ یکسر ہٹا کر شعر گوئی کی جانب مبذول کیا۔ ایس پی کالج میں دوران تعلیم میں کالج کی میگزین 'پر تپا' کے اُردو سیکشن کا ایڈیٹر رہا اور ۲۰۰۵ء میں کالج کے صد سالہ جشن کے موقع پر میرا تحریر کردہ 'کالج ترا نہ' ایک پروقار تقریب میں جاری کیا گیا۔

۱۹۸۳ء میں میرا پہلا شعری مجموعہ 'صدائے نیم شب' منظر عام پر آیا جسے جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لیگو بیجر کی جانب سے سال ۱۹۸۴ء کی بہترین اردو تصنیف کا ایوارڈ حاصل ہوا۔ اُس وقت یہ انعام دو ہزار روپے پر مشتمل ہوتا تھا جسے عطا کرنے کے لیے کوئی تقریب منعقد نہیں کی جاتی تھی بلکہ انعام کی رقم کا چیک انعام پانے والے کے گھر بھیج دیا جاتا تھا۔ اب تو نہ صرف انعام کی رقم ۵۱ ہزار روپے تک بڑھادی گئی ہے بلکہ اس کے ساتھ انعام یافتہ ادیب و شاعر کو ایک شال بھی پیش کی جاتی ہے جس کے لیے ایک بڑی تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس مجموعہ پر برصغیر کے ادبی جرائد میں بڑے اچھے تبصرے آئے اور یوں میرا نام وسیع تر

اُردو شعر و ادب کی دنیا میں متعارف ہوا۔ ۲۰۰۸ء میں میرا دوسرا شعری مجموعہ 'خواب پارہ' شائع ہوا۔ پہلے اور دوسرے شعری مجموعے کے منظر عام پر آنے کے درمیان طویل وقفہ کا موجب میری دفتری مصروفیات بھی تھیں اور اس دوران میری توجہ کشمیر کے حوالے سے مختلف موضوعات پر مضامین لکھنے پر مرکوز رہی۔ یہ مضامین ریاست اور ریاست سے باہر کے انگریزی اور اُردو اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ اسی دوران میں نے دریائے جہلم کے حوالے سے کشمیر کی ثقافت، ادب، اساطیر، تاریخ اور معیشت پر Jhelum-The River Through My Backyard کے نام سے انگریزی زبان میں کتاب لکھی جو ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ اس موضوع پر پہلی کتاب ہے جسے بھرپور پذیرائی حاصل ہوئی۔ ۲۰۰۸ء میں اس کتاب کا اضافے کے ساتھ 'دیدہ آب رواں' کے نام سے اُردو ایڈیشن شائع ہوا جس پر مقتدر مصنفوں اور کالم نگاروں نے بڑے اچھے تبصرے لکھے۔ اس کتاب کو جموں و کشمیر اکادمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لنگویج کی جانب سے سال ۲۰۱۰ء کی بہترین اُردو تصنیف کا ایوارڈ ملا۔

مذکورہ کتاب کے لئے تحقیق کے دوران کشمیر کی تاریخ سے میری خاص دلچسپی پیدا ہوگئی اور میں نے سنجیدگی کے ساتھ اس کا مطالعہ شروع کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کشمیر کو اگرچہ پانچ ہزار برس کی تاریخ تحریری صورت میں موجود ہونے کا اعزاز حاصل ہے مگر ایک ایسی تاریخ اب تک لکھی نہیں گئی ہے جو شواہد اور حقائق کے حوالے سے علمی جانچ پر کھری اُترے۔ خاص طور پر قدیم اور وسطی دور کی تاریخ کئی لحاظ سے ناقص اور بعض اوقات بعید از حقائق ہے۔ چنانچہ کئی مافوق الفطرت اور مفروضی واقعات تاریخ کشمیر میں در آئے ہیں جنہیں مورخ نسلاً بعد نسل آگے بڑھاتے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ تاریخ کشمیر کے معتبر نمونوں کی اس لحاظ سے اعتباریت مشکوک ہو جاتی ہے کیونکہ ان میں بہت زیادہ مقدار میں دیو مالا، فسانہ، تعصب، حقائق سے پردہ پوشی اور مبالغہ جیسی خامیاں موجود ہیں۔ قدیم کشمیر کی تاریخ نویسی میں دیو مالا کا بڑا دخل ہے۔ وسطی دور کی تاریخ میں ذاتی تعصب نے بڑی جگہ پالی ہے جبکہ جدید دور کی تاریخ نویسی یا واقعہ نگاری میں مبالغہ آمیزی اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا معمول کی بات ہے۔ اس صورت حال میں ایک صحیح اور شواہد پر پورا اُترنے والی تاریخ کا سامنے آنا

ضروری ہے۔

کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے تاریخ دانوں نے اب تک اس طرف توجہ نہیں کی ہے اور کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے ایک مستند بیانیہ ابھی تک پیش نہیں ہوا ہے۔ میری زیر طاعت کتاب 'کشمیر..... مٹھ آف اے نرٹیو' (Kashmir: Myth of a Narrative) اسی سمت میں ایک کوشش ہے جس کا مقصد کشمیر کی تاریخ پر پڑی گرد صاف کر کے بعض تاریخی واقعات کو صحیح تناظر میں پیش کرنا ہے۔ یہ کتاب تاریخ کشمیر کے حوالے سے 'تسلیم شدہ' اور مقبول عام بیانیہ کو چیلنج کرتی ہے اور ایسے حقائق کو سامنے لاتی ہے جنہیں یا تو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے یا جن پر تاریخ دانوں کی نظر نہیں پڑی ہے۔ کتاب کشمیر کی تاریخ سے متعلق ایک مستند بیانیہ کی ضرورت اُجاگر کرتی ہے۔

اس کتاب کے علاوہ کشمیر کی تاریخ کے بعض دلچسپ واقعات پر مشتمل میری ایک اور کتاب 'اے واک تھر و کشمیر ہسٹری' (A Walk Through Kashmir History) زیر ترتیب ہے۔

اُردو میں اگرچہ میں نے کئی نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن اصل میں میرا میلان غزل کی طرف ہے اور شاعری میں اسی صنف کو اپنا وسیلہ اظہار بناتا ہوں۔ میں نے کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی ہے اور نہ شاعری میں کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مشاعروں میں شامل نہیں ہوتا ہوں اگرچہ ابتدائی ایام میں کئی آل انڈیا مشاعرے بھی پڑھے ہیں۔ ادبی محفلوں سے کم و بیش دُور رہا ہوں۔ اس دور میں زندگی کے ہر شعبے میں نام نہاد افراد اور انجمنوں نے جو طوفانِ بدتمیزی برپا کیا ہے اور انہوں نے ادب کو بھی جس بری طرح پلیٹ لیا ہے اُس سے افسوس ہوتا ہے۔

۱۹۸۰ء کے آس پاس سرینگر میں بعض پر خلوص احباب نے رانیہ س کلب کے نام سے ایک ادبی تنظیم قائم کی جس کے ساتھ میں بھی سرگرمی سے وابستہ رہا۔ اس تنظیم نے سرکردہ ادیبوں اور قلم کاروں کے ساتھ کئی ادبی مجالس کا اہتمام کیا۔ تنظیم سے وابستہ رقاء اپنی جیبوں سے اخراجات برداشت کر کے محافل کا انعقاد کرتے تھے۔ بد قسمتی سے احباب کی انفرادی مصروفیت سے

کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میرا قریبی حلقہ احباب مختصر ہے اگرچہ جان پہچان اور محبت رکھنے والے اصحاب کا دائرہ وسیع تر ہے۔ میرے قریبی دوستوں میں کم و بیش سب نوکری پیشہ ہیں اور اکثر شعر و ادب سے شغف رکھنے والے حضرات ہیں۔ میں جب کوئی نیا شعر یا غزل کہتا ہوں تو اکثر پہلے انہیں سناتا ہوں۔ میری غزلیں برصغیر کے اردو جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اگرچہ میں اپنا کلام کم ہی اشاعت کے لیے بھیجتا ہوں۔

طبیعتاً میں ایک کم گوشخص ہوں اور محفلوں سے کتراتا ہوں۔ میری زندگی کے اس پہلو سے میرے اکثر دوست نالاں ہیں۔ میں فطرتاً شور شرابہ اور ہاؤ ہو سے دور بھاگتا ہوں۔ میں کوئی متحرک قسم کا activist نہیں ہوں۔ مختلف موضوعات اور مسائل پر میں اپنے خیالات کا اظہار اپنی تحریروں کے ذریعہ کرتا ہوں جن میں میرے اشعار بھی شامل ہیں۔ میں کسی تنظیم یا تحریک کے ساتھ وابستہ نہیں ہوں۔ مسائل یا موضوعات پر اپنے دوستوں یا ہم خیال اصحاب کے ساتھ تبادلہ خیال کرتا ہوں یا نظم و نثر کی صورت میں قارئین کے ساتھ۔

تصنیف و تالیف کے علاوہ میرا بیشتر وقت ملازمت کی مصروفیات کی نذر ہوتا ہے۔ خالی اوقات میں اخبارات پڑھتا ہوں، کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں یا ٹیلی ویژن دیکھتا ہوں۔ انٹرنیٹ پر دوستوں کے ساتھ گپ شپ اور surfing بھی میرا شوق ہے۔ فرصت کے لمحات گھر میں گزارنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ خوبصورت مقامات کی سیر کا البتہ بہت شوق ہے اور ایسا کوئی لمحہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا ہوں جہاں کسی پرکشش جگہ جانے کا موقع فراہم ہو۔ اپنے مادر وطن کشمیر سے بے پناہ محبت ہے اور اس کی تاریخ کا ایک طالب علم ہوں۔

ایک دیوانے کا کیری کچر

جاوید آذر

خالد بشیر احمد میرے دوست ہیں، تین دہائیوں سے۔ حیرت میں ہوں کہ میں ان کا تعارف کیسے پیش کروں، کیونکہ خالد صاحب کتاب ہیں۔ ایک نہیں ان کی تین چار کتابیں منظر عام پر آئی ہیں۔ اُن پر بیسیوں مضامین شائع ہو چکے ہیں اُردو اور انگریزی زبانوں میں۔ لہذا وہ کسی تعارف کے محتاج ہی نہیں! پھر سوچا چلے اپنے دوست کی تھوڑی بہت تعریف ہی کریں۔ مگر تعریف کی سزاوارتو وہ ذاتِ مطلق ہے جس کے قبضہ قدرت میں اس کائنات کا ہر خشک و تر ہے، ہر موہوم اور غیر موہوم شے ہے۔ اگر گوشت کے بغیر پوست کے پتلے کی تعریف کی جائے تو نہ معلوم کون کون سے چابک برسیں۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ دن یاد آ گیا جب پہلی مرتبہ خالد سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ نہ تو کوئی مشاعرہ تھا اور نہ کوئی مباحثہ۔ بس ملاقات کرنے کی چاہ تھی، سو سبیل تلاش کر لی۔

۱۹۷۹ء کا سال تھا۔ خالد نے اخبار 'آفتاب' میں اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز کیا تھا اور اکثر ان کی منظومات اخبار کی زینت بنتی تھیں۔ خاص کر ان کا وہ شعری کارٹون مجھے بہت پسند تھا جو اخبار کے صفحہ اوّل پر ہر صبح پڑھنے کو ملتا تھا۔ ہر دن کسی نئے سیاسی پہلو یا سماجی مسئلے پر طنز کے تیر سادھنا کوئی کھیل بھی نہیں۔ خاص اُسی انداز اور قرینے سے، جو پاکستانی اخبار 'نوائے وقت' کا خاصہ تھا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ کے بعد اگرچہ بھارت اور پاکستان کے درمیان رسائل و جرائد اور اخبارات کا تبادلہ بند ہو چکا تھا لیکن محمد عبداللہ رفوگر کی نیوز ایجنسی پر یہ اخبار پتہ نہیں کہاں سے

پھوٹ پڑتا تھا وہ اپنے خاص الخاص خریداروں کو فراہم کرتے تھے۔ ہم تو بس ایک نظر دیکھ لیتے اور شعری کارٹون پڑھتے۔ جب آفتاب میں بھی روزانہ ایسے قطعات دیکھنے کو ملنے لگے تو اُن کے خالق سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ خیال تھا کہ کوئی ریش دراز بزرگ نہیں تو کچھڑی داڑھی والے اچکن زیب تن کیے ہوئے ضرور ہوں گے، لیکن جب معلوم کیا تو پتہ چلا کہ حالِ حال ہی میں یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم۔ اے۔ سے فارغ ہو کر آفتاب میں ملازم ہوئے ہیں۔ اُن دنوں یوسف جمیل، طاہر محی الدین اور وجیہہ احمد اندرابی کو ملا کر یہ چاروں بذاتِ خود ایک قطعہ بلکہ خوبصورت رباعی بن گئے تھے۔

کالج میں خالد کے ہم جماعت اور میرے بچپن کے دوست شبیر احمد نے ان سے ملنے کی سبیل پیدا کی۔ شبیر نے آئی اے ایس اور کم از کم کے اے ایس پاس کرنے کی تیاری کی دھن میں ۳۶۵ دنوں کے اندر تاریخ، ادب، معیشت، سیاست، جنرل نالج اور نہ جانے کن کن الم علم موضوعات پر کم از کم ۳۶۵ کتابوں کا مطالعہ کیا تھا، مگر قدرت کو یہ شاید منظور نہیں تھا، کیونکہ بلیک سروس کمیشن کے دفتر میں آگ کیا پھوٹ پڑی کہ سارے پرچے جل کر راکھ ہونے کے ساتھ اس کی امیدیں بھی خاک میں مل گئیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کئی مہینوں کے بعد پتہ چلا کہ منتخب امیدواروں کی فہرست اس آتش زدگی میں محفوظ رہ گئی تھی اور سربراہ ادارہ کے دونوں بیٹے اس فہرست میں موجود تھے۔ بہر حال وہ دوست کے اے ایس تو نہ بن سکے البتہ چھوٹا موٹا کاروبار کرنے میں مصروف رہے اور مطالعہ کا چسکہ ایسا راسخ ہو چکا ہے کہ اُن ۳۶۵ کتابوں کی تعداد ۳۶۵۰ سے زائد ہو گئی ہے۔

بہر حال انہی دوست کے ہمراہ جب میں اخبار 'آفتاب' کے دفتر میں خالد سے ملنے پہنچا تو دروازے پر کھلویا۔ یہاں یہ کہتا چلوں کہ 'آفتاب' کے کالموں میں میرے چند تجویز نامہ اسلے اور فلم 'آوارہ' والے راج کپور کی پتلون کی طرح آدھے ٹخنوں سے اوپر اور آدھے نیچے قسم کے اشعار بھی شائع ہوئے تھے، لیکن اخبار 'آفتاب' کا خیال ذہن میں آتے ہی لال چوک کے پلڈیم سینما کا خیال آتا ہے، جس پر کبھی نرگس، مینا کمار، وحیدہ رحمن اور شرمیلا ٹیگور کی جوانیوں کا جلال چھایا رہتا تھا۔ آج اس کے تباہ شدہ کھنڈروں میں یا تو خود رو جھاڑیوں اور

بچھو بوٹی کے طول طویل پودے سر اٹھائے راگبیروں کو یہ باور کراتے ہیں کہ اب ہم یہاں ہی ہیں یا پھر اس کے نیم منہدم بکروں پر سی آر پی ایف کے پھریرے یہ عندیہ دیتے ہیں کہ خبردار! ہم بھی ہیں یہاں!۔ اسی پلڈیم سنیما کے سامنے جب صبح ساڑھے نو بجے سنیما کا بینڈ باجنی فلم کی تشہیر کے لیے شہر کے گلی کو چوں میں روانہ ہونے کے لیے تیار کھڑا ہوتا اور ۶۲ انچ چھائی پر ٹکائے ہوئے ڈرم پر اسمعیل پہلی ضرب مارتا تو اخبار آفتاب کے مدیر اعلیٰ خواجہ ثناء اللہ بٹ قصاب کے بغدے کی دھار کی طرح استری کیے ہوئے زیتونی رنگ کا تھری پیس سوٹ زیب تن کر کے لال چوک میں کھڑے ہو جاتے تھے اور قرب و جوار سے کلف لگی خاکی وردی میں ملبوس پولیس کے افسران ان کے پاس آکر بادب باملاحظہ کھڑے ہو کر مگو گفتگو ہو جاتے۔ اُس وقت اُس چھ ضرب چھنٹ دنیا پر ہیبت اور جلال کا یہ عالم ہوتا تھا کہ راہ گیر کنکھیوں سے دیکھ کر ایک دوسرے سے کہتے ”یہ ہے سونہ آفتاب“۔

اسی سونہ آفتاب کے دفتر میں خالد سے ملنے گیا تو وہ پنسل ہاتھ میں لیے باہر آئے، مگر انہوں نے اندر نہیں بلایا، جسے میں نے اس وقت غنیمت ہی سمجھا، کیونکہ بچپن میں خواجہ کے جلال کا مرتسم تاثر ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ چھوٹے ہی میں نے انہیں اُسی دن کے شمارے میں شائع شدہ میر حسن کی مثنوی ”زہر عشق کی پیروڈی قہر عشق“ لکھنے پر مبارکباد پیش کی اور انہیں طنزیہ شاعری کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے کا مشورہ بھی دیا۔ اگرچہ اُن پر کسی کے کہنے کا زیادہ اثر نہیں ہوتا وہ سنجیدہ شاعری سے دامن کش نہ ہوئے تاہم ذائقہ بدلنے کے لیے وہ کبھی کبھی طنزیہ شعر ضرور کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ موبائل کی وساطت سے یہ مشکل بھی اب آسان ہو گئی کہ ایسے اشعار وہ اپنے قریبی دوستوں کو SMS کر کے ضرور بھیجتے ہیں۔ البتہ یہ معلوم نہیں کہ اس طنز کے عمومی ہی نہیں بلکہ خصوصی اور زیادہ تر اکلوتے ہدف سجاد حسین کو بھی یہ SMS ملتے ہیں کہ نہیں کیونکہ بی ایس این ایل والوں نے سروس کا ایسا کباڑا کر لیا ہے کہ اب کوئی بھی دوست اپنے گناہ بخشوانے کے لیے آسانی کے ساتھ بی ایس این ایل کا سہارا لے سکتا ہے۔ بات آفتاب کی ہو رہی تھی تو اسی آفتاب سے خالد بشیر احمد کی تحریر و تصنیف کا کیریئر شروع ہوا۔ آفتاب میں کام کرنا کیا ہے؟ بس اتنا سمجھ لیجیے اگر فرہاد کے زمانے میں اخبارات

شائع ہوا کرتے تو شاید اُسے شیریں کی طلب میں کوہ کنی کے بجائے آفتاب میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا جاتا۔ میرے دوستوں طاہر محی الدین اور ظہور ہاشمی کو میری اس نجی رائے پر شاید کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ خالد نے خواجہ ثناء اللہ پر اپنا زبردست Impression قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی جس کا یہ نتیجہ ظاہر ہوا کہ پہلی مرتبہ کسی اردو اخبار میں خبر کے ساتھ جب بائی لائن لگی تو اُس پر خالد بشیر کا نام تھا، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا کیونکہ خالد نے ۱۹۸۰ء میں سرکار کے اُس آنچل کے زیر سایہ پناہ لی جہاں پلتے تو سبھی ہیں لیکن ماں کے آنچل تلے نہیں، جو ہر بچے کو یکساں سایہ فراہم کر سکے۔ آفتاب کی چکا چوند سے باہر آنا بھی کوئی معمولی مسئلہ نہیں تھا تاہم خواجہ صاحب نے انہیں مبارکباد دیتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ ”مجھے اس بات کی خوشی تو ہے کہ تم سرکاری افسر بن گئے ہو لیکن میں تمہیں مبارکباد نہیں دے سکتا۔“

محکمہ اطلاعات کا کام تو بس سرکار، سرکار اور سرکار ہوتا ہے لیکن یہاں بھی خالد نے ”تعمیر“ اور ”مکتوب“ کے مدیر کی حیثیت سے ان کی علمی اور ادبی وقعت اور وقار میں اضافہ کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ خاص کر ”تعمیر“ کے چند اہم نمبر جن میں مجبور نمبر، پریم چند نمبر اور جموں و کشمیر میں اردو ادب نمبر ریاست کی ادبی صحافت میں ایک زریں اضافہ سے کم نہیں۔ کوئٹہ کشمیر تحریک کے دوران مرحوم شیخ محمد عبداللہ کے قریبی ساتھی رہے، محمد یوسف علیگ جنہوں نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام ایبٹ آباد پاکستان میں گزارے، کو جب میں نے ”جموں و کشمیر میں اردو ادب نمبر“ بھیجا تو اس کے جواب میں جو خط انہوں نے مجھے لکھا تھا اُس کی تحریر پر مرحوم علیگ کے آنسوؤں کی سند صاف دکھ رہی تھی۔

۱۹۸۰ء کے آس پاس سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان، جنہیں عرف عام میں بادشاہ خان کے لقب سے جانا جاتا تھا، کشمیر کے دورے پر آئے تو محکمہ اطلاعات نے ان کی شخصیت پر مکتوب کا ایک خصوصی شمارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ خالد نے فوراً حرکت میں آ کر سارے عملہ اور محکمہ اطلاعات سے دور دور تک کا بھی واسطہ نہ رکھنے والے دوستوں کو حرکت میں لا کر موصوف کی زندگی اور کشمیر کی سیاست کے ساتھ ان کے حوالوں پر مضامین اور شذرات تحریر

کروا کر ۲۸ گھنٹوں میں ایک خوبصورت شمارہ تیار کروایا، لیکن وائے رے قسمت! گورنمنٹ پریس کی 'برق رفتار' مشینوں کی مہربانی سے جب وہ شمارہ تیار ہو کر آ گیا تو اُس وقت سرحد کے یہ بادشاہ، جنہوں نے ۱۹۸۹ء میں گاندھی کے دلیس گجرات میں مسلمانوں کے خلاف برپا کیے گئے فساد کا حال دیکھ کر یہ کہا تھا کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ گاندھی مر گیا ہے"، کی سرکاری گاڑی چشمہ شاہی کے گیٹ ہاؤس کے گیٹ سے باہر آرہی تھی۔

خالد کے دوستوں کو ہمیشہ یہ شکایت رہی ہے کہ خالد کی صلاحیتیں سرکاری نوکری کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ انہیں اگر کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہ کہنے سے نہیں چوکوں گا کہ وہ سرکاری ملازمت میں misfit ہیں۔ انہوں نے جب کلچرل اکیڈمی کے پہلے مشاعرے میں شرکت کی تو مخلوط مشاعرے کی صدارت بزرگ شاعر رشید ناز کی کر رہے تھے۔ خالد نے جب اپنی غزل سنائی تو موصوف کہیں کھو سے گئے۔ میں نے ناز کی صاحب سے کہا کہ آپ تو کہیں کھو گئے ہیں۔ انہوں نے جواباً کہا کہ خالد کے شعروں میں جہلم کی موجوں جیسی روانی اور رومان کی حلاوت اور جذبے کی شدت کا آمیزہ ہے۔ اس کے بعد خالد نے شعر کہے اور اچھے خاصے کہے، لیکن نہ تو محفلوں کی زینت بنے اور نہ رسائل و جرائد کی طرف مائل ہوئے۔ کبھی کبھار دوستوں کے اصرار پر کچھ اشاعت کے لیے بھیج دیا تو بھیج دیا ورنہ ایک لمبے قہقہے کے ساتھ مخاطب کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر حساب برابر کر دیا۔

شہرت سے بھاگنا یا تو انکسار ہے یا پھر کمزوری، لیکن کمزوری تو ان میں کوئی ایسی خاص دیکھی نہیں، جو منہ چھپائے بنا نہ بنتی۔ ہاں ایک کمزوری ضرور ہے، وہ جہلم سے رشتے کی کمزوری۔ غالباً اس لیے کہ سونہ وار میں ان کا آبائی مکان دریائے جہلم اور جموں سرینگر شاہراہ کے درمیان میں واقع ہے۔ یہیں پہ ان کی نال گڑھی، یہیں پہ بچپن کھیلا، یہیں اپنی جوانی پر ریشیوں اور منیوں کا بھاری بھر کم چولا زیب بدن کیا، فکر بھی یہیں پروان چڑھی، حوصلے بھی یہیں پیدا ہوئے۔ یہ دونوں شاہراہیں ہماری تاریخ، ہماری ثقافت، ہمارے تمدن ہمارے ادب اور ہماری سیاست کے دو کلیدی باب ہیں، جو ہمارے ماضی اور حال کی شرح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ غالباً یہی اثر تھا کہ خالد نے جہلم کو ایک نئے عنوان نئے انداز اور نئی نظر کے ساتھ

دیکھا۔ ہزاروں برسوں پر محیط کشمیر کی تاریخ پر جہلم کے تناظر میں نظر دوڑائی۔ - Jehlem
The River Through My Backyard شائع ہوئی تو مستند تاریخ دانوں نے اسے
تاریخ کشمیر میں Jehlum Factor کا نام دیکر ان کی محنت کو خراج تحسین پیش کیا۔ کتاب کا
مطالعہ کر کے امریکہ میں مقیم میرے ایک سائنسدان دوست نے مجھے خط لکھا۔ کاش! خالد ادب
کی بجائے تاریخ پر اپنی توجہ مرکوز کرتے۔

جہلم کے بارے میں ہم سب بچپن سے پڑھتے آئے ہیں جب اسے وقتا کے نام
سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے وجود کے ساتھ منسلک اساطیر، دیو مالائی کرداروں کا دنیاوی
روپ۔ یہ سب باتیں بچپن سے ہمارے ذہن پر مرتب تھیں۔ انہوں نے دنیا کے کئی بڑے بڑے
دریاؤں سے منسلک اساطیر کا مطالعہ کر کے کئی ایسی باتیں سامنے لائیں جو عام طور پر ہمارے علم
میں نہ تھیں مثلاً، چین کے دریائے یانگتر، جس پر ایشیا کا سب سے بڑا تھری گارجز ڈیم تعمیر کر
کے چین نے اقتصادی ترقی کے ایسے جھنڈے گاڑ دیے کہ آج امریکہ کے پرائمری اسکولوں
میں بچوں کو انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ چینی زبان سکھانے کے منصوبے باندھے جا رہے
ہیں۔ اساطیر کے مطابق یہ دریائے یانگتر، جن تھری گارجز ڈیم تعمیر کر کے اقتصادی ترقی کی دوڑ
میں ہزاروں برس قدیم سینکڑوں ثقافتی آثار کو غرق کر دیا گیا، بھی ایک دیوی کے کایا کلپ
سے چین کو زرخیز بنانے کے لیے وجود میں آیا۔ جہلم کے بارے میں بھی قدیم کتابوں میں درج
ہے کہ یہ بھگوان شوکی معشوقہ پاروتی جی کا روپ ہے۔ جہلم کے حوالے سے ہمیں بہت حد تک
یک طرفہ تاریخوں کا مطالعہ کرنے کو ملا ہے، لیکن خالد نے اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر کے
وادی جہلم کی مکمل اور جامع تفسیر پیش کر کے تاریخ کے تجزیاتی مطالعہ میں ایک چھوٹی سی لیکن نئی
طرح ڈال دی۔ یہاں پر آکر خالد کی شاعری اور کشمیر کی تاریخ کے تئیں ان کا شعور مخلوط ہو جاتا
ہے۔ جب جہلم کی ہر دم اٹھتی اور ٹوٹی لہروں اور ڈل کے کھر درے پانیوں کا ذکر آتا ہے، تو اُن
کا جذبہ دروں خون بے پایاں کا روپ دھار لیتا ہے۔ کشمیر کی تہذیب، ثقافت اور شناخت
انہیں ہمیشہ عزیز رہے ہیں۔ ان کے برادر اکبر ڈاکٹر محمد اسماعیل بٹ صاحب کو دہرہ دون سے
کشمیر واپس لانے کے پیچھے بھی ان کا یہی جذبہ کار فرما تھا کیونکہ انہیں اپنے وطن کے تئیں

خدمت گزاری میں مصروف دیکھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ بٹ صاحب کو غیر ممالک میں کئی assignment ملے لیکن خالد کی وجہ سے وہ ہمیشہ کئی کتراتے ہیں۔

یہاں ایک لطیفہ سناؤں کہ خالد کے سب سے بڑے بھائی ڈاکٹر محمد شفیع جب چندی گڑھ میں تھے تو انہوں نے اپنے کسی دوست کے لیے کشمیر سے کوئی خاص تحفہ لانے کی فرمائش کی۔ خالد نے شہر کے کئی بازاروں کے چکر کاٹ کر بڑی وقت نظر کے ساتھ ایک تحفے کا انتخاب کر کے اُس کی نہایت ہی خوبصورت کاغذ میں پیکنگ کر کے یہاں سے چندی گڑھ پہنچایا۔ جب ڈاکٹر صاحب نے تحفہ کھول کر دیکھا تو ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ خروٹ کی لکڑی پر انتہائی خوبصورت اور باریک کندہ کاری کیا ہوا الیش ٹرے یقیناً جاذب نظر اور کشمیریوں کی دستکاری کا منہ بولتا نمونہ تھا، لیکن ان کی آنکھوں سے جب حیرت کے اثرات زائل ہوئے تو وہ اُچھل اُچھل کر قہقہے مارنے لگے کیونکہ ڈاکٹر صاحب جس دوست کو تحفہ دینے والے تھے وہ کوئی سردار جی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ قیمتی تحفہ اب خالد کے کمرے کی زینت بنا ہوا ہے جہاں خالد تو اُسے صرف دیکھتے رہتے ہیں اور اپنے دوست سجاد حسین اپنی ڈبیا میں بچے اکلوتے سگریٹ کو مروڑ کر دوستوں کے سگریٹ اڑا کر رکھ اسی الیش ٹرے میں جھاڑتے رہتے ہیں۔

خالد کے مزاج کی تہہ داریاں دیکھتے دیکھتے میرے کوئے کی رنگت جیسے کالے بال سفید ہو گئے مگر ہر دن ان کے مزاج کا کوئی نہ کوئی انوکھا زاویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ خالد کی اپنی کامیابیاں ہیں اور اپنی ناکامیاں ہیں، مگر ان کی کامیابیاں ان کی والدہ مرحومہ کی دعاؤں کا ثمرہ ہیں اور ناکامیاں اپنے مزاج کی ناہمواریوں کا نتیجہ۔ دھان پان کی جسامت والی نورانی پیکر والدہ محترمہ جب خالد کے سامنے ہوتی تھیں تو ان کے چہرے پر ہمیشہ ایک روشنی نظر آتی تھی۔ میں نے زندگی میں کئی دیوانے دیکھے ہیں، لیکن خالد کی دیوانگی بالکل مختلف ہے۔ مادر وطن اور والدہ محترمہ کو ان کی سجدہ گاہ ثانی قرار دوں تو حکم کفر لگنے کا خطرہ ہے۔ ایک مرتبہ اجمیر شریف گئے تو وہاں درگاہ عالی کے دروازے پر کسی غریب کو دھکے مار مار کر باہر نکالتے ہوئے دیکھا تو استفسار کیا۔ کون ہو کہاں کے ہو؟ تو غریب نے کہا کہ میں جموں و کشمیر کے اُدھم پور کا رہنے والا ہوں۔ مزدوری کرتا ہوں۔ سوچا خوبہ کے روضہ پاک پر حاضری دوں مگر مجاور حضرات نذر و نیاز

کے بغیر اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔ خالد، جنہیں کسی نے کبھی اپنی قمیض کی آستیوں کے بٹن کھولتے ہوئے بھی نہیں دیکھا ہے، نے آستین اوپر چڑھا کر خواجگان کی ڈیوڑھی کے رکھوالوں سے دودھ ہاتھ کرنے سے بھی احتراز نہ کیا اور اپنے ہم وطن کو روضہ شریف تک اپنے ساتھ لے گئے۔

والدہ محترمہ قدرے علیل تھیں۔ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں، میں سرہانے بیٹھا تھا۔ خالد کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی، میں نے کہا کہ ذرا تم آرام کر لو۔ بڑی مشکل سے تکیہ اٹھا کے والدہ کی پائنتی لیٹ گئے۔ والدہ محترمہ نے بہتیرا اعتراض کیا، مگر خالد نے ایک نہ مانی۔ کہا کہ میں نے سنا ہے کہ جنت ماں کے قدموں میں ہے اس لیے اس پر عمل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بس یہی دوجذبے ہیں جو خالد کی زندگی کی مفصل تفسیر ہیں اور یہی ان کا تعارف یہی ان کی شاعری اور یہی ان کی نثر۔ آپ اسے ان کا تعارف سمجھیں یا میری ذات کا مرثیہ۔ میں نے سوچا کہ اپنے جیتے جی اپنے دوست کے بارے میں کچھ کھری کھوٹی کہوں۔ کیا پتہ کہ کل کو میں ہی پہلے چلا جاؤں، ہمارے برادر ڈاکٹر محمد اسماعیل بٹ صاحب ہمیشہ کہتے رہتے ہیں کہ کشمیر زلزلوں کے خطرناک زون میں واقع ہے اور یہاں کسی بھی وقت ایسا زلزلہ آسکتا ہے، جو ریکٹر سکیل پر ۸ اور ۹ درجے کے درمیان ہو سکتا ہے۔ کیا پتہ کب زلزلہ آئے اور کون رہے اور کون نہ رہے۔

صدائے نیم شب

سلسلہ اشعار

عصری آگہی سے متصف شاعر

پروفیسر حامدی کاشمیری

موجودہ صدی کے نصف اوّل تک ریاست کے جو شعراء اردو میں لکھتے رہے وہ عام طور پر اُن ہی روایات اور میلانات کی پاسداری کرتے رہے جو اُس دور سے مختص تھے اور اردو کی دنیا میں مروج تھے۔ ان میں وطنیت، جذبہ آزادی، فطرت نگاری، اقبالیت، رومانیت اور اشتراکیت کے رجحانات نمایاں ہیں۔ یہ رجحانات ماسوائے اقبال کے، کسی عظیم شاعر کو پیدا نہ کر سکے۔ ان رجحانات سے متعلق اکثر و بیشتر شاعری میں خیالات کو نظم کرنے کا غیر تخلیقی انداز کار فرما رہا ہے۔ یہی صورت حال ریاست کے اُن شعراء کے یہاں بھی ملتی ہے جو ان رجحانات سے متاثر رہے ہیں۔ تاہم اُن کے یہاں بعض نظمیں ایسی ضرور ملتی ہیں جو اظہار کی دل کشی اور اسلوب کی انفرادیت کی مظہر ہیں۔ ریاست کے ایسے شعراء کے مقابلے میں اس دور اور اس قبیل کے دیگر ملکی شعراء کو اگر کوئی امتیاز حاصل ہے تو یہ ہے کہ اُن کے یہاں اس نوع کی منظومات کیمیت کے اعتبار سے زیادہ ہیں۔ اس لیے اردو شاعری کی تاریخ کے مرتبین کے لیے ریاستی شعراء کو نظر انداز کرنے کا کوئی جواز موجود نہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ اردو کے مورخوں اور نقادوں نے کشمیر کے شعراء کا کہیں بھولے سے بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ اس غفلت شاعری کی چند در چند وجوہات ہیں جن کا ذکر یہاں ممکن نہیں۔ تاہم دو اہم اسباب کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اوّل، موجودہ دور ہی کیا، ماضی کے کسی دور سے متعلق اردو میں کوئی جامع، معروضی اور تنقیدی تاریخ ابھی تک رقم نہیں ہوئی ہے۔

اُردو میں انگریزی کی لیگوی کڑا مہمان کی بسیط اور تنقیدی تاریخ یا ایغار ایونیز کی مختصر مگر جامع تاریخ کے مماثل تاریخ جانے کب لکھی جائے گی۔ اُردو کے بدقسمت طلبہ اب بھی اعجازِ حسین کی تکراری اور سطحی تاریخ کو ایک سزائے سخت کی طرح جھیل رہے ہیں۔ سکسینہ کی تاریخ تو کب کی عجائب گھر کی زینت بن چکی ہے۔ اس لیے اگر اُردو کی تاریخوں میں اہل کشمیر کا ذکر نہیں تو ملال یا ترڈو کی بات نہیں۔ رہے نقادانِ کرام، تو میں یہ بات پورے وثوق سے کہوں گا کہ اُردو میں صاحبِ نظر اور اہل الرائے نقادوں کا قحط ہے۔ اکثر نقاد ادب کی بنیادی آگہی و علم ہی سے محروم ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ماہر اور چابکدست صحافی ادب کی مملکت میں در آئے ہیں اور وہ سیاست اور معاشرت کی طرح ادب پر بھی روانی سے قلم چلاتے ہیں۔ ایسے نقادوں کے نزدیک واثق جو نیوری اور ساغر نظامی بھی ویسے ہی بڑے شاعر ہیں جیسے اقبال اور فیض اور نتیجہ معلوم۔ اس ہجوم میں جو گنتی کے چند معتبر نام ہیں وہ گروہ بندیوں، مالی منفعتوں، مصلحت پسندیوں اور علاقائی عصبیتوں کے اتنے شکار ہیں کہ اُن سے معروضی رویے، ذہنی آزادی اور بے لاگ قدر بندی کی توقع کرنا بے سود ہے۔ ایسے لوگ کشمیر جیسے دُور افتادہ علاقے میں اُردو میں خاموشی، انکساری اور لگن سے لکھنے والوں کی طرف متوجہ ہونے سے رہے۔

کشمیر کے اُردو شعراء کے لیے گم نامی کی تاریکی میں رہنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اُردو زبان پر جملہ حقوق بحق لکھنؤ اور دہلی محفوظ سمجھے جاتے رہے ہیں۔ اس متعصبانہ رویے کے اقبال اور فیض جیسے شعراء بھی شکار رہے ہیں۔ نشر و اشاعت کے موثر وسائل کی عدم موجودگی بھی یہاں کے قلم کاروں کے منظرِ عام پر آنے میں مانع رہی ہے۔

معاف کیجئے، میں اُن اسباب کا تجزیہ کرنے لگا ہوں جو اہل کشمیر کی ادبی خدمات کی جانب بے اعتنائی کے ضامن رہے ہیں۔ اس کام کو کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہوئے میں اس طمانیت بخش حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ حوصلہ شکن حالات کے باوجود یہاں کے لکھنے والے نام و نمود کی پرواہ کیے بغیر پرورش لوح و قلم کرتے رہے ہیں۔ اور آج یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ نئی نسلوں سے تعلق رکھنے والے کئی شعراء اور افسانہ نگار ملکی سطح پر اپنی اہمیت منوار ہے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے بعد شعری رویوں میں جو بنیادی تبدیلی آگئی۔ ریاست کی نئی نسل کے شعراء اُس سے گہرے طور پر متاثر ہیں۔ انہوں نے آغاز کار ہی سے نظریاتی جکڑ بندیوں کو مسترد کر کے ذہنی آزادی سے اپنے داخلی ردِ عمل کے اظہار کی جانب توجہ کی۔ یہ شعراء معاشرت، عشق، سیاست اور زبان کے گھمبیر مسائل سے متصادم ہو کر اپنے پارہ پارہ وجود کی کر بنا کی سے گزر رہے ہیں۔ ان کے یہاں خطابت، وضاحت اور مقصدیت کے بجائے خود کلامی، ایجاز بالواسطہ جمالیات اظہار کی کار فرمائی ملتی ہے۔ ان شعراء میں سے بعض کی تخلیقات ملک کے معیاری جرائد میں بھی جگہ پا چکی ہیں مگر اُردو دانوں اور نقادوں کا جو متعصبانہ رویہ اُن کے پیش روؤں کے بارے میں آتا ہے، ان کے بارے میں بھی ہے۔ نقادوں کے اس سنگ بستہ رویے کی شکست لازمی ہے۔ اور یہ پیہم عمل تخلیق ہی سے ممکن ہے۔

کشمیر کے نئے شعراء میں خالد بشیر بھی پورے انہماک، لگن اور آگہی سے اپنی ذات کے حوالے سے نئی حسیت کی پیکر تراشی کر رہے ہیں۔ وہ ابھی چند برسوں سے لکھ رہے ہیں لیکن اُن کے یہاں شروع ہی سے لفظوں کے دشت و سراب میں بہکنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے حسی تجربوں کی بار آفرینی کا جو تجسس اور اشتیاق ملتا ہے وہ اُن کے روشن مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ اُردو کے اکثر ہمعصر شعراء زبان و اسلوب کی تازگی کا احساس دلانے کے باوجود خیالات کی شاعری کرتے ہیں اور خود ہی اپنے تخلیقی ذہن کو مشکوک بناتے ہیں۔ یونے صحیح کہا ہے کہ خیالات شاعری کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ تنہائی، گم گشتگی یا فریب گشتگی جو آج کے وجودی ردیے کے مظاہر ہیں، کو سوچے سمجھے گئے خیالات کے طور پر ادا کرنے سے حقیقی شاعری وجود میں نہیں آسکتی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ خالد بشیر خیالات سے دامن کش ہو کر اپنے اندرون میں اُگنے والے سایہ و پیکر میں دل چسپی لیتے ہیں اور اپنے لیے ایک موزون اور بار آور شعری فضا کی تشکیل کرتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ملک کے اُن نئے شعراء سے کسی طرح الگ نہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے عصری شاعری کے فہرست ساز نقاد تھکتے نہیں۔

خالد بشیر عصری آگہی سے متصف ہیں۔ وہ معاصر شعراء کے فکری، لسانی اور معاشرتی رویوں سے باخبر ہیں اور ان سے اخذ و اکتساب کے عمل سے گزر رہے ہیں۔ اُن کے لہجے

زبان اور طرزِ فکر پر نئی شاعری کے بعض علمبرداروں مثلاً ناصر کاظمی کی پہلی بارش کی غزلوں کے اثرات مرتسم ہیں اور کئی جگہوں پر اُن کی آواز پر بعض دیگر شعراء کی صدائے بازگشت کا گماں ہوتا ہے لیکن اس سے مایوسی اس لیے نہیں ہوتی کیونکہ خالد بشیر اپنی کم عمری کے باوجود بعض مقامات پر شخصی ردِ عمل کی سچائی کا احساس دلاتے ہیں اور اُن کے لفظ و پیکر سے اُن کے ذاتی تجربوں کی تیز کرنیں پھوٹی ہیں اور قاری کی احساساتی فضا کو روشن کرتی ہیں۔

خالد بشیر ریاست کے دیگر شعراء کی مانند اپنے تخلیقی سفر میں مصروف ہیں۔ وہ تجربے اور اظہار کی کشاکش سے گزرتے ہوئے اپنے شعری تجارب کی توسیع و تشکیل کر رہے ہیں۔ اُن کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو انہیں ملکی شعراء کے ہم پلہ بنانے کی ضمانت فراہم کرتے ہیں اور معاصر نقادوں کے لیے چیلنج کا حکم رکھتے ہیں۔

خالد بشیر بلاشبہ ایک باشعور، حساس اور محنتی شاعر ہیں۔ میں بزمِ شعر میں ”صدائے نیم شب“ کا تحفہ لے کر اُن کی آمد کو خوش آمدید کہتا ہوں اور کشمیر میں نئی شاعری کے لیے اُن کے مجموعہ شعر کو فالِ نیک سمجھتا ہوں۔

صدائے نیم شب..... ایک تاثر

مصور سبزواری

جب پچھلے دنوں میں نے اپنے منتشر خیالات کی معمولی سی شیرازہ بندی کر کے خالد بشر کے اولین مجموعہ 'صدائے نیم شب' کا مطالعہ کرنا چاہا تو پہلے مجموعے کے خالق کی تصویر اور سن پیدائش کو دیکھ کر ٹھنک گیا۔ تیس سال کی عمر میں گوتم بدھ اور مہابیر سوامی کی طرح زندگی کے خوبصورت لوازمات کو چھوڑ کر راہب بن جانا تو زیادہ مشکل نہیں لیکن ایسی شاعری کرنا جو شاعری کی مردوجہ ساخت سے الگ ہو جانے کی واضح جرأت کرے، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ جدید غزل کا موجودہ دور کم از کم ہندوستان میں تھکن اور مراجعت کا ہے۔ کمار پاشی، بشر بدر وغیرہ کی طرح بیشتر جدید غزل گو اب ایسا رویہ اپنا رہے ہیں جیسے ماضی میں اپنے کیے ہوئے کارناموں پر پشیمان ہوں اور ان کی تلافی نسبتاً کم جدید تلازموں اور استعاروں سے کرنا چاہتے ہوں۔ وجہ ظاہر ہے تخلیقی ذہن کی جمع و تفریق کا یہ لوگ شکار ہو گئے ہیں اور اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں کہ اب ان سے خوب سے خوب تر کی توقع قطعی عبث ہے۔ ادھر دو چار نئے اذہان ناپختہ اور ادھ کچے جذبات کی جو کچھڑی لے کر سامنے آتے ہیں، ان کی شاعری طوطا مینا کی کہانی سے ذرا بھی آگے نہیں بڑھی۔ شکستگی کا بے حد معصوم احساس محمد علوی کے یہاں البتہ ہمیں ملا تھا۔ سواب جدید ترین غزل گو جب اس کا رزار خاموش میں اترے تو ان کے لب و لہجے کی معصومیت فن سے ہی عاری ثابت نہیں ہوئی بلکہ شعری ہیئت کا ایک بے حد غیر شاعرانہ مرتق سامنے آیا۔

خالد بشیر کی شاعری حیرت انگیز طور پر جدید اور جدید ترین شعراء سے مختلف ہے۔ اس نے جان بوجھ کر ماضی کی صدیوں سے اپنے پسندیدہ لمحوں کی انفرادی کشیدہ نہیں کی ہے۔ نہ اس کے یہاں نام نہاد جاندار تخلیقی جملے ہیں، نہ قدموں کو جما کر وہ کانچ کے فرش پر چلا ہے، نہ اس نے خوف اور ہیبت کی ڈرامائی اور مصنوعی فضا تیار کی ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ اہم اور واضح رجحان جو اس کی شاعری کا ہنر ہے اور شمرہ ہنر بھی ہے وہ اپنے دور کی ناہمواریوں سے اُلجھنا ہے۔ اس کی شاعری سو فیصدی تخلیقی ذہن کا وہ بے آواز سفر ہے جو عصری لمحوں اور سماجی مجہولیت کی سفاکی کو احتجاجی ڈور سے باندھنے کی دانستہ کوشش نہیں کرتا بلکہ کرب ناک سچائیوں کی فنکارانہ کشیدہ کاری کرتا ہے۔ غیر یقینی ٹوٹے ہوئے ادھورے لمحوں میں عدم تحفظ کے احساس کو اپنی ذات کے وسیلے سے جس طرح خالد بشیر نے پیش کیا ہے وہ احساس صرف اس کا اپنا ہی معلوم ہوتا ہے۔ حالات کی جبریت میں اپنی بھرپور شناخت کا مسلسل اصرار کس کو نہیں ہوتا، اپنی قدروں کی نمائندگی نہ ہونے کا عمیق دکھ کون نہیں کرتا لیکن خالد بشیر اس منزل میں بھی اپنی اساسی فکر اور اپنے تشخص کے گم شدہ کردار کی بازیافت کے مسلسل عمل میں اس قدر مہمک رہا ہے کہ اکثر اس کے انفرادی تجربے اجتماعی احساس بن گئے ہیں جیسے

یہ زلزلہ بھی تباہی مچا گیا کیسی
مکان کھڑا تو ہے کمرہ نظر نہیں آتا

ایسا ہوا کہ راستے سر سبز ہو گئے
اک پیڑ برگ برگ کھڑا سوکھتا گیا

خود اپنا ہمسایہ بن کر
میں اپنے اندر رہتا ہوں

میرے ہی شانوں پر بندوق رکھی تھی سب نے
مجھ پہ ہی خوف حریفوں کا بڑا طاری تھا

میں نے ابھی ذکر کیا تھا کہ 'صدائے نیم شب' کی پہلی خصوصیت یہی ہے کہ اس کا خالق اپنے دور کی ناہمواریوں اور ریاکارانہ محبتوں سے جہاں جہاں بھی اُلجھا ہے وہاں وہاں وہ کرب ذات سے نکل کر کائنات کے آفاقی کرب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ دوسرے جدید شعراء کی طرح خالد بشیر نے سراہوں اور پرچھائیوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر اپنے شعری رویے کا دم نہیں توڑا ہے اور نہ ہی اسے دوسروں کی طرح خواب اور تعبیر کے متضاد کناروں کی یکجائی کا شدید اور رائیگاں انتظار ہے۔ اس نے جذبوں کو اکثر و بیشتر نئے تخلیقی لمحات کے ساتھ استعمال کیا ہے۔

پہلے مرحلے میں 'صدائے نیم شب' کے بیشتر اشعار قاری کے ذہن کو متحرک کرتے ہیں اور دوسرے مرحلے میں وہ قاری کے ساتھ مزاحمت کرتے ہیں۔ وہ کردار جو تاویل بھی کرتے ہیں اور مخالفت بھی، خالد بشیر کے یہاں غیر معمولی ڈھنگ سے در آتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خالد بشیر جذباتی اور حسی سطح پر کوئی لاثانی اور لافانی شاعر ہے بلکہ خیر و شر کے فطری اور متوازن امتزاج سے جو اس نے موجودہ زندگی کے موجودہ اقدار کے بصری اور فکری پیکر تراشے ہیں ان سے نہ صرف امکانات کے نئے نئے افق ہی اشعار سے طلوع ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں بلکہ تجریدی ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہوئے بھی معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے یہاں جدلیاتی لفظیت کوئی تکرار اور ٹکراؤ سے الگ ایک ایسا غیر تقلیدی استعاراتی نظام نظر آتا ہے اور نظر آنے کے ساتھ ساتھ اسی لمحے محسوس بھی ہوتا ہے جو دوڑتے بھاگتے لمحوں سے پیدا شدہ سماجی اور نفسیاتی مسائل کو حل کرنے کی بشارت دیتا ہے۔ مثلاً

میں ہوں آواز مجھے قید نہ کر خوابوں میں
تُو ہوا ہے تو مرے در پہ ٹھہرتا کیوں ہے

عجیب لوگ تھے خوابوں کی بات کرتے تھے
گزروں کے فاصلے پہ دشمنوں کا لشکر تھا

آپنچی۔ مگر اس پر مجذوب نے معجزانہ انداز سے کتابیں تالاب سے نکال دیں اور فلسفی کے حوالے کر دیں۔ اس پر فلسفی سرا سیمہ اور مبہوت ہو کر رہ گیا کہ کتابیں تالاب سے خشک حالت میں نکلیں۔ فلسفی نے نہایت عجز و انکسار سے استفسار کیا۔ ”ایں چہ علم است؟“۔ جواب ملا۔ ”ایں علم است کہ تُو نے دانی“۔ فلسفی کی دنیا بدل گئی اور بصد عجز و نیاز مجذوب کی حضوری میں سر تسلیم خم کیا۔ یہ مجذوب شمس تبریزی تھے جس نے مولانا روم کو یوں نغمہ سرا ہونے کا حساس ایک ہی لمحے میں دے دیا۔

ہے چشم بند و لب بند و گوش بند

گر نہ بینی نورِ حق بر من بہ خند

خالد بشیر ماشاء اللہ ابھی جواں سال ہیں اور ابھی انہیں بہت سی منازل طے کرنی ہیں۔ ممکن ہے کہ ہاؤ ہو سے اللہ ہو تک اُن کی رسائی ہو جائے۔

صدائے نیم شب میں عشوہ و غمزہ واداء، جبیں اور سنگِ درِ عارض و رخسار کا کل شب رنگ، گیسوئے عیزیں، ہجر و وصل، قلق و اضطراب، حسرت و حرماں کا تذکرہ عنقا و معدوم ہے۔

تکلم ہے ترایا شعلہ وادیِ ایمن ہے

تبسمِ ریز لب ہے یا کلی کھلتی ہے جنت کی

اُن کا یہ مصرعہ ملاحظہ فرمائیے۔

شاید مری دُعا کا اثر لے گیا کوئی

الحمد للہ دعا میں تاثیر تو ہے۔ آہ میں اثر تو ہے۔ خواہ غیر کے حصّہ میں آئی ہے۔ غالب کا مشہور شعر ہے

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے

ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

اُن پر نظیری کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے ’تا مستعد شدیم دُعا مستجاب شد‘ کہ جب ہم صاحبِ استعداد ہوئے تو ہماری دعا بارگاہِ الہی میں قبول ہوئی۔ وہ خود بھی اس کے معتقد و قائل ہیں کہ دُعا موثر نہیں ہوتی۔

انہیں کا شعر ہے

کوششِ ناکام ہی کا کیا گلہ
سب دعائیں بھی ہوئیں ہیں بے اثر
اُن کے متعدد اشعار اعلیٰ کیفیت کے حامل ہیں اور قطرہ میں قلم کا مقام رکھتے ہیں۔
میں بے ضمیر رہ کے بڑا معتبر رہا
میں نے پیسروں کا اثر ہی لیا نہ تھا
یہ شعر عہدِ حاضر کی بدلتی ہوئی اقدار کا مرقع ہے۔ یہ دور اہلِ نظر کا نہیں بلکہ کم سواد
اور دور ہیں و سچ رو لوگوں کا ہی تو ہے۔

غموں کی بارشوں میں دل بہت اُداس ہوا
اب اپنا چہرہ پروں میں چھپائے رہتا ہوں
اگر صاحبِ نظر سرِ فراز نہیں تو یقیناً وہ منقارِ زیرِ پر ہے۔
اُن کا ایک اور شعر سماعت فرمائیں
میرا قاتل ہے کہ ہے میرا میسا کہہ دے
یوں مرے پاس کئی روپ بدلتا کیوں ہے
آج کون دوست نما دشمن ہے۔ چہرے سے تو کچھ نمایاں نہیں ہوتا کہ وہ میسا ہے یا
قاتل۔

میں اپنے آپ سے بھاگا تو گم ہوا ایسے
کوئی تو نام تھا پیہم مری زباں پر تھا
آدمی کے شعور میں کیا ہے اور وہ غیر شعوری طور پر کون سی حرکات کا مُرتکب ہوتا ہے۔
عاشق ہزار قسمیں کھائے مگر قلب و ذہن سے محبوب کا نقش نہیں مٹتا۔ اگر اُس کے لب پر محبوب کا
نام ایک بار آجائے تو بار بار آتا ہے۔ اور وہ اس کا اعادہ کرنے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا
ہے۔

خالد صاحب کا یہ شعر بھی شنیدنی ہے:

دریا کے پانیوں پہ کوئی نقش چھوڑ دیں
 اس شوق میں بھی ایک زمانہ گزر گیا
 ظاہر ہے کہ پانی میں نقش بنتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ اُن کا ایک جانفز اشعر ہے۔
 شعاع وصل سے اب مجھ کو کچھ تمازت دے
 اُداسیوں کے تختاں سے ہو کے آیا ہوں
 اور جب وہ اپنے آپ کو خود رنج و الم، یاس و حرماں کا پیکر محسوس کرتے ہیں تو ارشاد

ہوتا ہے

میں کہ اک کرب مسلسل کا گزیدہ ٹھہرا
 میں نے ہر سمت اُداسی کا سمندر دیکھا
 ایک اور ہم معنی شعر بھی اسی نوعیت کا ہے۔

میرے لیے ہے کرب نشیب و فراز کا
 ہموار راستوں کی تھکن بھی میرے لئے۔
 کسے پکاریے اب دشتِ نا اُمیدی میں
 یہاں تو دور تک سایہ نظر نہیں آتا

جب حسرتوں کا اژدھام ہو تو آرزوئیں خود بہ خود دم بہ خود ہو جاتی ہیں اور دل میں
 جگہ بھی پاسکتیں ہیں

دشتِ نا اُمیدی کی ترکیب نے شعر کی عظمت کو دو بالا کر دیا ہے۔ دشتِ نا اُمیدی کی
 وسعت بے پایاں ہے کہ

جنت نہ شود چارۂ افسردگی ما
 تعمیر بہ اندازہ ویرانی مانیت
 یہ افسردگی اور یہ پٹر مردگی اور یہ دشتِ نا اُمیدی۔ استغفر اللہ
 اس زمین میں ایک اور شعر ہے

صدا سنائی دی، چہرہ نظر نہیں آتا
 وہ شخص خوبیوں والا نظر نہیں آتا

Oh Physics save me from مشہور سائنس دان نیوٹن نے کہا تھا
 metaphysics وہ سائنس دان تو دامن بچا کر نکل گیا مگر میٹافزیشن
 اور mystic اس رازِ سر بستہ کی گرہ کشائی میں محو مہمک ہو گیا۔

بڑا نا فہم نکلا عمر کھودی خُم نشینی میں
 فلاطون مدعائے گُن فکاں سمجھا تو کیا سمجھا
 افلاطون نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ریاست میں مجذوب ہونے کا ثبوت بھی دیا ہے۔ اُس کی
 تھیوری آف آئیڈواںز پر دلالت کرتی ہے کہ شاعر میں اگر نادر صلاحیت ہو تو وہ فلسفی اور مجذوب
 کا پیکر بھی ہے۔

راز جو سینہ فطرت پہ عیاں ہوتا ہے
 سب سے پہلے دل شاعر میں نہاں ہوتا ہے
 مشہور رومانوی شاعر نئے شعر کے بارے میں یوں رقمطراز ہے

And if there come into them tender emotions than do
 the poets always think that nature herself is in love with
 them"

اور پھر اعادہ کرتا ہے کہ

"As there are so many things between heaven and
 earth of which only the poets have dreamed"

مرزا داغ دہلوی کا مطلع ہے

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
 مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں
 ممکن ہے اس میں مبالغہ آرائی ہو مگر تخیل کی رسائی اور پرواز ہر حد سے نکل جاتی ہے۔
 خواجہ حافظ شیرازی کا مصرعہ ہے

ثبوت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

خالد بشیر فرماتے ہیں۔

لوحِ دُنیا پر کوئی تحریر ایسی چھوڑیے
اہلِ دُنیا کے لیے پھر جادواں ہو جائیے
شیخِ سعدی کا معروف شعر ہے

ہر کسِ زِدستِ غیرے ناکند
سعدی از دستِ خویشتن فریاد

بشیر صاحب کا ایک اور شعر ہے

زندگی کے ظلم سے اب سرگراں ہو جائیے
کچھ تو اپنے آپ پر بھی مہرباں ہو جائیے

جو لوگ زیادہ حساس ہوتے ہیں اُن پر زندگی دشوار ہو جاتی ہے اور اُن کا جینا حرام ہو جاتا ہے۔ اُنہیں اپنے حال پر بھی رحم آتا ہے۔ عاشقِ صادق ماہی بے آب کی طرح تڑپتا ہے اور مرغِ بسمل کی طرح لوٹتا ہے مگر منتِ عیسیٰ نہیں کرتا۔

بشیر صاحب فرماتے ہیں

مجھ سے نہ مسیحائی کا احسان اُٹھے گا

جلتا ہوا پیکر ہوں، ہوا مانگ رہا ہوں

عہدِ حاضر کا رنگ بدل رہا ہے، ذہن بدل رہے ہیں۔ آسمان بدل رہا ہے۔ غرض کہ ہر چیز تنہا پذیر ہے مگر وہ فرماتے ہیں

میرا تو کچھ نہیں ہے میں ویسے بھی کون ہوں

اس عہدِ آگہی کے پیمبر بدل گئے

یہ حالت کس قدر ناگفتہ ہے۔ اگر امیرِ کارواں بدل جائے تو اہلِ کارواں خود بخود بدل جائیں گے یہ بدلنا انسانی پستی اور انحطاط کی دلالت ہے اُن کا ایک اور شعر ہے

اپنے کیے پہ دل بھی پشیمان ہے مگر

سیلاب تھا کہ مجھ کو بہا کر اُتر گیا

انسان سے اکثر ایسے نازیبا و ناشائستہ افعال سرزد ہو جاتے ہیں کہ اُسے نادم و پشیمان ہونا پڑتا ہے یہ ایک حقیقت ہے اور نفسیاتی طور پر ہم اس حقیقت سے منکر نہیں ہو سکتے کہ انسان میں غیر شعوری طور پر بہیمیت کام کر رہی ہے اور یہ اُسے اعلیٰ علیین سے اسفل السافلین کے قعر مذلت میں گر ادیتی ہے۔ یہ اُنکی وسعت نظر ہے کہ انہوں نے اس کا اعتراف کشادہ دل سے کیا ہے یہاں انہیں مرحبا اور صدا فریں کہنے کو جی چاہتا ہے۔

دل آرزوں کا مدفن ہے اور آرزو بے تابی اور بے قراری کا دوسرا نام ہے۔ برقی مضطر اور سیماب باہم دگر آمیختہ ہو کر دل کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اگر اجزائے ترکیبی یہ ہوں تو پھر درونِ خانہ ہنگامہ آرائی و فتنہ برپائی کیوں نہ ہو اُن کا ایک شعر اور

ہے بظاہر سکوت چہرے پر

ایک طوفاں درونِ خانہ ہے

آرزوں نے انسان کو آتش زیرِ پا کر رکھا ہے

اسیرِ رنگ و بو ہم کو بنا کر صحنِ گلشن میں

ہمارے بال و پر سے کھیلتا ہے باغباںِ اب تک

غزل گوئی، ہفت خواں طے کرنے کے مترادف ہے۔ اگر چشم بے نور ہو، گوہر بے

آب ہو۔ نمک میں ملاحظت نہ ہو اور شہد شیریں نہ ہو تو یہ غزل کا ادنیٰ سے ادنیٰ معیارِ فصاحت

و بلاغت کا مرقع ہے۔ یہ جنابِ بشیر کا پہلا مجموعہ کلام ہے اور ہم قویٰ اُمید رکھتے ہیں کہ ہلالِ

فلک آہستہ آہستہ ماہِ مُنیر بنتا ہے۔ یہ فطرت کا اصول ہے اور انسان کے لیے بھی اس کی تقلید شرط

ہے۔ یہ ترقی کا زینہ ہے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ز شرِ ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے

اُردو شاعری میں نئی آواز

ہمایوں اقبال

اس (بیسویں) صدی کی چھٹی دہائی کے اس طرف شاعری میں نوجوان نسل نے طبع آزمائی کی ہے۔ اس کی ایک واضح خصوصیت روایات سے انحراف اور نظریاتی جکڑ بندیلوں سے آزاد ہو کر داخلی اور خارجی ردِ عمل کا اظہار کرنا ہے۔ اپنے معاصر شعراء کی طرح جموں و کشمیر کے نوجوان شعرا بھی اپنے ماحول اور اس میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ موجودہ دور کے انسان کے 'المیے' تجربات، سائنس کی تباہ کاریاں وغیرہ براہِ راست شعر میں در آئیں۔ مختصر اُس دور میں شعری رویوں میں جو بنیادی تبدیلیاں آگئیں جموں و کشمیر کے نئے شعراء اُن سے دامن نہیں بچا سکے۔ یہاں کے باصلاحیت شعراء کے تئیں اب تک جو بے اعتنائی برتی گئی ہے اس کا شکوہ بجا ہے۔

کشمیر کی نئی نسل کے لکھنے والوں میں ایک تازہ نام خالد بشیر کا ہے۔ ان کا ادبی شعری مجموعہ صدائے نیم شب ایک خوشبودار لطیف جھونکے کی طرح حال ہی میں ہمارے سامنے آیا ہے جس میں بقول اُن کے صرف اڑھائی برس کی شاعری شامل ہے۔ اس مجموعہ قبل خالد بشیر کی شعری تخلیقات ملک کے کسی ادبی جریدے میں نظر نہیں آئی ہیں۔ چنانچہ اُن مجموعہ کلام نے ہمیں ایک طرح سے چونکا دیا ہے۔

کم عمری میں انہوں نے جو شعری سفر کیا ہے، اس سے ان کے روشن مستقبل نشاندہی ہوتی ہے۔ سب سے پہلی خصوصیت جو ان کے کلام میں نظر آتی ہے، وہ خیالات تازگی اور شکستگی ہے۔ خالد بشیر نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے عام لب و لہجہ۔

ہٹ کر ایسا لب و لہجہ اختیار کیا ہے جن سے اُن کے اشعار نے نئے معنی پیدا کیے ہیں۔ اردو شاعری میں جدید رجحانات کے پس منظر میں یہ کہنا مشکل نہیں کہ 'صدائے نیم شب' جدید اردو شاعری کا ایک نمائندہ مجموعہ ہے۔

خالد بشیر کے یہاں نہ صرف جدید رجحانات ہیں بلکہ کہیں کہیں شاعری کی مروجہ ساخت سے انحراف کی جرات بھی موجود ہے۔ ان کی شاعری کرب ذات، تنہائی اور غیر یقینی کے سوتوں سے پھوٹ کر ایک ہموار اور خاموش جوئے آب کی طرح بہتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں

دل وہ بنجر کہ کوئی چاہ نہیں اُگتی ہے
ایسی ویران زمینوں سے گزرتا کیوں ہے

جس طرف جانے میں آسیب کا ڈر رہتا ہے
ایک سونی سی حویلی کا وہ در ہوں میں بھی

تنہا پیڑ ہوں چوراہے کا
بچوں کی زد میں آیا ہوں

دریا کے پانیوں پہ کوئی نقش چھوڑ دیں
اس شوق میں بھی ایک زمانہ گزر گیا

خوشبو تھی یا ہوا تھی میرے دل کے آس پاس
کیا تھا کہ جس کا نام بھی سوچا گیا نہ تھا

رات بھر رہتا ہے پھر ضبط کی لہروں میں تناؤ
میری تنہائی کے ساحل پہ اترتا کیوں ہے

تم جس پر کھڑکی کھولو گے
وہ آواز کا دھوکا ہوگا

’صدائے نیم شب‘ ضخامت کے لحاظ سے ایک مختصر مجموعہء کلام ہے لیکن اس میں
ایسے اشعار کی کمی نہیں جنہیں حوالوں کے طور پر پیش کیا جاسکے۔ خالد بشیر بصری پیکر تراشی میں
اپنا جواب نہیں رکھتے، یہ اشعار دیکھیے:

وہی سماں ہے، وہی پیڑ ہے، وہی موسم
گئے برس کا پرندہ نظر نہیں آتا

دُور تک پت جھڑ کا موسم دیکھ کر دل رو دیا
میں نے یادوں کے دریچوں کو ابھی کھولا ہی تھا

جھنڈ کے جھنڈ اُداسی کے پرندے اُترے
دل کسی ٹھہری ہوئی جھیل کا منظر سا ہے

ایسا ہوا کہ راستے سر سبز ہو گئے
اک پیڑ برگ برگ کھڑا سوکھتا رہا

گھر کی دیواریں سبھی اندر سے ہو گئی منہدم
اور دروازے پہ تالا جھولتا رہ جائے گا۔

تہائی اور اندرونی کرب کا شدید احساس خالد بشیر کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔ اس
احساس نے اُن سے اگر ایک طرف گہرے مشاہدات اور سچے تجربات کے آئینہ دار اشعار
کھلوائے وہیں انہیں طنز کی ایک لطیف اور چبھتی ہوئی ادا بھی عطا کی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ
ہوں:

کوئی لفظ کہنے کی فرصت نہیں
زبانوں کے ذمے بڑا کام تھا

پُر امن شہریوں کا مقرر ہوا امیر
کل سب کے پیش پیش جو بلوایوں میں تھا

میرا تو کچھ نہیں ہے میں ویسے بھی کون ہوں
اس عہد آگہی کے پیہر بدل گئے

وہ مطمئن کہ اس کا سفر ختم ہو گیا
لوگوں کو وہم کوئی کرامات ہی نہ ہو

اسی پر یہ سب مشتعل ہو گئے
بس اک راہ پہ چلتی فقرہ گسا

خالد بشیر جوں و کشمیر کے ہی نہیں، بلکہ ملک کی نئی نسل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ 'صدائے نیم شب' اُن کی لگن کی واضح تصویر ہے۔ اُن کے اشعار اس بات کے غماز ہیں کہ اُنہوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کو نکھارنے کے لیے کافی محنت کی ہے۔ 'صدائے نیم شب' میں بلا عنوان نظمیں بھی شامل ہیں لیکن خالد بشیر کا مزاج بنیادی طور پر غزل کے لیے موزوں ہے۔ ایک مختصر نظم دیکھئے

تم ایک پیڑ ہو
جو مرے اندر کی مٹی میں اُگ کر

اس قدر پھیل گیا ہے
کہ اس کی ٹہنیوں اور پتوں کے نیچے
میں کھو گیا ہوں

غزل کے میدان میں خالد بشیر کی صلاحیتیں خوب کھل کر سامنے آتی ہیں۔ وہ ابھی عمر کے تیسویں برس میں ہیں اور اُن کے پہلے ہی مجموعہٴ کلام کو سامنے رکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ آئندہ برسوں میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائیگا۔ آخر میں یہ چند اشعار اور دیکھیے:

میں بے ضمیر رہ کے بڑا معتبر رہا
میں نے پیسمروں کا اثر ہی لیا نہ تھا

یہ زلزلہ بھی تباہی مچا گیا کیسی
مکان کھڑا تو ہے کمرہ نظر نہیں آتا

تمام رات ستاروں سے گفتگو کی ہے
بڑے حسیں خیالوں میں دن کو سویا ہوں

عجیب لوگ تھے خوابوں کو بات کرتے تھے
گزروں کے فاصلے پر دشمنوں کا لشکر تھا

میرے لیے ہے کرب نشیب و فراز کا
ہموار راستوں کی تھکن بھی مرے لیے

دریا نے اپنی پیاس بجھائی کچھ اس طرح
بستی میں صرف میرا مکان زیرِ آب تھا

ایک مدت سے تری راہ تکی ہے میں نے
صبح کے بھولے چلو شام ہوئی گھر آؤ

’صدائے نیم شب‘ آفسیٹ پر چھاپی گئی ہے۔ کتابت و طباعت اچھی اور سرورق عمدہ ہے۔

حسی تجربوں کی باز آفرینی

رضوان احمد

خالد بشیر وادی کشمیر کے جواں سال شاعر ہیں۔ ’صدائے نیم شب‘ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ ۸۸ صفحات کی اس مختصر سی کتاب کے اوّلین پانچ صفحات اندرونی سرورق اور انتساب کی نذر ہوئے ہیں۔ بعد کے سات صفحات میں ڈاکٹر حامدی کا کشمیری کا مقدمہ ہے اور ایک صفحہ پر مصنف کا مختصر پیش لفظ۔ صفحہ ۱۵ تا ۸۸ صرف ۷۲ صفحات پر ۲۹ غزلیں ہیں جن میں ۲۶ پانچ اشعار کی ۱۵ چار اشعار کی اور آٹھ صرف تین شعروں کی ہیں۔ ان کے علاوہ گیارہ متفرق اشعار ہیں اور گیارہ آزاد و نثری نظمیں ہیں۔ غزل کے ۲۲۵ اشعار میں ایک بھی شعر مقطع کا نہیں ہے اور نظمیں سب کی سب بلا عنوان ہیں۔ جدید غزلوں میں مقطع ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے۔ توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ مقطع کے اشعار عموماً بھرتی کے ہوتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مقطع کے علاوہ بھی بھرتی کے اشعار خاصی تعداد میں موجود ہوتے ہیں اور ان کی موجودگی روا رکھی جاتی ہے۔ ٹھیک یہی سلوک نظموں کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ اس طرح بقول شخصے جدید شاعروں نے اردو شاعری کا ”ختنہ موٹنا“ دونوں کیا ہے۔ بہر کیف! یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔

آدم برسر مطلب!

فاضل مقدمہ نگار کو اس بات پر افسوس ہے کہ ”اردو کے مورخوں اور نقادوں نے کشمیر کے شعرا کا کہیں بھولے سے بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ موصوف نے اس ادبی سانچے کی کئی وجوہات بتائی ہیں جن میں اول تو یہ ہے کہ اردو میں کوئی جامع، معروضی اور تنقیدی تاریخ ابھی تک رقم

نہیں ہوئی ہے۔ دوم یہ کہ ”اردو میں صاحبِ نظر اور اہل الرائے نقادوں کا قحط ہے“ تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ اردو زبان پر جملہ حقوق بحق لکھنؤ اور دہلی محفوظ سمجھے جاتے ہیں اور آخری وجہ یہ ہے کہ ”نشر و اشاعت کے مؤثر وسائل کی عدم موجودگی بھی یہاں کے (کشمیر کے) قلم کاروں کے منظر عام پر آنے میں مانع رہی ہے“۔ یہاں ان جملوں پر تبصرہ مقصود نہیں۔ البتہ ان کا ذکر ضروری محسوس ہوا کہ یہ عہدِ جمہوریت کا عہد ہے اور جمہوریت میں ’رائے‘ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

خالد بشیر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے مقدمہ نگار نے لکھا ہے کہ ’کشمیر کے نئے لکھنے والوں میں خالد بشیر بھی پورے انہماک، لگن اور آگہی سے اپنی ذات کے حوالے سے نئی حیثیت کی پیکر تراشی کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں حسی تجربوں کی باز آفرینی کا جو تجسس اور اشتیاق ملتا ہے وہ ان کے روشن مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ مقدمہ نگار کے اس قول میں سچائی ہے۔ خالد بشیر ابھی عمر کی تیسویں منزل میں ہیں۔ اس کم عمری کے باوجود ان کے اکثر اشعار اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ انہوں نے فن پر محنت کی ہے۔ اپنی قوتِ فکر اور صلاحیتِ اظہار کو نکھارا اور سنوارا ہے۔ ان کے یہ اشعار ان کی صلاحیتوں کے غماز ہیں۔

تو مرا خوف، تری ذات کا ڈر ہوں میں بھی
تیرے آگن میں کھڑا ایک شجر ہوں میں بھی

جس طرف جانے میں آسیب کا ڈر رہتا ہے
ایک سونی سی حویلی کا وہ در ہوں میں بھی

تنہا پیڑ ہوں چوراہے کا
بچوں کی زد میں آیا ہو

تمام رات ستاروں سے گفتگو کی ہے
بڑے حسین خیالوں میں دن کو سویا ہوں

دل وہ بنجر کہ کوئی چاہ نہیں اُگتی ہے
ایسی ویران زمینوں سے گزرتا کیوں ہے

دُور تک پت جھڑ کا موسم دیکھکر دل رو دیا
میں نے یادوں کے دریچوں کو ابھی کھولا ہی تھا

تنہائیوں میں کیسے حسین رنگ بھر گیا
اور پھر ہوا کے دوش پر جانے کدھر گیا

دریا کے پانیوں پہ کوئی نقش چھوڑ دیں
اس شوق میں بھی ایک زمانہ گزر گیا

کوئی پتھر بھی نہیں، کوئی شگوفہ بھی نہیں
ایسا معمول سے باہر کبھی سوچا بھی نہیں
اس مختصر سے مجموعے کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جنہیں انتخاب میں شامل کیا جاسکتا
ہے۔ خالد بشیر ”پستش بہ غایت پست و بلندش بہ غایت بلند“ کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کی اکثر
غزلیں ہموار ہیں۔ مثال کے طور پر یہ غزل دیکھیے

یہ کیا کہ موسموں کا چلن بھی مرے لیے
ماتھے پہ دوستی کے شکن بھی مرے لیے

تنہائیوں کی ٹنڈ ہوائیں بھی مرے نام
بے خواب کروٹوں کی جلن بھی مرے لیے

میرے لیے ہے کرب نشیب و فراز کا
ہموار راستوں کی تھکن بھی مرے لیے

سر سبز ہو رہی ہیں اُجالوں کی خواہشیں
اس پر یہ دوپہر کا گہن بھی مرے لیے

دن کے لیے لکھا ہے نگاہوں کو انتخاب
راتوں کو انتشارِ بدن بھی مرے لیے
ایک دوسری غزل کے یہ تین اشعار بھی متوجہ کرتے ہیں
صبح کا سورج یہاں تنہائیاں پھیلانے گا
رات کی تاریکیوں میں شہر ہی مٹ جائے گا

پانیوں پر فوج کا پہرہ کھڑا ہو جائے گا
ایک قطرے کے لیے ہر شخص کو ترسائے گا

گھر کی دیواریں سبھی اندر سے ہونگی منہدم
اور دروازے پہ تالا جھولتا رہ جائیگا

جدید رجحانات کی کامیاب کڑی

مصطفیٰ اکبر

’صدائے نیم شب‘ شاعر کا پہلا مجموعہ کلام ہے جو ۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ مجموعہ میں ڈاکٹر حامدی کا شیریں کا لکھا مقدمہ بھی شامل ہے جس میں کشمیر کے اردو شعراء کی گمنامی کے اسباب کا ذکر بھی ہے اور شاعر کے کلام کے محاسن کا جائزہ بھی۔

خالد بشیر کشمیر کے جواں سال شاعر ہیں۔ بالخصوص غزلیں اچھی کہتے ہیں۔ نظمیں تلکی اور شعری اعتبار سے کمزور ہیں۔ ان کی غزلوں میں جدتِ فکر اور غزل کے روایتی اسلوب سے شعوری انحراف قابلِ ذکر ہیں۔ روایتی اسلوب سے انحراف اور جدت طرازی کے شوق میں شاعر کی ایک مقام پر آوارگی کیف کے شکار نظر آتے ہیں اور ایسی سعیِ عمل سے شاعر نے جہاں کہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر گریز کیا ہے، شاعری اپنے کمالِ فن کے ساتھ نمودار ہوئی ہے:

وہ ریٹکتا رہا ہے زمینوں پہ رات بھر
سُورج اُگا تو اُس کا بدن پُور پُور تھا

تہائیوں کی شند ہو انہیں بھی میرے نام
بے خواب کروٹوں کی جلن بھی مرے لیے

جھنڈ کے جھنڈ اداسی کے پرندے اترے
دل کسی ٹھہری ہوئی جھیل کا منظر سا ہے

کوئی شب بھر سرہانے جاگتا ہے
مرے اندر سمندر سورہا ہے
خالد بشیر کے کلام میں غزل اور اردو شاعری کی روایتی قدروں کا احترام بھی جا بجا ملتا
ہے۔ جدید و قدیم کے امتزاج سے انہوں نے غزل کو ایک رنگ و آہنگ دینے کی کوشش کی ہے:

ایک مدت سے تری راہ تکی ہے میں نے
صبح کے بھولے چلو شام ہوئی گھر آؤ

یا میری بد قسمتی کا ذکر رہنے دیجیے
یا حریفوں کے مقابل ہم زباں ہو جائیے

معیارِ اہلِ جفا بھی بدل گیا ہے کیا
کہ اب کے وہ بھی ہمیں مہرباں سا لگتا ہے

بہت دنوں سے جسے دیکھنے کی خواہش تھی
وہ آفتاب جو نکلا تو سورہا تھا میں

خالد بشیر عصری حسیت سے بھی پوری طرح متصف ہیں۔ وہ اپنے دور کی سماجی و
سیاسی زندگی کے ایک ایک پہلو پر نظر رکھتے ہیں۔ نئی حسیت کی پیکر تراشی میں وہ جو کچھ کہتے ہیں
وہ ہمارے دور کا المیہ نظر آتا ہے:

وہ فن شناس جسکی زمانے میں دھوم تھی
اچھا ہوا کہ وقت سے پہلے ہی مر گیا

یا میں تمہارے شہر سے واقف نہیں ابھی
یا یہ ہوا کہ لوگ سراسر بدل گئے

بستی بستی دھول اڑے گی
دیکھنے والا اندھا ہوگا

لنگڑا کتا سوچ رہا ہے
سارا گاؤں کدھر گیا ہے

مجموعی اعتبار سے خالد بشیر کا مجموعہ جدید رجحانات کی ایک کامیاب کڑی ہے۔ اُنکی عمر اور ان کی شاعری کو دیکھتے ہوئے ان سے بہت کچھ امیدیں رکھی جاسکتی ہیں۔ 'صدائے نیم شب' ان قارئین کیلئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا جو صحت مند اور غیر روایتی شاعری کو پسند کرتے ہیں۔

جدید تر غزل کی توانا آواز

محمد ابوصالح

۱۹۶۰ء کے بعد جو شعری روایت قائم ہوئی اُسے جدیدیت کی ادبی تحریکوں کا نام دیا گیا۔ جو اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود اپنی بساط مضبوط نہیں کر سکی اور موجودہ شعری مزاج میں جدیدیت سے برگشتگی اور غیر اطمینانی کا احساس عام ہو چلا ہے۔ جدیدیت کی بھیڑ بھاڑ، شور، ہنگامے موجودہ صدی کی ساتویں دہائی میں ذرا کم ہوئے تو ناصر کاظمی، ابن انشاء، خلیل الرحمن اعظمی کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے شہر یار، باقر مہدی، محمد علوی، بابی، ندا فاضلی، وحید اختر وغیرہ کی آوازیں بڑی صاف صاف سنائی دے رہی تھیں اور بساط غزل میں ایک استحکام پیدا ہو چکا تھا جو سالہا سال تک جاری و ساری ہے۔

خالد بشیر کی آواز جدید تر غزل کی تندرست اور توانا آواز ہے۔ غزل کے منظر نامے پر ابھرنے والی یہ آواز تقلید سے زیادہ اجتہاد کی طرف مائل ہے۔ 'صدائے نیم شب' کے ہر صفحہ پر حسی تجربات کی ایسی انوکھی اور اچھوتی مثالیں موجود ہیں جو خالد بشیر کے انفرادی رنگ و آہنگ کی غمازی کرتی ہے۔

'صدائے نیم شب' کی اشاعت جدید شعری تصانیف میں ایک باوقار اضافہ ہے جو جدید غزل کے ایک واضح مستقبل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یوں تو خالد بشیر کی انفرادیت اور تخلیقی صلاحیت کی جلوہ سامانیاں غزل اور نظموں دونوں سطحوں پر اپنی بہار دکھلاتی ہیں تاہم غزل میں اس کا اظہار کامیابی کے ساتھ ہوا ہے۔ ان کی غزلوں کو پڑھ کر تازگی اور نئے پن کا احساس

ہوتا ہے۔ ان غزلوں کا مزاج بڑی حد تک جدیدیت کے شعری مزاج سے ہم آہنگ ہے لیکن جہاں تک ممکن ہو سکا ہے جدیدیت کے مثبت اور صالح اقدار کو ہی اپنایا گیا ہے اور اس طرح وہ جدیدیت کے لیبل سے دامن بچانے میں کامیاب بھی نظر آئے ہیں۔

خالد بشیر کے حسی تجربات ایک متحرک پیکر کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ جذبات کا خلوص ہمیں شاعر کے ساتھ تخلیقی ہم احساسی کی سرحد پر لا کھڑا کرتا ہے۔ جدید شعری مزاج انفرادیت کی طرف مائل ہے۔ عصری آگہی کا اظہار بھی اپنی ذات کے حوالے سے ہوتا ہے۔ خالد بشیر گہری بصیرت اور بیدار آنکھوں سے کائنات کی آگہی کو عرفان ذات کے حوالے سے پیش کرتے ہیں اور فرد کے حوالے سے کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ زبان و بیان کی سطح پر ان کے یہاں جدید تکنیکی رویوں کا رچا اور سُلجھا ہوا شعور ملتا ہے۔ ڈکشن، تشبیہیں اور علامتیں مروجہ روایت کے مطابق ہیں۔ مثلاً 'صحرا'، 'سمندر'، 'گھر'، 'دیوار'، 'شام'، 'رات'، 'فصل'، 'شب'، 'دھوپ'، 'سورج'، 'بارش'، 'برف'، 'تہقہہ'، 'تلاش'، 'ذات'، 'بے چہرگی' وغیرہ نامانوس علامتوں اور شعری پیکروں سے احتراز کی کوشش بھی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں جمالیاتی قدروں کی فراوانی ہے۔ ابہام کا حسن اور خود پسندی کا رجحان نمایاں ہے۔

خالد بشیر کے شعری مزاج کے عناصر ترکیبی میں وجودی عناصر کی کارفرمائیاں بھرپور طریقے سے آجا کر ہوئی ہیں۔ تلاش ذات کی یافت و نایافت، شکست و ہنریمت، کربنا کی، تشنگی، تنہائی اور بے چہرگی کے ساتھ فرد کا، دوسرے لفظوں میں انسانیت کا، احترام بھی ملتا ہے جو ماحول کی ناسازگاری سے مصلحت پسندانہ رویوں کا اظہار ہے۔ مزاج اور ماحول میں شعوری مناسبت اور آہنگی کی کاوش بھی نظر آتی ہے۔ سوچ کی گہرائی، فکر و احساس کی گرمی کے باوجود انداز کا دھیمپن، انہیں حالات کی نامساعدت پر چیخنے چلانے کے بجائے سرگوشی اور خود کلامی کا سانداز اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے لیکن ان سرگوشیوں اور خود کلامی میں گہرے طنز کا نثر بھی ملتا ہے۔

بحیثیت مجموعی صدائے نیم شب ایک کامیاب شعری مجموعہ ہے۔

نئی آواز، نئے امکانات

جاوید آذر

ریاست جموں و کشمیر میں بالعموم اور وادی کشمیر میں بالخصوص اردو شاعری کی پرازا امکانات فضا ہمیشہ تو نہ سہی لیکن اکثر اوقات ابر آلود رہی ہے۔ ان بادلوں سے نیساں کے قطرے بھی برستے تھے لیکن بیشتر بوندیں قید صدف میں عمل ارتقاء سے گزرنے کے بجائے بلبلہ آرا ہو کر فنا کی گھاٹیوں میں جذب ہو جاتیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ صورت حال اُس وقت زیادہ شدید ہو گئی جب ادیبوں، اور دانشوروں، کے مخصوص حلقے نے کشمیری ثقافت و زبان کے احیاء کی آڑ میں سُرخ گرد و غبار کی آندھیاں پیدا کیں اور وادی کے بیشتر ادیب و شاعر اپنی مادری زبان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مادری زبان اور علاقائی ثقافت کی طرف مراجعت کے اس رجحان میں حقیقتاً خلوص اور نیک نیتی کی بولمونی کم اور اشتراکی فلسفے کی سُرخیاں زیادہ تھیں۔ یہ کیومفلاژ (camouflage) زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا اور سُرخ گرد و غبار کی آندھیاں دم توڑ بیٹھیں۔ مطلع صاف ہوا تو ایک نئی تازگی، بنشاشت اور طمانیت کے ساتھ ساتھ سنجیدہ روی اور احساس ذمہ داری بھی پیدا ہو گیا۔

پندرہ بیس سال تک ریاست میں تہذیبی احیاء کی جو تحریک چلی، اقتضائے فطرت کے مطابق اس کے مثبت نکتے تو لوگوں نے اپنائے لیکن منفی پہلوؤں کی تردید میں زیادہ سرگرمیاں دیکھنے میں آئیں۔ چنانچہ اس سیاسی ادب نے دانشوروں اور ادیبوں کی سطح پر اردو زبان کے خلاف جس لسانی عصبیت کو جنم دیا تھا اُس کے اثرات رفتہ رفتہ زائل ہونے شروع ہو گئے۔ بالآخر زبانوں کے رد و قبول، اختیار و استعمال اور اہمیت و افادیت کے متعلق متوازن اور

عقلی نظریات کا مطلع طلوع ہوا جس کے نتیجے میں متعدد کشمیری ادیبوں نے اپنی مادری زبان کے ساتھ ساتھ ثانوی تہذیبی زبان اردو کو بھی فراخ دلی کے ساتھ قبول اور اختیار کیا۔ ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیان اُردو شعر و ادب نے وادی میں ایک نئی فضا کو استوار کرنا شروع کر دیا جو رفتہ رفتہ اب ایک روایت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اگر بیرون وادی کے اُردو دان حلقوں کی تنگ نظری اور ریاستی سرکار کی عدم توجہی کی وجہ سے اسی روایت کو سند کا درجہ حاصل نہ ہو سکا مگر احساس ذمہ داری سے شاعروں اور ادیبوں کے قافلے نے اس سبزے کی آبیاری میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ یہ کارواں اب نسلوں کے فنی، حیاتی اور فکری تجارب کی مشعل اٹھائے ظلمتوں کو برابر چیر رہا ہے۔

’صدائے نیم شب‘ اسی قافلے کے جس کی ایک نوائے شیریں ہے جس کے ذریعہ خالد بشیر احمد نے فضا میں ایک خوش آئند ارتعاش پیدا کیا ہے۔ نئی نسل کا یہ قافلہ بلاشبہ باہمی اثرات بھی قبول کر لیتا ہے لیکن جذب و قبول کی اس سچ میں غالبیت اور مغلوبیت کا کوئی خدشہ خفیف بھی نہیں ہے کیونکہ ایک دوسرے کی شاعری کے اثرات قبول کرتے ہوئے بھی ہر شاعر شخصی طور اپنے لہجے کی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

’صدائے نیم شب‘ وادی کے جواں سال شاعر خالد بشیر کا اولین شعری مجموعہ ہے جو ہزاروں شعری مجموعوں کی فہرست میں ایک معمولی اضافہ ہے لیکن مواد اور معقولیت کے لحاظ سے اس مجموعہ شعری کو مذکورہ فہرست میں ایک اضافہ محض قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ جدید معیاری شاعری کا نمائندہ ہے۔ ڈاکٹر حامدی کشمیری مجموعہ کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں، ”کشمیر کے نئے شعراء میں خالد بشیر بھی پورے انہماک، لگن اور آگہی سے اپنی ذات کے حوالے سے نئی حیثیت کی پیکر تراشی کر رہے ہیں۔ وہ ابھی چند برسوں سے لکھ رہے ہیں لیکن اُن کے یہاں شروع سے لفظوں کے دشت و سراب میں بھٹکنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے حسی تجربوں کی باز آفرینی کا تجسس اور اشتیاق ملتا ہے۔“ حامدی صاحب کا یہ اقتباس خالد بشیر کی شاعری کے غالب عنصر کی بنیادی وضاحت کے برابر ہے کیونکہ ’صدائے نیم شب‘ میں شامل غزلیات اور نظموں کے مطالعہ سے قاری پہلی فرصت میں اسی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ خالد بشیر کے حسی تجربات کا خمیر عصر حاضر کی اُس پیچیدگی، کرب و انتشار اور یاسیت سے اٹھتا ہے جو اس وقت ایک آفاقی مسئلے کی حیثیت

اختیار کر گیا ہے۔ اُن کی نغمگی، تنہائی، نظریات کے تصادم بہ شکست و ریخت اور کربِ خود شنائی کے سوتوں سے پھوٹی ہے۔ مضطرب صدائیں، تصوّرات کا سورج، چوراہے کا تنہا پیڑ، دشتِ اُمیدی، ٹھہری جھیل، اُداس پرندے، فٹ پاتھ، خوابِ جزیرے، سُونی حویلی، زرد رُت، ضبط کی لہریں، شہرِ خیالات، آسیبِ زدگی، بارش کے چھینٹے، شعاعِ وصل، سختیاں (یہ ترکیب غالباً پہلا بار استعمال ہوئی ہے)، لنگڑا گٹھا، دروازے پہ جھولتا تالا، انتشارِ بدن، پرندوں کے غول، بخاری سے اُٹھنے والا دُھواں جیسی ترکیبیں محض کھوکھلی لفاظی نہیں ہیں بلکہ یہ وہ حسی پیکر ہیں جو چھوٹے چھوٹے تجربات کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ نئی غزل میں پیکر تراشی کو جو اہمیت حاصل ہے، خالد بشیر نے اُس کا مناسب شعور حاصل کر کے اپنی شاعری کو اس سے متصف کر لیا ہے۔ وہ پیکرِ دل اور استعاروں کو generalise کر کے نہیں دیکھتے بلکہ مختلف صورتوں میں متنوع انداز کے ساتھ استعمال کرتے ہیں حالانکہ کہیں پر تکرار کا مظاہرہ بھی ہوا ہے لیکن استثناء کے ساتھ۔

یہ زلزلہ بھی تباہی مچا گیا کیسی
مکاں کھڑا تو ہے، کمرہ نظر نہیں آتا

گھر کی دیواریں سبھی اندر سے ہونگی منہدم
اور دروازے پہ تالا جھولتا رہ جائے گا

داخلی کرب و انتشار اور شکستِ ذات کے یہ پیکر بظاہر یکساں نظر آتے ہیں۔ دوسرے شعر میں ”جھولتا تالا“ کے استعمال نے اظہار کو ندرت اور تازگی عطا کی ہے۔ متذکر فہرستِ ترکیبات میں ایک اور بات واضح طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ کہ اضافت کا استعمال اگرچہ کچھ عصری ناقدین پسند نہیں کرتے لیکن اُردو شاعری کے کلاسیکی سرمایے پر نظر ڈالی جائے تو ہر عنصر غلبے کے ساتھ نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ غالب کی شاعری میں اضافتوں کا استعمال اس شدت سے در آیا ہے کہ انہیں اپنے اچھے خاصے کلام کو غیر متداول قرار دینا پڑا۔ لیکن وہ تو اضافت کے کثرتِ استعمال کا نتیجہ تھا مگر میانہ روی سے قوتِ اظہار میں حُسن اور بیان میں جامعیت پیدا ہوتی ہے۔ خالد بشیر نے اپنی شاعری میں زیرِ ظرف کا اچھا استعمال کیا ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی شاعری میں روانی پیدا ہوئی ہے بلکہ اظہار میں بھی تنوع پیدا ہوا ہے۔

’صدائے نیم شب‘ کی شاعری میں مروجہ اور متداول نظریات کے باہمی تصادم اور شکست و ریخت سے پیدا شدہ ذہنی انتشار اور اضطراب و بے چینی کا ہلکا ہلکا شکوہ بھی نظر آتا ہے:

ہرے بھرے کسی میداں کا مجھ سے وعدہ تھا
یہ کس جگہ پہ مجھے لانے والے چھوڑ گئے

بار ہا آنکھ نے منزل کے نشان دیکھ لیے
بار ہا سوچ کے مصروف سفر ہوں میں بھی

میں بھٹکتا ہوں خلاؤں میں دُعاؤں کی طرح
رات کو دستِ دُعا آج اٹھائے رکھنا

کوئی لفظ کہنے کی فرصت نہ تھی
زبانوں کے ذمے بڑا کام تھا

وہ جو پگھلا رہا ہے تو اک لفظ نہ بھیجا لکھکر
پچھلے موسم میں مجھے اُس نے بہت چاہا تھا

ہجومِ بے پایاں میں شناختِ ذات کا مسئلہ اس وقت تقریباً ہر فنکار کو درپیش ہے اور یہی احساسِ باہر سے اندر کی طرف فنکار کی مراجعت اور احساسِ تنہائی کی شدت کا سبب ہے۔ خالد بشر اس سے معرکی نہیں ہیں۔ وہ تنہائی، تھکاوٹ، فرار اور رہبانیت کی حدوں کو چھوتے چھوتے بچ نکلتے ہیں لیکن یہ عنصر معاشرتی عوامل کا ردِ عمل ہے۔ وہ شکایتِ کالب و لہجہ اختیار کر کے معاشرتی زندگی سے وابستگی کا بلا واسطہ اعلان کرتے ہیں

میرا تو کچھ نہیں ہے، میں ویسے بھی کون ہوں
اس عہدِ آگہی کے پیہر بدل گئے

تُو مرا خوف، تیری ذات کا ڈر ہوں میں بھی
تیرے آنگن میں کھڑا ایک شجر ہوں میں بھی

تہا پیڑ ہوں چوراہے کا
بچوں کی زد میں آیا ہوں

اگرچہ خالد بشیر موجودہ معاشرتی خدوخال سے ذہنی مطابقت نہیں رکھتے لیکن وہ کافی
کوششوں کے باوجود غیر دانستہ طور پر اس سے دامن نہیں بچا سکتے۔ قنوطی انداز فکر اس وقت فن کی
کامیابی تصور کیا جاتا ہے اور شاعری کا ایک آفاقی مزاج ہونے کی وجہ سے یہ معیار ہر زبان کے
لیے ٹھہر سکتا ہے لیکن اس کے باوجود ہماری معاشرتی قدریں اس سطح پر نہیں پہنچی ہیں جہاں مغربی
اقدار کی شروعات ہوتی ہے۔ اردو شاعری میں گزشتہ دس پندرہ برسوں میں ایسے شاعروں نے
درا اندازی کی جنہوں نے اپنے ذہنی وجدان کو مغرب کی تراشیدہ قنوطیت کے پردوں میں ملفوف
کر دیا جس کے نتیجے میں ایسی پریشاں خیالی اور الجھاؤ نے جنم لیا کہ عام تو عام اچھی خاصی سوچ
بوجھ رکھنے والا ادب نواز طبقہ بھی ادب سے دُور ہوتا گیا۔

دیگر زبانوں کے لسانی اور فنی رجحانات سے اخذ و اکتساب کا عمل تخلیقی امکانات کا
حامل ہوتا ہے مگر اس پر غیر طبعی نظریات کا ملمع چڑھا دیا جائے تو وہ یقیناً الجھنوں کا باعث بن جاتا
ہے۔ صدائے نیم شب کی شاعری سے واضح ہوتا ہے کہ خالد بشیر بھی اس سے متاثر ہیں تاہم اُن
کی نظر مثبت پہلوؤں پر زیادہ ہے

سمندروں کی تہوں میں موتی مچھے ہوئے تھے
مگر میں ساحل کی سمت آ کے تھکا ہوا تھا

جس طرف جانے میں آسیب کا ڈر رہتا ہے
ایک سونی سی حویلی کا وہ در ہوں میں بھی

خود اپنا ہمسایہ بن کر
میں اپنے اندر رہتا ہوں

تمام رُوح کے رشتے بھلائے بیٹھا ہوں
میں اپنی ذات کے پتھر کے نیچے آیا ہوں

حالانکہ خد و خال تراشے بہت صحیح
لیکن میں اپنے آپ کو چہرہ نہ دے سکا

خالد بشیر کی تنہائیاں بعض اوقات اس قدر بے رحم بن جاتی ہیں کہ خوف، دہشت اور بے یقینی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامائی عنصر سے اشعار میں ایک solidness پیدا ہو جاتی ہے۔ 'صدائے نیم شب' میں ایسے اشعار کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے جو مقبول شاعری کے زمرے میں آسکتی ہیں۔ ان اشعار سے خالد کے وہ فنی گوشے وا ہو جاتے ہیں جو روایتی شاعری کے عمومی رجحان کی پیروار ہیں

تیرے گاؤں میں اُسی یاد کی پگڈنڈی پر
اب بھی آہٹ سے کوئی شخص ٹھٹھک جاتا ہے

سب سے پہلے تو مجھے تُو نے ہی محسوس کیا
تیرے ہی خواب جزیرے کا بشر ہوں میں بھی

ٹوٹ کر دشمنی نبھائی ہے
اب محبت بھی والہانہ ہے

یہ تیرا نام ہتھیلی پہ اُگ گیا کیسے
کہ میں نے اس کے لیے اپنا نام سوچا تھا

سچے جذبات کی شاعری

ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزرده

زیر نظر شعری مجموعہ کشمیر کے ایک جوان سال شاعر خالد بشیر کا پہلا مجموعہ کلام ہے۔ اس میں غزلیں اور نظمیں شامل ہیں جو اُن کے گہرے مشاہدے اور سچے جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ صدائے نیم شب میں عصر حاضر کے انسان کی نامرادیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کے سایے لرزاں نظر آتے ہیں اور یہ سایے شاعر کی ذات کو بھی اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں۔

آج کی غزل کے افق پر جو نئے ستارے طلوع ہوئے ہیں اور فکر و بیان کی جو نئی قدیلیں روشن ہوئی ہیں اس نے تخیل اور تغزل کی جو سمتیں پیدا کر دی ہیں خالد بشیر کے کلام میں اُن کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ گو کہ لفظ و بیاں کے برتنے میں بعض جگہوں پر ایک طرح کی صدائے بازگشت کا احساس ہوتا ہے مگر بیشتر مقامات پر خالد بشیر اپنے لہجے کا شدید احساس دلاتے ہیں۔ اس مجموعہ کلام کے تخلیق کار میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو دنیا کے سخن میں اُن کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اُن کے آئینہ تفکر اور دائرہ تخیل کی واضح مثالیں ان اشعار میں ملاحظہ فرمائیں:

صحرائے زندگی میں کوئی نقشِ پانہ تھا
میرے سوا مجھے کوئی پہچانتا نہ تھا

میں بے ضمیر رہ کے بڑا معتبر رہا
میں نے پیسمروں کا اثر ہی لیا نہ تھا

کوئی لفظ کہنے کی فرصت نہ تھی
زبانوں کے ذمے بڑا کام تھا

حالانکہ خدوخال تراشے بہت صحیح
لیکن میں اپنے آپکو کو چہرہ نہ دے سکا

میں نے لکھا تھا درو بام پہ اپنا ہی نام
چھوٹی باتوں کو بھلا دینے کا میں عادی تھا

میرے بارے میں کوئی رائے نہ دو
میں نہ خود سے بھی گھلا ہوں اب تک

پُر امن شہریوں کا مقرر ہوا امیر
کل سب کے پیش پیش جو بلوائیوں میں تھا

میرا تو کچھ نہیں ہے میں ویسے بھی کون ہوں
اس عہدِ آگہی کے بیمبر بدل گئے

ہر چیز بانٹنے کی گھڑی آن پڑی ہے
میں اپنے لیے اپنا خدا مانگ رہا ہوں

ان اشعار کی روشنی میں آپ خالد بشیر کے مجموعہ کلام کا مطالعہ کرنا چاہیں تو آپ کو
اندازہ ہوگا کہ وہ موجودہ دور کی شہ رگ کو چھیڑ کر بار بار زندگی اور موت کا احساس دلاتے ہیں۔
اُن کے ہاتھ میں آئینہ ہے جو وہ اپنے دور کو دکھا کے اُس کو منہ چڑاتے ہیں۔ اس لہجے کی بنا پر

خالد بشیر کا یہ مجموعہ بہت مقبول ہوگا۔

کتابت اور طباعت بہت عمدہ۔ آج کل کے اس کساد بازاری کے دور میں اتنی عمدہ کتاب مصنف کے عالی ذوق کی دلیل ہے حالانکہ اس کتاب کی اشاعت کیلئے مصنف کو کسی ادارے سے مالی امداد ملی ہے اور نہ ہی یہ کتاب اشتہارات کے سہارے طبع ہوئی ہے بلکہ اس کے ہر حصے سے شاعر کی اپنی خاطر جمعی نکلتی ہے۔

خواب پارہ

حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اب میرے احباب کی طرح میں بھی خواب پارہ سے چند شعر آپ کو سناؤں گا:

خواب، حقیقت، پیکر جاں کا درد سراپا دونوں ہیں

ایک مسلسل جنگ کے درپے آب، جزیرہ دونوں ہیں

وہ آواز نہیں آسیتی دھوکا تھا

دھوپ کی جادوگرنی تھی، برفاب ہوئی

مناظر روح فرسا بستیوں کے

پرندے سب کے سب تھے ہجرتوں کے

دو شعر اور:

یاد کے سارے جزیرے بے نشان

اپنی کشتی کو کہاں لے جاؤں میں

کہہ دے ورنہ لب پر بول اٹک جائیں گے

بھاری برف میں گھر آنگن سب ڈھک جائیں گے

خواب پارہ... آشوب کا گہرا احساس

پروفیسر غلام رسول ملک

خالد بشیر احمد کی شخصیت ایک رنگارنگ شخصیت ہے۔ لیکن ان کی شخصیت کے رنگ آہستہ آہستہ ایک منظر مسلسل کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے رونما ہو رہے ہیں۔ اس سے پہلے کئی سال قبل ان کی کتاب *Through Jhelum-The River* My Backyard کے سلسلے میں ایک تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اُس وقت میں نے ان کا ایک رنگ دیکھا تھا۔ وہ کتاب بیک وقت تاریخ ہے، جغرافیہ ہے۔ ہماری mythogy ہے، ہماری legend ہے اور یہ سب اُس کتاب میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو گماں ہوتا ہے کہ وہ ایک بہت ہی دلچسپ اور suspense سے بھرپور فکشن پارے کا افسانوی ادب کا مطالعہ کر رہا ہے۔

آج جب خالد بشیر احمد کی یہ کتاب 'خواب پارہ' میں نے دیکھی ہے تو ایک دوسرا رنگ نظر آیا۔ اسی سلسلے میں بس ایک دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ شاعری ہے اور اردو میں لکھی گئی شاعری ہے۔ اب شاعری اور تنگ بندی میں بہت کم فرق رہ گیا ہے۔ یہ بد قسمتی ہے اور خالد بشیر احمد کو اس کا بھرپور احساس ہے۔ میں ان کی زبان میں یہ بات ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کتاب کے آخر میں کچھ منظومات شامل ہیں۔ ایک نظم ہے 'ادبی منظر نامہ'۔ اپنی بات آپ تک پہنچانے کے لیے اُس کے دو شعر عرض کروں گا۔

صاحب دیوان لٹو خان جب سے ہو گئے

ہے ادھر خاتون خانہ وجد میں آئی ہوئی

حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اب میرے احباب کی طرح میں بھی خواب پارہ سے چند شعر آپ کو سناؤں گا:

خواب، حقیقت، پیکر جاں کا درد سراپا دونوں ہیں

ایک مسلسل جنگ کے درپے آب، جزیرہ دونوں ہیں

وہ آواز نہیں آسبھی دھوکا تھا

دھوپ کی جادوگرنی تھی، برفاب ہوئی

مناظر روح فرسا بستیوں کے

پرندے سب کے سب تھے ہجرتوں کے

دو شعر اور:

یاد کے سارے جزیرے بے نشان

اپنی کشتی کو کہاں لے جاؤں میں

کہہ دے ورنہ لب پر بول اٹک جائیں گے

بھاری برف میں گھر آنگن سب ڈھک جائیں گے

خواب پارہ... آشوب کا گہرا احساس

پروفیسر غلام رسول ملک

خالد بشیر احمد کی شخصیت ایک رنگارنگ شخصیت ہے۔ لیکن اُن کی شخصیت کے رنگ آہستہ آہستہ ایک منظر مسلسل کی طرح میری آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے رونما ہو رہے ہیں۔ اس سے پہلے کئی سال قبل اُن کی کتاب Through Jhelum-The River My Backyard کے سلسلے میں ایک تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اُس وقت میں نے اُن کا ایک رنگ دیکھا تھا۔ وہ کتاب بیک وقت تاریخ ہے، جغرافیہ ہے۔ ہماری mythogy ہے، ہماری legend ہے اور یہ سب اُس کتاب میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو گماں ہوتا ہے کہ وہ ایک بہت ہی دلچسپ اور suspense سے بھرپور فلشن پارے کا افسانوی ادب کا مطالعہ کر رہا ہے۔

آج جب خالد بشیر احمد کی یہ کتاب 'خواب پارہ' میں نے دیکھی ہے تو ایک دوسرا رنگ نظر آیا۔ اسی سلسلے میں بس ایک دو باتیں عرض کرنا چاہوں گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ یہ شاعری ہے اور اردو میں لکھی گئی شاعری ہے۔ اب شاعری اور تگ بندی میں بہت کم فرق رہ گیا ہے۔ یہ بد قسمتی ہے اور خالد بشیر احمد کو اس کا بھرپور احساس ہے۔ میں اُن ہی کی زبان میں یہ بات ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس کتاب کے آخر میں کچھ منظومات شامل ہیں۔ ایک نظم ہے 'ادبی منظر نامہ' اپنی بات آپ تک پہنچانے کے لیے اُس کے دو شعر عرض کروں گا۔

صاحب دیوان لٹو خان جب سے ہو گئے
ہے ادھر خاتونِ خانہ وجد میں آئی ہوئی

کل صد دھوبی کا مجموعہ سخن چھپنے کے بعد
 ساجدہ دھوبن سے ادبی جادہ پیمائی ہوئی
 خالد بشیر احمد کو احساس ہے کہ وہ ایک ایسے ادبی ماحول میں اپنی شاعری پیش کر رہے
 ہیں جہاں بد قسمتی سے اب تک بندی بھی شاعری کے نام پر سامنے آرہی ہے۔
 دوسری بات جو میں نے عرض کی کہ یہ اردو میں لکھی گئی شاعری ہے اور اردو کی
 مظلومیت کا رونا جتنا بھی رویا جائے اُتاکم ہے۔ اپنی جنم بھومی میں ایسا لگتا ہے کہ اردو جو نام
 ہے ایک تہذیب کا، جو نام ہے ایک کلچر کا، جو نام ہے ایک حسیت اور sensibility کا۔ جو نام
 ہے ایک سوچ اور طرز فکر کا، وہ اردو بد قسمتی سے اپنی جنم بھومی میں ختم ہو رہی ہے۔ میں نے پچھلے
 سال اردو اکادمی، جموں و کشمیر کے مختصر سے جلسے میں عرض کیا تھا کہ اگر اردو فنا ہوتی ہے تو ایک
 تہذیب فنا ہو جائے گی۔

It will be a social and biological disaster if this
 language disappears from the surface of its own birth place.
 میں نے اُس وقت اپنی یہ بات عرض کرنے کے لیے کہ اردو کیوں ایک تہذیب کا نام ہے
 چکبست کے کچھ اشعار پیش کیے تھے اور اس وقت مختصر اُن اشعار کی جانب پھر اشارہ کروں گا۔
 یہ وہ وقت ہے جب چکبست رام چندر جی کے اپنی ماں سے رخصت ہونے کا منظر بیان کرتے
 ہیں۔ بس یہ تہذیب ہے

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
 راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام

مقصود تھا جو ماں کی زیارت کا اہتمام
 دامن سے اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
 اس کا ایک اور بند میں آپ کے گوش گزار کرانا چاہوں گا۔ رخصت ہوتے ہوئے جو
 الفاظ چکبست نے رام چندر جی کی زبان سے ادا کئے ہیں

اپنی نگاہ ہے کرمِ کار ساز پر
صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر

جنگل ہو یا پہاڑ، سفر ہو کہ ہو حضر
رہتا نہیں وہ حال سے بندوں کے بے خبر

اُس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

میں نے عرض کیا تھا کہ یہ تہذیب ایسا لگ رہا ہے مٹ رہی ہے۔ یہ سب کی مشترکہ تہذیب تھی۔ اسی لیے میں نے چکبست کے اشعار پیش کیے نہیں تو کسی اور کے اشعار بھی پیش کر سکتا تھا اور اگر آج کے زمانے میں خالد بشیر احمد جیسے اردو کے خدام سامنے آتے ہیں اور اردو زبان میں اپنی تخلیقیت کا اظہار کرتے ہیں تو یہ ہم سب کے لیے باعثِ فخر ہے اور ہمیں اسے ہمیشہ خوش آمدید کہنا چاہیے۔

شاعری ہر آدمی اپنے طریقے سے پڑھ سکتا ہے اور اپنا تاثر قائم کر سکتا ہے۔ میں ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں تو یہ کتاب پڑھ کر اس کی جو نمایاں ترین خصوصیت مجھے نظر آئی اُس کے لیے انگریزی میں ہم لفظ استعمال کرتے ہیں suggestivity۔ اردو میں آپ اسے رمز و ایما کہیے، ایہام کہیے، اِتماج کہیے، تو یہ کہیے، کوئی بھی اصطلاح استعمال کیجیے لیکن استعارہ کے بعد شاعری کی جو جان ہوتی ہے وہ یہی suggestivity ہے۔ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا وہی بات سب سے اہم ہوتی ہے Unsaid is more important in genuine poetry than that which is said جو بات کہی جاتی ہے وہ اتنی اہم نہیں ہوتی ہے جتنی وہ بات اہم ہوتی ہے جو کہی نہیں گئی ہے مگر بین السطور میں موجود ہوتی ہے۔ سطروں میں جو کچھ ہے وہ اتنا اہم نہیں ہے جتنا وہ بات ہوتی ہے جو بین السطور میں شامل ہوتی ہے اور خالد بشیر احمد کی شاعری میں مجھے جا بجا اس کے شواہد ملے۔ ان کی شاعری کا اگر کوئی

مجھ سے پوچھے کہ آپ کے خیال میں defining characteristic کیا ہے اس کی امتیازی خصوصیت کیا ہے تو میں یہ کہوں گا کہ اس کے اندر یہ suggestivity یہ رمز و ایما گوٹ گوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ آپ اجازت دیں تو اس سلسلے میں دو شعر آپ کو ضرور سناؤں گا۔

یہ حدِ محبت ہے تو اعجازِ وفا بھی
جو اُس نے کہا ہی نہیں وہ میں نے سنا بھی

ایک اور شعر ملاحظہ ہو

اُنڈ کے آئے ہیں اندیشہ ہائے دور دراز
کئی دنوں کا گیا نامہ بر نہیں آیا
اسی suggestivity کی توضیح میں ایک اور شعر سن لیجیے

اپنی کتاب اُس نے میرے نام کی مگر

اندر جو کچھ لکھا تھا وہ میرے خلاف تھا

اس suggestivity کا ایک پہلو وہ ہے جسے ہم آج کی تنقید میں Inter-textuality کہتے ہیں۔ بین التونیت۔ اور جتنا بڑا شاعر ہو اتنا ہی اُس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنی شعری روایت، اپنا شعری ورثہ بلکہ وہ تمام شعری ورثہ جس تک اُس کی رسائی ہو۔ جو زبانیں وہ جانتا ہو جن زبانوں کے ادب کا اُس نے مطالعہ کیا ہو یا شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ اُسے اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور اُسے شاید خود بھی شعور نہ ہو لیکن اُس کے شواہد بار بار اُس کے کلام سے سامنے آتے ہیں۔

مجھے خالد بشیر احمد کی شاعری میں غالب بھی نظر آیا، فیض بھی نظر آیا، اپنی لال دید بھی نظر آئی اور غالب کے ذہنی رویے کے بھی کہیں کہیں شواہد ملے۔ اس سلسلے میں ایک دو شعر کی صورت میں آپ کو پھر زحمت دے رہا ہوں:

تمام لذتوں کو تلخیوں میں گھول دیا

کہ ایک سامرا ہجر و وصال اُس نے کیا

یہ شعر بھی سن لیجیے

وفا کا دور ہے جب سے زوال آمادہ
یہ دل ہوا ہے زیادہ وصال آمادہ
یہ شعر پڑھتے ہی فیض کے وہ خوبصورت (اُن کا تو ہر شعر خوبصورت ہے) اشعار یاد
آئے جن کا آغاز ہوتا ہے

نہ پوچھ جب سے تیرا انتظار کتنا ہے
کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
اپنی دل دید بھی کہیں کہیں بڑی ہی خوبصورت طریقے میں سموئی ہوئی، رگ و پے میں
پیوست کی ہوئی ملتی ہے جیسے کہ وہ ہر کشمیری خاص طور پر جوں دل دید کا مطالعہ کرتے ہیں، کی رگ و
پے میں پیوست ہے۔ یہ شعر سن لیجئے

ایک سمندر حائل میرے اُس کے بیچ
ایک شکستہ کشتی میرے اپنے ساتھ
اب ہر کسی کے ذہن میں آیا ہوگا۔

آمہ پنہ سُدس ناو جھبس لمان

کُتہ بود دے میون مہتہ دیہ تار

دل دید کے حوالے سے کشمیر کا ذکر آیا تو ایک آخری بات میں عرض کروں کہ خالد بشیر
احمد کو اُس آشوب کا بھرپور احساس ہے جس سے ہم لوگ گزر رہے ہیں۔ آشوب کی تشخیص
چاہے آپ کسی طریقے سے بھی کیجیے، اس کے عوامل کو چاہے آپ کسی طریقے سے بھی
define کیجیے لیکن آشوب، آشوب ہے، درد درد ہے۔ تکلیف، تکلیف ہے۔ یہ جس کو بھی پہنچتی
ہے، پہنچتی ہے۔ شمشیر اگر کسی جسم پر پڑے تو زخم آجاتا ہے چاہے شمشیر چلانے والا کوئی بھی ہو۔
اس آشوب کا گہرا شعوری طور پر اپنے اندر assimilate کیا ہوا، احساس اور پھر اس کا
شاعرانہ اظہار بہت ہی خوبصورت طریقے سے اکثر جگہ پر سامنے آیا ہے۔ یہ اشعار سن لیجئے:

خوابوں نے تو پہلے ہی سے کھولی تھی طنائیں

اس شہر میں سہمی ہوئی آتی ہے ہوا بھی

لہو لہو تھے مناظر گھروں سے آگے بھی
 لٹا چکے تھے بہت کچھ سروں سے آگے بھی
 شعر بہت سے ہیں مگر میں صرف دو تین اور سناؤں گا۔
 بانجھ ہو گئے بادل، ندیاں بھی سوکھی ہیں
 یہ ہری بھری وادی خار و خس نہ ہو جائے
 کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ ہماری یہ محفلیں، یہ ساز و سامان سب ایک mockery ہے
 تلہ چھے، نوس تہ پٹھ چھک نثران
 و نتمہ مالہ و ند کتھہ پثران چھی
 اور یہ چیزیں بھی یہاں بار بار نظر آتی ہیں۔ ایک اور شعر سن لیجیے۔
 ہوتا نہیں ہوئے بلا کا نزول کم
 اس گل زمیں پہ کھلتے نہیں پھر بھی پھول کم
 یہ پوری غزل social conciousness کی آئینہ دار ہے۔
 یہ شعر سن لیجیے

یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر
 ہوتے ہیں حادثات سے اب دل ملول کم
 اب غالب کو دیکھئے

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
 مشکلیں مجھ پر پڑی اتنی کہ آساں ہو گئیں

This reminds me of Tasitus. Tasitus wrote and this is
 English translation: "They make a desolation and call it
 peac, peace of the graveyard

یہ شعر سن لیجیے

فصل شہر پر لہرا رہا تھا امن کا پرچم

درونِ شہر لیکن راستوں سے خون جاری تھا

They make a desolation and call it peace

یہ کتاب منظومات پر اختتام پذیر ہوئی ہے۔ منظومات بہت خوب ہیں۔ ایک چیز جس کا مجھے احساس ہوا اور آپ کے سامنے عرض کروں گا وہ یہ کہ خالد بشیر احمد کے اندر اللہ نے طنز و مزاح کی صلاحیت بھی رکھ دی ہے اُس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میرے پاس وقت ہوتا تو میں سنا دیتا کہ کہاں کہاں مجھے طنز و مزاح کے وہ مظاہر نظر آئے لیکن یہ خصوصیت پروان چڑھے تو یہ بہت ہی اچھی بات ہوگی کیوں کہ اس چیز کی بھی ہمارے یہاں بہت کمی ہے اور جن حالات سے ہم دوچار ہیں اُن سے ادب کی سطح پر ایک طریقہ لڑنے کا یہ ہوتا ہے کہ آپ طنز و مزاح سے کام لیں۔ اور یہ وقت ہے کہ خالد بشیر احمد اُس کی طرف توجہ کریں۔ آخر میں ان کی نظم جو مجھے بہت پسند آئی ہے، میں نے خواب دیکھے ہیں کے تین شعر عرض کر کے آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔

نظم کا آغاز دیکھئے۔

میں نے خواب دیکھے ہیں
خوشبوؤں کے پھولوں کے
روشنی کے، رنگوں کے
جگنوؤں کے، بادل کے
جنگلوں میں جل تھل کے
میں نے خواب دیکھے ہیں

آئیے دُعا کریں کہ ان الفاظ میں جن علام کا، جس خواب کا ذکر کیا گیا ہے علام کے واسطے سے وہ خواب شرمندہ تعبیر ہوں۔

خالد بشیر احمد کا طرزِ سخن

جاوید انور

خالد بشیر احمد نے اپنے اشعار میں زندگی کی جن حقیقتوں کا اظہار کیا ہے، ان میں بیش تر کا تعلق انسانی فطرت میں قدرت کی جانب سے ودیعت کردہ ان صفات سے ہے جو کافی حد تک حلم و کرم اور اس کے نتیجہ میں اظہارِ تشکر سے نمایاں ہوتی ہیں۔ اس کا ثبوت ان کے یہاں حمد اور نعت کے اشعار میں تو مل ہی جاتا ہے۔ جیسے

وہ پیاس دیتا ہے تو اس کے بعد پانی بھی
اسی یقین پر ہے میری خوش گمانی بھی

اُسی نے بیج کو دی ہے حیات، بادل میں
چھپائی برق بھی، سایہ بھی اور پانی بھی

مدینے کی طرف جو سارے رستے جارہے تھے
نظر میں اس شہر کے خواب بستے جارہے تھے

ٹرپ ایسی کی سرپٹ دوڑتی جاتی تھی خواہش
حجاب ایسا، زمیں میں پاؤں گڑتے جارہے تھے

ان کے علاوہ بھی بہت سے اشعار جو علومِ لسانیہ کے لوازمات کو بھی نظر انداز نہیں کرتے اور اخلاقی تہذیبی اور معاشرتی اور ذہنی معیار کو برقرار رکھتے ہوئے صحت مندی سیاسی نظام جو عوام کو پرسکون زندگی گزارنے اور زندگی کی دوسری ضروری سہولتیں فراہم کرنے میں معاون و مددگار ہو، جیسے موضوعات کو احاطہِ قریطاس میں لاتے ہیں، میں بھی اظہارِ تشکر اور جذبہِ خلوص کے عناصر نمایاں ہیں۔ ان موضوعات کے دوسرے رخوں یعنی متضاد پہلوؤں پر غور کیا جائے یعنی جہاں حقیقت کے وہ موضوعات جو تلخ اور بالکل برعکس احساسات کا جامہ پہنے ہوئے ہیں وہاں بھی خالد بشیر احمد نے عاجزانہ اور انکسارانہ طرز کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے اور اپنی ان صفات کو کام میں لاتے ہوئے بہت موثر انداز میں ان کو بھی پیش کیا ہے۔

دیارِ خواب کے ہم شب گزیدہ لوگوں کے
دلوں میں خوف بہت ابتدائے شب سے ہے

دیکھا جو کچھ اس سے زیادہ اور بھی ہے
آنکھوں سے منظر کا وعدہ اور بھی ہے

ترا خیال بڑا خوش نما پرندہ ہے
مگر اٹھان میں ہی انتقال اس نے کیا

لہو لہو تھے مناظر گھروں سے آگے بھی
لٹا چکے تھے بہت کچھ سروں سے آگے بھی

وہ خواب رکھتا ہے، آنکھیں نکال دیتا ہے
اور اس ستم پہ بھی چپ کا سوال دیتا ہے
خالد بشیر احمد نے اپنے اشعار میں مختلف ادبی تحریکات کے رویوں اور زاویوں کو

استعارے کی صورت میں تو قبول کیا ہے لیکن انہوں نے اس ضمن میں ”ادب برائے فن“ یعنی Art for art's sake کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی ہے بلکہ ادب برائے زندگی کا نظریہ ان کے یہاں زیادہ معتبر ہے۔ اصل میں وہ ادب برائے فن کو اس تصور تک محدود دیکھتے ہیں جہاں فنی تخلیق فی نفسہ اہم ہونے کے باوجود اپنی ذات کی محدودیت کو دوسرے ادبی تقاضوں اور سروکاروں پر ترجیح دیتی ہے۔ وہ نصیحت آمیز، مقلمانہ اور افادی نظریہ ادب کو بھی وہی اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تخلیقی اور فنی موضوعات و نظریات میں کوئی کم یا زیادہ اہمیت کا حامل نہیں بلکہ موقع و محل کے اعتبار سے جو موضوع نظریہ اور تخلیقی عناصر شعر کی تخلیق کے وقت اپنے بیش تر ادبی تقاضوں اور اصولوں کے تحت ان کے تصورات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ”ادب برائے فن“ کے تعلق سے پیلخانوف (Plekhanou) نے ”آرٹ اینڈ سوشل لائف (Art and Social Life) میں لکھا ہے:

”فن برائے فن (ادب برائے فن) کا عقیدہ اس وقت پیدا

ہوتا ہے جب کہ فنکار اور عوام جن کو اس میں بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے

اپنے سماجی ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔“

اس نکتہ نظر سے خالد بشیر احمد کے چند اشعار دیکھے جائیں:

ہوا پہ لکھا ہوا ہے دائم نوازشیں ہیں

سمندروں کے سفر میں سبزے کی خواہش ہیں

تھکن سفر کی ابھی سرحد بدن میں ہے

کئی دنوں سے کوئی اجنبی وطن میں ہے

مرے وطن میں سپاہ جنوں کے ہاتھوں نے

گلی گلی میں فروزاں کیے ہیں ہو کے چراغ

ہجرت کا اک چکر اپنے پانوں میں ہے
جانے کس صحرا میں آ کر تھک جائیں گے

فصیل شہر پر لہرا رہا تھا امن کا پرچم
دروں شہر لیکن راستوں سے خون جاری تھا

خالد بشیر احمد نے اپنے اشعار میں جن حالات اور زندگی کی حقیقتوں کی عکاسی کی ہے اس میں غم، اداسی کرب اور مایوسی کے ساتھ ساتھ امید اور آرزوں کا انسلاک بھی شامل ہے۔ لیکن ان میں جام وینا، ساقی و پیانہ اور عاشقی و بوالہوسی جیسے موضوعات کو یا تو نہ کے برابر برتا گیا، یا پھر انہیں نظر انداز ہی کر دیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خالد بشیر احمد نے شعوری طور پر ان موضوعات سے گریز کیا ہو۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہوں نے سماج اور ماحول کے غم و اندوہ کو اپنے اشعار کا وسیلہ تو بنایا ہے لیکن لطف و مسرت حاصل کرنے اور حظ اٹھانے کے دوسرے پہلوؤں جو کہ غم و اندوہ کے متضاد پہلوؤں کی صورت میں ادیب اور فنکار کی اہمیت کی جانب توجہ مبذول کرانے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہیں ادیب کی انسانی آگہی، بیداری اور سماج کے تئیں اس کی بحیثیت فرد سماجی ذمہ داریوں کے نباہ کی صورتیں بھی نمایاں کرتے ہیں۔ ان تمام حالات میں عبد معبود سے جو التجا کرتا ہے اور خواہشوں کی تکمیل کی امیدیں وابستہ کرتا ہے اس یقین کو معبود کے یہاں کیا اہمیت حاصل ہے، اس کا اظہار انہوں نے اپنے ایک شعر میں بہت ہی خوبصورتی سے کیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو

کیسا اندیشہ میں تیری بات کیسے ٹال دوں
بھیج دے کچھ خواہشیں، کچھ التجائیں بھیج دے

دیگر گفتگو کے حوالے سے چند اشعار

وہ فصلِ سر ہے جہاں تک نگاہ جاتی ہے
جو رہ گزر ہے وہی قتل گاہ جاتی ہے

یہ کیا دشت کا چکر ہے میرے پاؤں میں
سفر تمام ہوا اور گھر نہیں آیا

مرے لیے تو سارے موسم ایک سے تھے
دریا پار اُتر کر آگے صحرا تھا

پیاس بھی ہے اور کچھ تسکین بھی
ہاتھ میں دنیا بھی ہے اور دین بھی

نشان اپنے پیچھے راستے کے سب مٹا دیئے
اور اب یہاں سے لوٹنے کا اختیار دے گیا

خالد بشیر احمد ارڈرڈ کے ماحول میں سانس لیتی زندگی کی حقیقتوں کے المیوں کو دنیا کی
بیش تر جگہوں کے مسائل سے بہت مختلف اور شدید تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اپنے
قرب و جوار کے مسائل سے چشم پوشی اور اپنے عہد کی زندگی سے دور ہونے والا ادب بہت جلد
زوال پذیر ہو جاتا ہے اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ تاریخ اکثر افسانوں پر مبنی ہوتی ہے اور
ادب میں زندگی اور سماج کے تعلق سے جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں وہ زیادہ تر تاریخی
صدافت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض کی حیثیت دستاویزی ہوتی ہے۔ خالد بشیر احمد
نے اپنے عہد کی ٹھوس حقیقتوں پر کڑی نگاہ رکھی ہے اور انہوں نے ان کے بیان کے تعلق سے
علامتوں کا سہارا بھی لیا ہے۔ چارلس نے علامت کی بہت عمدہ تعریف کی ہے جو خالد بشیر احمد
کے اشعار سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔ چارلس کے لفظوں میں:

”علامت نگاری تصورات اور جذبات کے اظہار کا فن ہے

لیکن ان کا براہ راست بیان نہیں کیا جاتا اور نہ حتیٰ پیکروں کے ساتھ ان
کے واضح تقابل کے ذریعہ ان کی صراحت کی جاتی ہے۔ بلکہ دوسری

اشیاء کے ذریعہ قاری کے ذہن میں ان خیالات کی باز آفرینی کرتے
ہیں اور اس باز آفرینی میں یہ نہیں بتایا جاتا کہ یہ اشیاء ان خیالات کی
علامتیں ہیں۔“

(Symbolism: Charles Chadwick, London-1973 P 2,3)

خالد بشیر احمد کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نبی تلی تھی رہگور ہوئے انتقام کی
گھروں سے ابتدا ہوئی تو معبود پہ ختم ہے

میں نے کھڑکی کھول کے گزرے وقت میں جھانکا تھا
دھول شناسائی کی اڑ کر آنکھوں میں آئی

اپنی انگلی تھامے گھر سے نکلا تھا
لوٹا اپنا آپ گنوا کے اپنے ساتھ

خوابوں سے کبھی آنکھ کے دو گھر نہیں بھرتے
بارش کے برسنے سے سمندر نہیں بھرتے

الفاظ کبھی زخم کا مرہم بھی ہوئے ہیں؟
دریاؤں کی گہرائی کو کنکر نہیں بھرتے

خالد بشیر احمد نے اپنے سماج اور ماحول کی آرزو مند یوں جو کہ ذات کے ایک شعور کی
صورت اختیار کر چکی ہیں، کو انسان کے فطری تقاضوں سے منسلک کر کے ان کا رشتہ نئے عہد کی
تلخیوں سے بھی جوڑ دیا ہے۔ انہوں نے اپنے اشعار میں جموں و کشمیر کی تاریخ کی حقیقت
نگاری کو اس طرح شعری لہجہ عطا کیا ہے کہ ذات پات کے اثبات اور وجود کی دریافت کا جذبہ

بیک وقت متحرک ہے۔ اس طرح فکری سطح پر غور کیا جائے تو علم ہوتا ہے کہ خالد بشیر احمد نے اپنی شعری کائنات کے نظام کے لیے جو الفاظ کا ڈھانچہ مرتب کیا ہے، وہ ان کے تجربات کا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس سے آگے جا کر الفاظ کی جمالیاتی وحدت اور اس میں پنہاں معنی کا ایسا وسیع بسیط سلسلہ فراہم کرتا ہے جو سماجی صداقتوں کی مختلف سطحوں کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ ان کی شاعری عصری اور مکانی منظر نامے کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ ابدی اور آفاقی افکار سے بحث کرتے ہوئے اپنے شعری موقف کو منطقی احساس فراہم کرتی ہے۔

بچھڑ گئے ہیں تو ملنے کی آرزو کیوں ہو

دلوں کے درمیاں یہ دائمی عذاب نہ رکھ

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ خالد بشیر احمد کی شاعری جہاں ذات و کائنات کے ازلی مسائل کو سامنے لاتی ہے وہیں اپنے مخصوص سماج کے ذہنی ماحول اور حالات و حوادث کو بھی پیش کرتی ہے۔ لیکن اس طرح کہ وہ کسی مخصوص اور متعینہ نظریے یا دستور العمل کے غالب رجحان کو اپنا شعار جذباتی طور پر نہیں بناتی بلکہ ان کا انسلاک کسی نہ کسی طور مخصوص سماج کی شعری روایت سے بھی ہے۔ ان کے خیالات کا علامتی تبدل ان کے تمام تخلیقی مظاہر میں اپنی مخصوص تہذیبی روایت کا حصہ بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ خالد بشیر احمد کے نزدیک انسانی عقل و عمل کا ہر وہ نیا منظر جو اپنے پس منظر کو رد نہیں کرتا، ان کی شاعری کا حصہ ہے۔ ہر وہ تجربہ جو شخصیت اور مسائل کے کسی پہلو سے ربط رکھتا ہے خواہ اس کا تعلق تاریخ سے ہو، سماج سے ہو یا انسانی عقل کے مختلف زاویوں سے خالد بشیر احمد کے نزدیک بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

تیرا میرا ایک مقدر، میں شاعر تو ایک خیال

اس ناطے سے گلیوں گلیوں میں آوارہ دونوں ہیں

بادباں اپنی جگہ لیکن ذرا سی احتیاط

دوب ہی جائے نہ یہ کشتی ہواؤں میں کہیں

دوستوں والی کوئی بات نہیں ہے اس میں
اس کی ہر بات میں پہلو ہے کتابوں والا

آنکھ میں اب کوئی منظر نہیں بھرنے والا
چھپ گیا چاند سمندر میں اترنے والا

ظاہر باطن اک جیسا ہے، کتنے بھولے ہو
کچھ تو فرق روا رکھتے ہیں باہر اندر میں

نظر میں شخص نہیں، اُس کا خواب باقی ہے
خوشی تمام ہوئی، اضطراب باقی ہے

خالد بشیر احمد نے اپنے جذبہ و فکر کے اظہار کے لیے تخلیقی اور تہذیبی روایت کے
طویل سلسلوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے عہد کی حقیقتوں میں اظہار کی نئی صورتیں پیدا کی
ہیں۔ اس لیے تخلیقی اور تہذیبی روایت کے طویل سلسلوں کے جستہ جستہ عناصر بھی واضح اور کبھی
مبہم شکلوں میں ان کی شاعری میں در آئے ہیں۔ خالد بشیر احمد کا یہ تمام اور اک اور طرز احساس
انہیں شعر و ادب میں نمایاں مقام کا حامل بناتا ہے۔

خالد بشیر احمد..... بحیثیت شاعر

پروفیسر محمد اسد اللہ دانی

خالد بشیر احمد ریاست جموں و کشمیر کے ایک ایسے تخلیق کار ہیں جن کی شخصیت کے کئی ابعاد ہیں۔ وہ بیک وقت ایک لائق، فائق، ایمان دار اور فرض شناس اعلیٰ آفیسر، ایک معتبر، مستند اور حساس شاعر اور ایک صاحب طرز ادیب، صحافی اور موزن ہیں۔ وہ بچپن سے ہی کافی ذہین اور محنتی رہے ہیں۔ بچپن میں ان کی تمام توجہ حصول تعلیم اور شوق مطالعہ کی جانب مبذول رہی۔ نتیجتاً انہوں نے اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک کے تمام امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کیے جس کی وجہ سے اپنے اس تعلیمی سفر کے دوران وہ اساتذہ کی خاص توجہ کا محور و مرکز رہے۔

ان کی زندگی کے ابتدائی دور کے بارے میں اس بات کے تذکرے کی چنداں ضرورت نہیں کہ انہوں نے اپنی ملازمت کا آغاز روزنامہ 'آفتاب' سے کیا اور پھر ریاستی محکمہ اطلاعات میں انفارمیشن آفیسر تعینات ہوئے۔ اس کے بعد انہوں نے اسی محکمہ میں ماہنامہ 'تعمیر' کے مدیر سے لے کر ناظم اطلاعات تک ملازمت کا ایک طویل سفر طے کیا۔ آخر میں وہ اگرچہ ڈائریکٹر محکمہ لائبریریز کے عہدے سے ۲۹ فروری ۲۰۱۲ء کو سبکدوش ہوئے لیکن ریاستی حکومت نے اپنے ایک فیصلے کے مطابق ان کی ملازمت میں دو سال کی توسیع کی اور جون ۲۰۱۲ء میں انہوں نے جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف کلچر اینڈ لینگویجز کے سیکریٹری کا عہدہ سنبھالا۔

خالد بشیر احمد کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ انہوں نے اپنا پہلا افسانہ 'انوکھا ملن' کے عنوان سے لکھا جو سری نگر سے شائع ہونے والے معروف روزنامہ 'آفتاب' میں ۱۵ جنوری ۱۹۷۲ء کے شمارے میں چھپ کر منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد انہوں نے مسلسل کئی برس تک افسانے لکھے جو مقامی روزناموں میں تواتر سے شائع ہوتے رہے۔

خالد بشیر احمد کا پہلا شعری مجموعہ 'صدائے نیم شب' کے عنوان سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا جس میں بقول اُن کے 'اکا دکا غزل کے سوا صرف گزشتہ اڑھائی برس کی شاعری شامل ہے' (۱) اپنی اس شعری کاوش کو خالد بشیر احمد نے انتساب کے طور پر '۲۳ ستمبر کی نذر' کیا ہے۔ اس کا مقدمہ ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے تحریر کیا ہے جو سات صفحات پر محیط ہے۔ شاعر موصوف نے اس کا پیش لفظ ایک آزاد نظم کی صورت میں سپرد قلم کیا ہے جو جدید شاعری کی نوید معلوم ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ پانچ اشعار کی چھپیس، چار اشعار کی پندرہ، تین اشعار کی آٹھ غزلیات کے علاوہ سات فردیات، دو قطعات اور گیارہ نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کے صفحات کی تعداد ۸۸ ہے۔ اس کی کتابت ریشی نے کی ہے اور اس کا سروژق احمد نے بنایا ہے۔ ڈسٹ کوری پشت پر کتاب اور صاحب کتاب کا مختصر تعارف ہے۔ کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں قیمتی مشوروں کے لیے مصنف نے فاروق آفاق اور جاوید آذر کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اس شعری مجموعہ پر جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لیگنٹو بھجری کی طرف سے ۱۹۸۴ء کا بہترین اردو کتاب کا ایوارڈ ملا ہے۔ اس مجموعہ کا دوسرا ایڈیشن مارچ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا۔

خالد بشیر احمد کا دوسرا شعری مجموعہ 'خواب پارہ' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں ظاہر ہے ۱۹۸۳ء کے بعد کی شعری تخلیقات شامل کی گئی ہیں لیکن اس طویل عرصہ میں دفتری ذمہ داریوں کی مصروفیات سے عہدہ برآ ہونے کے ساتھ ساتھ خالد بشیر کی تمام تر توجہ کشمیر کی ثقافت، ادب، اساطیر، تاریخ اور معیشت پر مرکوز رہی اور اس دوران انہوں نے اردو اور انگریزی میں کشمیر کے حوالے سے مختلف موضوعات پر بہت سے مضامین سپرد قلم کیے۔ چنانچہ انہوں نے 'JHELM-THE RIVER THROUGH MY BACKYARD' کے عنوان سے انگریزی میں ایک معرکتہ لارا کتاب تحریر کی جو ۲۰۰۱ء میں زیور طبع سے آراستہ

ہوئی۔ جہلم اور کشمیر کی تہذیب اور ثقافت کے حوالے سے انگریزی زبان میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی اور منفرد کتاب ہے۔ اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے علمی، ادبی اور عوامی حلقوں میں چونکہ اس کتاب کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی چنانچہ اس کی اسی مقبولیت اور اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے اسے ۲۰۰۸ء میں مزید اضافوں اور حوالوں کے ساتھ اردو میں ترجمہ کر کے 'دیدہ آب رواں' کے نام سے شائع کیا اور کشمیر اور کشمیریات سے دلچسپی رکھنے والے مورخین، محققین اور مبصرین سے بے پناہ داد و تحسین حاصل کی۔ جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویج کی طرف سے اس کتاب پر سال ۲۰۱۰ء کا اردو کی بہترین کتاب کا ایوارڈ دیا گیا۔

خالد بشیر احمد کی تخلیقات کا مطالعہ قاری کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ انہوں نے ادب کی جس صنف میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا، اُس میں ان کی کامل دسترس اور بھرپور مہارت حاصل ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے شعری مجموعے 'صدائے نیم شب' اور 'خواب پارہ' کے علاوہ کشمیر کے تعلق سے دریاے جہلم کی ثقافتی، تہذیبی، تمدنی، سماجی اور سیاسی تاریخ 'جہلم' دی ریور تھر وائی بیک یارڈ' (انگریزی) یا اس کے اردو ترجمہ 'دیدہ آب رواں' سے متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔

خالد بشیر احمد کا دوسرا شعری مجموعہ اُن کے اولین شعری مجموعہ 'صدائے نیم شب' کے کم و بیش پچیس سال کے بعد خواب پارہ کے نام سے معرض وجود میں آیا جس کا انتساب انہوں نے اپنے بھائی کے نام ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔ 'اپنے اُمی و معصوم برادر مرحوم غلام محی الدین کے نام..... کہ دل میں تیری جدائی کا داغ روشن ہے۔ اس مجموعہ کا سرورق زہیب نے بنایا ہے اور کمپیوٹر کمپوزنگ کا کام فیاض اور ساجد نے انجام دیا ہے۔ کتاب کی پشت پر خالد بشیر اور ان کی تخلیقات کا اجمالاً تعارف دیا گیا ہے۔ پہلے شعری مجموعہ کے برعکس اس میں کوئی مقدمہ یا پیش لفظ وغیرہ شامل نہیں ہے بلکہ چار صفحات پر مشمولات کی ترتیب دی گئی ہے۔ حمد، نعت اور غزل کا پہلا مصرع اور منظومات کے عنوانات درج کیے گئے ہیں۔ اس شعری مجموعہ میں بھی پہلے مجموعے کی طرح پانچ، چار اور تین اشعار کی غزلیں شامل اشاعت ہیں، جن کی تعداد

بالترتیب چھتیس چھبیس اور اکیس ہے۔ اس میں قطعات چھبیس منظومات پانچ اور فردیات چار ہیں۔ ان کے علاوہ اس کے آغاز میں چھ اور پانچ اشعار کی دوحہ اور پانچ اشعار کی دوغیتیں بھی ہیں۔ اس شعری مجموعہ کے صفحات کی تعداد ۱۲۰ ہے۔

جہاں تک خالد بشیر احمد کی شاعری کا تعلق ہے وہ جدید حسیت اور عصری آگہی کے شاعر ہیں۔ اپنے منفرد لب و لہجہ، الفاظ کی دروست اور لفظ و معانی کی پیکر تراشیوں کی بدولت ان کا شمار موجودہ عہد کے اُن اردو شعرا میں ہوتا ہے جن کے تذکرہ کے بغیر اس عہد کی ادبی تاریخ تضحیل رہے گی۔ آج سے تیس برس پہلے جب ان کا پہلا شعری مجموعہ ’صدائے نیم شب‘ شائع ہوا تو اردو دنیا کے ادبی حلقوں میں اس کی کافی پذیرائی ہوئی۔ کہنے کو یوں تو یہ ان کا ابتدائی کلام ہے اور وہ بھی صرف اڑھائی برس کے دورانیے کا، لیکن مشاہدے کی گہرائی، تجربے کی فراوانی اور کلام کی پختگی کے پیش نظر اس مجموعے کے مطالعہ سے ان کے کم عمر یا نووارد ہونے کا کوئی گمان نہیں ہوتا۔ پروفیسر حامدی کا شیریں نے انہیں اگرچہ ’ایک باشعور، حساس اور محنتی شاعر‘ کی حیثیت سے بزم شعر میں خوش آمدید کہہ کر اپنی بات مکمل کی ہے مگر اس سے قبل انہوں نے یہ اہم اعتراف بھی کیا ہے

”خالد بشیر ریاست کے دیگر شعرا کی مانند اپنے تخلیقی سفر میں مصروف ہیں۔ وہ تجربے اور اظہار کی کشاکش سے گزرتے ہوئے اپنے شعری تجارب کی توسیع و تشکیل کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو انہیں ملکی شعرا کے ہم پلہ بنانے کی ضمانت فراہم کرتے ہیں اور معاصر نقادوں کے لیے چیلنج کا حکم رکھتے ہیں“

جہاں تک ایک ادیب، فن کار یا شاعر کا تعلق ہے وہ اسی دنیاے آب و گل اور عالم رنگ و بو کا رہنے والا ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ اور مطالعہ اس کے اپنے گرد و پیش کے ماحول کا آئینہ ہوتا ہے۔ وہ ملکی اور عالمی سطح پر رونما ہونے والے حالات، واقعات، وہاں کی حکومت، سیاست، ثقافت، معاشرت، معیشت، تہذیب، تمدن، علوم اور فنون کے عروج و زوال کے علاوہ کارگاہ حیات اور فطرت کی بوقلمونی سے متاثر ہوتا ہے اور پھر تخلیقی عمل کے دوران اس کے رد و قبول کا اظہار بھی کرتا ہے۔ چونکہ موجودہ عہد میں انٹرنیٹ کی سہولیات کی بدولت دنیا ایک

عالمی گاؤں کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ ایک تخلیق کار یا فن کار کی آفاقی اور عالمی حالات اور واقعات پر دسترس سہل ہو گئی ہے جس کی وجہ سے موجودہ دور کے شعرا اور ادبا کی تخلیقات میں موضوعات اور مضامین کے یکساں اور یک رنگ ہونے کا اگر کسی حد تک احتمال یا امکان بھی ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود ہر کسی کا لب و لہجہ، اسلوب اور پیش کش بہر حال ایک دوسرے سے جداگانہ اور مختلف ہوگی اور وہی انفرادیت اس کی شناخت بھی ہوگی۔ اس کسوٹی پر جب ہم خالد بشیر احمد کی شاعری پر کھتے ہیں تو یہ بات ابھر کر سامنے آتی کہ ان کی شاعری مقامیت یا علاقائیت کی سطح سے نہ صرف بلند ہے بلکہ اُس کا کینوس آفاقی، ہمہ گیر اور عالمی ہے اور اس کا مطالعہ اسی تناظر کا متقاضی بھی ہے۔

جہاں تک خالد بشیر احمد کی شاعری کا تعلق ہے اُن کے اولین شعری مجموعہ 'صدائے نیم شب' اور دوسرے شعری مجموعہ 'خواب پارہ' کی اشاعت کے درمیان پچیس برس کا وقفہ ہے۔ ان دونوں مجموعوں کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے وقت اگر کوئی ان کا آپس میں تقابل یا موازنہ کرے تو یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان دونوں تخلیقات میں پچیس سال کے طویل بعد کے باوجود نہ صرف بے حد ہم آہنگی اور مماثلت پائی جاتی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب رہے گا کہ خالد بشیر احمد کا دوسرا شعری مجموعہ 'خواب پارہ' ان کے پہلے مجموعہ 'صدائے نیم شب' کی شاعری کی توسیع اور توضیح ہے۔ ہاں دونوں میں ایک واضح فرق ہے کہ خواب پارہ کی شاعری میں عصری حیثیت کا برجستہ، برملا اور شدید اظہار ملتا ہے، جب کہ صدائے نیم شب میں فقط رمز و ایما سے کام لیا گیا ہے۔

خالد بشیر احمد کی شاعری کے مجموعی مطالعہ سے یہ آگاہی ہوتی ہے کہ انہوں نے اپنے اشعار میں جن الفاظ اور تراکیب کا استعمال کیا ہے اُن سے بقول پروفیسر حامدی کا شمیری "اُن کے ذاتی تجربوں کی تیز کرنیں پھوٹی ہیں اور قاری کی احساساتی فضا کو روشن کرتی ہیں۔"

چنانچہ ان کی شاعری میں دستک، پرندہ، سورج، دھوپ، پیڑ، خوشبو، موسم، گھر، کھڑکی، جنگل، بارش، خواب، خوشبو کا رنگ، خوشبو کا رقص، ہوائے بلا، بریدہ جسم، حصارِ گل، وصلِ رُت کا سمندر، رفاقتِ دھنک، فصلِ سر، ہجر کا موسم، خوشبو کی آواز، زلزلہ، شب کی فصل

لنگڑاٹٹا، آگہی کے پیسمبر، اداسیوں کے تختستان، حصارِ آب، ننگے شجر، صحرائے بدن، اُوزون کا چھید، دوستی کا کمپیوٹر، وائرس، فون اور ٹرین وغیرہ الفاظ اور تراکیب کا ایسا موزوں اور بر محل استعمال ہوا ہے کہ ان کی بدولت جہاں ان اشعار کے معانی اور مفہام میں گہرائی، گیرائی، وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی ہے وہاں ساتھ ہی بڑے دل چسپ شعری پیکر بھی ابھرے ہیں۔

تمام شب دستکوں پہ دستک وہ دے رہا تھا
میں گھر کا دروازہ بند کرتے ہی سو گیا تھا

(صدائے نیم شب صفحہ-۱۵)

اس شعر میں ایک ایسے گھر کے مکین کی فارغ البالی اور بے فکری کی عکاسی کی گئی ہے جس کے دروازے پر کوئی دستکوں پہ دستک دے رہا ہے مگر اُسے دستک دینے والے کی کوئی پرواہ نہیں ہے کیونکہ وہ دروازہ بند کرتے ہی سو گیا ہے۔ اس کی بہ نسبت خواب پارہ کے اس شعر میں جن لوگوں کا ذکر ہے اُن کے دل میں ابتدائے شب سے ہی بہت خوف ہے۔ چنانچہ اُن کے نیند کی نعمت سے محظوظ ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

دیارِ خواب کے ہم شب گزیدہ لوگوں کے
دلوں میں خوف بہت ابتدائے شب سے ہے

(خواب پارہ صفحہ-۱۲)

تمام رات ستاروں سے گفتگو کی ہے
بڑے حسین خیالوں میں دن کو سویا ہوں

(صدائے نیم شب صفحہ-۲۳)

لیکن 'خواب پارہ' کے اس شعر کے مطابق واحد متکلم کو دن تو دن رات کو بھی نیند کی چمکی لینا نصیب نہیں کیونکہ

شکست خواب کا منظر ابھی نظر میں ہے
میں سو رہا ہوں مگر آنکھ کس سفر میں ہے

(خواب پارہ صفحہ-۱۱۰)

سنائی دیتی تھیں مضطرب سی صدائیں شب بھر
کوئی پرندہ کہ راستے میں بھٹک گیا تھا

(صدائے نیم شب صفحہ-۱۵)

’خواب پارہ‘ کے پرندوں کی صدائیں سنائی دینا تو درکنار وہاں تو پھولوں کی خوشبو بھی

مفقود ہے

پھولوں نے بھی خوشبوئیں چھپالی ہیں تہوں میں
اب خال ہی آتی ہے پرندوں کی صدا بھی

(خواب پارہ صفحہ-۲۰)

وہی سماں ہے، وہی پیڑ ہے، وہی موسم
گئے برس کا پرندہ نظر نہیں آتا

(صدائے نیم شب صفحہ-۱۷)

یہ حال صدائے نیم شب کے پرندے کا ہے اور یہ بات بھی گئے برس کی ہے۔ اس
کے برعکس ’خواب پارہ‘ کے پرندے کو اب نہ صرف ناموافق حالات کا سامنا ہے بلکہ اسے اپنے
پروں سے آگے کا بھی سوچنا ہے

ہوا کا رخ بھی مخالف گھنیرے بادل بھی
پرندے سوچ لے اپنے پروں سے آگے بھی

(خواب پارہ صفحہ-۲۱)

دیکھے گئے ہیں غول پرندوں کے شہر میں
اب کے سروں پہ موسم آفات ہی نہ ہو

(صدائے نیم شب صفحہ-۵۱)

وہ فصل سر ہے جہاں تک نگاہ جاتی ہے
جو رہ گزر ہے وہی قتل گاہ جاتی ہے

(خواب پارہ صفحہ-۴۴)

اتنا ہی نہیں بلکہ بستی والے تو سروں سے آگے بھی بہت کچھ لٹا چکے ہیں
 لہو لہو تھے مناظر گھروں سے آگے بھی
 لٹا چکے تھے بہت کچھ سروں سے آگے بھی

(خواب پارہ صفحہ-۲۱)

بھنڈ کے جھنڈ اُداسی کے پرندے اترے
 دل کسی ٹھہری ہوئی جھیل کا منظر سا ہے

(صدائے نیم شب صفحہ-۱۸)

اُداسی کے پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ جب اترے تو ایسا لگا جیسے دل کسی ٹھہری ہوئی
 جھیل کا سا منظر پیش کر رہا ہو، لیکن اب کے عجیب رُت میں پھول کھلے ہیں اور شوق کا پرندہ نہ
 صرف آمادہ انتقال ہے بلکہ وہ تو اٹھان میں ہی انتقال کرتا ہے

عجیب رُت میں گلوں پر بہار آئی ہے
 پرند شوق کہ ہے انتقال آمادہ

(خواب پارہ صفحہ-۲۲)

تیرا خیال بڑا خوشنما پرندہ تھا
 مگر اٹھان میں ہی انتقال اس نے کیا

(ایضاً، صفحہ-۱۹)

اور جب کبھی شاعر کو گزرے موسم کے ایک دو پہلو ہمدردانہ لگے تو ان کی وجہ سے اس
 کا اڑنے کو جی کرنے لگا۔ اُسے کبھی پرندوں کی طرح آسمانوں کے سفر پر جانے کا خیال آتا ہے
 اور کبھی یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ مہاجر پرندے، ہوا اور خوشبوئیں کیا کہیں کسی کے روکنے سے
 رکتی ہیں؟

پھر پرندوں کی طرح اڑنے کو جی کرنے لگا
 ایک دو پہلو گئے موسم کے ہمدردانہ تھے

(خواب پارہ صفحہ-۵۴)

آسمانوں کے پرندوں کی طرح
اب ہواؤں کے سفر پر جاؤں میں
(ایضاً، ۶۴)

مہاجر پرندے، ہوا، خوشبوئیں
کبھی روکنے سے رکا ہے کوئی
(ایضاً، ۶۵)

سورج اجرام فلکی کا ایک ایسا ہم سیارہ ہے جس کی عدم موجودگی میں دُنیا کے کسی بھی
خطہ میں زندگی کا تصور ہی ناممکن ہے۔ خالد بشیر نے 'صدائے نیم شب' میں سورج کا مضمون جن
مختلف انداز سے باندھا ہے وہ ملاحظہ ہوں:

شب کی فصیل سامنے پھیلی ہوئی تو تھی
سورج تصورات کا اُترا ہوا نہ تھا
(ص-۱۶)

روشنی میرے گھر ٹھہرے گی
سورج دیکھ کے جلتا ہوگا
(ص-۳۳)

دھوپ میں کیا زہر بھرا ہے
سورج کس بستی چکا ہے
(ص-۳۵)

بند کمرے میں جھانک کر سورج
کھڑکیوں سے لپٹ کر ہنستا ہے
(ص-۳۶)

صبح کا سورج یہاں تنہائیاں پھیلانے گا
رات کی تاریکیوں میں شہر ہی مٹ جائے گا
(ص-۳۷)

سورج بھی سب کے ساتھ تماشائیوں میں تھا
میرا بھی نام شہر کی رسوائیوں میں تھا

(ص-۴۴)

منظر تمام دل کے افق پر رقم ہوا
روشن کسی کی یاد کا اک آفتاب تھا

(ص-۵۰)

یہ برفیلی تہائیاں جم گئیں
کہیں سے انہیں اپنا سورج دکھا

(ص-۵۴)

بہت دنوں سے جسے دیکھنے کی خواہش تھی
وہ آفتاب جو نکلا تو سورہا تھا میں

(ص-۶۲)

خالد بشیر احمد نے اپنے دوسرے مجموعہ کلام 'خواب پارہ' کے مختلف اشعار میں 'سورج' کا مضمون
جیسے باندھا ہے اس سے ان کے تجربات، مشاہدات اور خلاقی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

زمین پہ موسمِ ظلم و ستم ہے وہ، جس کے
دھوئیں میں دیدہ ہر مہر و ماہ جاتی ہے

(ص-۴۴)

آج بھی میں نے سورج چاند کی خواہش کی
آج بھی جھولی میں لے آیا ایک سراب

(ص-۴۶)

کھلی چھتوں سے وہ سورج کو تاکتا لحوں
پھر اپنی گود میں سر کو چھپائے روتا تھا

سفر عجیب تھا، میلوں پہ دھوپ پھیلی تھی
اور اس کے بعد گھنا سلسلہ درختوں کا

(ص-۱۱۹)

پیڑ، موسم، پھول اور خوشبو کے تعلق سے جو اشعار شاعر موصوف کے پہلے شعری
مجموعہ 'صدائے نیم شب' میں موجود ہیں، وہ یقیناً دوسرے شعری مجموعہ 'خواب پارہ' سے مختلف
ہیں۔ مگر حقیقتاً وہ اسی کا پیش خیمہ ہیں:

خوشبو تھی یا ہوا تھی مرے دل کے آس پاس
کیا تھا کہ جس کا نام بھی سوچا گیا نہ تھا

(ص-۱۲۰)

وہی سماں ہے وہی پیڑ ہے وہی موسم
گئے برس کا پرندہ نظر نہیں آتا

(ص-۱۲۱)

وہ جو بچھڑا تو اک لفظ نہ بھیجا لکھ کر
پچھلے موسم میں مجھے اُس نے بہت چاہا ہے

(ص-۱۸)

طوفان کے بعد زور ہواؤں میں کم ہوا
تیری وفا کا دور بڑا موسمی رہا
ایسا ہوا کہ راستے سرسبز ہو گئے
اک پیڑ برگ برگ کھڑا سوکھتا رہا

(ص-۲۰)

تنہا پیڑ ہوں چوراہے کا
بچوں کی زد میں آیا ہوں

(ص-۲۲)

جس کے چہرے پر ہمیشہ پھول ہی کھلتے رہے
اُس کے سینے میں گراک زخم بھی گہرا ہی تھا

(۲۵-ص)

پھر اس کے بعد کوئی شاخ بھی کھلی ہی نہیں
لہو وہ اس طرح ہر پیڑ سے نچوڑ گئے

(۳۰-ص)

زخم پھولوں سے کھلیں درد ہوا لے آئے
موسم گل تیری یادوں کو اڑا لے آئے

(۳۱-ص)

گزشتہ رات سے سوکھے شجر کی ٹہنی پر
وہ خوش جمال پرندہ بھی آ کے بیٹھا ہے

(۳۲-ص)

پُر امن شہریوں کا مقرر ہوا امیر
کل سب کے پیش پیش جو بلوائیوں میں تھا

(۳۳-ص)

موسم نے میرے واسطے یہ فیصلہ لکھا
ننگے شجر پہ وصل کی برسات ہی نہ ہو

(۵۱-ص)

مندرجہ بالا مضامین کے حامل کچھ اشعار خواب پارہ سے بھی ملاحظہ ہوں تاکہ قاری
دونوں کے مابین امتیاز کر سکے

گلاب جسم سے، خوشبو تمام لب سے ہے
وہ شخص جیسے گلوں کے حسب و نسب سے ہے

(۱۴-ص)

وہ شخص پھول سا خوش رنگ بھی، ملائم بھی
 کہ جس کے ہوتے سکوں دل کا پارہ پارہ ہے
 (ص-۱۵)

جنگل، بارش، بھینی خوشبو، گھاس ہری
 ایسا منظر اور آنکھوں کی پیاس ہری
 دل کے رشتے ٹوٹنے سے کب بھولتے ہیں
 ان پھولوں میں رہتی ہے بو باس ہری
 (ص-۱۷)

کبھی کسی نے کیا خوشبو کا رنگ دیکھا ہے
 کہے سنے ہیں یہ سارے کتاب کے قصے
 (ص-۳۰)

اس کے خن نے پھول کھلائے ہزار رنگ
 خوشبو کا جان و دل پہ اثر دیر تک رہا
 (ص-۳۲)

صبا و گل سے ہی موسم کوئی حسین نہیں
 ترے خن سے بھی روشن ہیں رنگ و بو کے چراغ

ملے بھی اُس سے مگر کس طرح کے موسم میں
 دھواں دھواں ہیں رہ و رسم گفتگو کے چراغ
 (ص-۳۶)

اب اس زمین پہ خوشبو کا رقص ہونا ہے
 گلاب ہونٹوں پہ یہ سسکیاں نہیں ہوں گی
 (ص-۴۲)

میرے لیے تو سارے موسم ایک سے تھے
دریا پار اتر کر آگے صحرا تھا

(ص-۵۱)

کوئی خواب، نہ پھول نہ کوئی خواہش ہے
زیست ترے بن کتنی بے اسباب ہوئی

آتے جاتے سارے موسم ایک سے تھے
کوئی شاخ جلی، کوئی شاداب ہوئی

(ص-۶۰)

پھول، دھنک، خوشبو، تتلی
یہ القاب تمہارے نام

(ص-۶۸)

ایک خوشبو ہی میرے غم کا مداوا ہوگی
کیا کوئی اس کو مرے پاس ٹھہرنے دے گا

(ص-۹۱)

خالد بشیر احمد جدید حسیت کے شاعر ہیں۔ وہ قدیم روایتی، کلاسیکی اور موجودہ دور کے جدید شعرا دونوں سے متاثر ضرور ہیں مگر ان کے شعر کہنے کا اپنا ایک خاص اور منفرد انداز اور اسلوب ہے۔ ان کے اشعار کا مطالعہ قاری کو کچھ لمحوں کے لیے توقف کرنے پر مجبور کرتا ہے تاکہ وہ زیر مطالعہ شعر یا اشعار کو ایک بار پھر پڑھے اور ان کے تہہ در تہہ معانی اور مطالب پر از سر نو غور کر کے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ ان اشعار میں شاعر حقیقتاً کیا کہنا چاہتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خالد بشیر احمد نے اپنے اشعار میں جتنی تجربات کو بالکل انوکھے اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ جس طرح روایتی اور کلاسیکی شاعری محبوب، حُسن، عشق، محبت اور تصوف کے موضوعات کی حامل رہی ہے، اسی طرح جدید دور کی شاعری میں بھی کم و بیش یہی موضوعات کار

فرما ہیں لیکن اسلوب اور انداز مختلف رہا ہے۔ میر تقی میر کا مشہور شعر ہے

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے

پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

لیکن جدید شعرا کے یہاں پنکھڑی کی نازکی پتھر اور پتھر کی سختی پانی میں تبدیل ہو

جاتی ہے اور عشق کا منتر فانی شے کو لافانی بنا دیتا ہے۔ خالد بشیر کا یہ شعر ملاحظہ ہو

پھول کو پتھر بنائے، سنگ کو پانی کرے

عشق وہ منتر ہے فانی شے کو لافانی کرے

(خواب پارہ صفحہ ۱۰۷)

خالد بشیر احمد کا تعلق اگرچہ ریاست جموں و کشمیر کی نئی نسل کے شعرا سے ہے مگر حقیقی

معنوں میں اُن کا شمار اُن کے عہد کے اُن مستند اور معتبر شعرائے میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی شاعری

میں جدید حسی تجربوں، فکری اور لسانی رویوں، اسلوب و اظہار کی تازگی، زبان و بیان کے ایجاز

و اختصار اور عصری آگہی کی بدولت اپنا لوہا منوایا ہے۔ میری اس دلیل کے شاہد اُن کے یہ

اشعار ہیں جن میں متعدد توجہ طلب تراکیب کے علاوہ اُوزون، کمپیوٹر، فون اور ٹرین جیسے جدید

تکنیکی عہد کے الفاظ کے حامل اشعار بھی آئیں گے۔ شاعر موصوف نے انہیں انتہائی معانی

آفرین اسلوب میں پیش کیا ہے۔

اُوزون کے پردے میں یہ جو چھید ہوا ہے

ممکن ہے اُتر آئے گی تاثیر دُعا بھی

وہ خواب رکھتا ہے، آنکھیں نکال دیتا ہے

اور اس ستم پہ بھی پُپ کا سوال دیتا ہے

وہ برگ گل کی طرح خار و خس سے خوشبوئیں

نچوڑ کر مجھے حیرت میں ڈال دیتا ہے

دوستی کا کمپیوٹر، اطمینان سے بھائی
اس کے سافٹ ویئر کو دائیں نہ ہو جائے

اب یہ لہو کا دور کوئی دن کی بات ہے
اتنا یقین معجزہ خواب گر میں ہے

ہوتا نہیں ہوائے بلا کا نزول کم
اس گل زمیں پہ کھلتے نہیں پھر بھی پھول کم

یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر
ہوتے ہیں حادثات سے اب دل ملول کم

لمبی تان کے سونے والو! تم کو جگانے کی خاطر
صورِ اسرافیل کی مانند آئے گا آوازہ کیا

یہ راستے کہ نہیں یوں ہی اس طرح روشن
کسی نے ان میں جلا رکھے ہیں لہو کے چراغ

بریدہ جسموں کے یہ اشتہار کن کے ہیں
کہاں کی میتیں، یہ سوگوار کن کے ہیں

کسی کا سر گیا ہے اور کسی کی عزت بھی
زمین گل تیرے دل میں مزار کن کے ہیں

فصیل شہر پر لہرا رہا تھا امن کا پرچم
درون شہر لیکن راستوں سے خون جاری تھا

وہ دن بھی دور نہیں جب کہ دستِ قاتل میں
تبر سنبھالنے کو انگلیاں نہیں ہوں گی

اب فون پر بھی تجھ سے ملاقات نہیں ہے
آسان سا یہ کام بھی دشوار ہے گویا

کون بھولے گا بھلا وہ ٹرین کا پہلا سفر
سو بہانے سے وہی چہرہ مکرر دیکھنا

ایسے ہنگاموں میں کیا گھر جاؤں میں
کوئی پتھر ہی لگا کر آؤں میں

پکی تھی فصل، زمینیں پڑی تھیں بے پہرہ
یہ سوچتا ہوں میں کیسے رہا گیا مجھ سے

خالد بشیر احمد نے اپنے اشعار میں روایتی شاعری سے ہٹ کر متعدد نئے اور نامانوس
الفاظ کے استعمال کا تجربہ کر کے جہاں شاعری کے دامن کو وسعت عطا کی ہے وہاں ان کی وجہ
سے نئے پیکر بھی تراشے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں زلزلہ، ہجوم شہر، بندوق، اُداسیوں کے
مختنان، لنگڑاٹنا، جھولتا تالا، فقرہ کسنا، بانجھ بادل، معبد مراسم کے کلس کا خم، بیٹوں کو قبروں
میں ڈالنا، پتھر مارنے کا فن، سپاہ دشمنان، نہاتی دھنک اور خیال یار کا مور جیسے الفاظ کے استعمال
کی بدولت بڑے خوبصورت، استعاراتی اور علامتی پیکر ابھرے ہیں۔

یہ زلزلہ بھی تباہی مچا گیا کیسی
مکان کھڑا تو ہے کمرہ نظر نہیں آتا

ایسا ہجوم شہر خیالات سے اٹھا
پل بھر میں ساری بستیاں ویران کر گیا

میرے ہی شانے پر بندوق رکھی تھی سب نے
مجھ پہ ہی خوف حریفوں کا بڑا طاری تھا

شعاع وصل سے اب مجھ کو کچھ تمازت دے
اداسیوں کے تختوں سے ہو کے آیا ہوں

لنگڑا سُکتا سوچ رہا ہے
سارا گاؤں کدھر گیا

گھر کی دیواریں بھی اندر سے ہوں گی منہدم
اور دروازے پہ تالا جھولتا رہ جائے گا

اسی پر یہ سب مشتعل ہو گئے
بس اک راہ چلتی پہ فقرہ کسا

بانجھ ہو گئے بادل، ندیاں بھی سوکھی ہیں
یہ ہری بھری وادی خار و خس نہ ہو جائے

زلزلوں کی زد پر ہے اور زمیں بھی چکی ہے
معبود مراسم کا خم کلس نہ ہو جائے

یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر
ہوتے ہیں حادثات سے اب ملول کم

ہم ہی پتھر مارنے کا فن بھول نہ جائیں
کون سی رت میں شاخوں پہ پھل پک جائیں

ہے فصیل شہر کے باہر سپاہ دشمنان
اے سپہ سالار! اپنا لاؤ لشکر دیکھنا

نہا رہی ہے دھنک بھگتے درختوں میں
خیال یار کوئی مور ہے کہ بن میں ہے

اس تحریر کی ابتدا میں یہ ذکر ہو چکا ہے کہ خالد بشیر احمد کے دوسرے شعری مجموعہ
'خواب پارہ' کی شاعری اُن کے اوّلین مجموعہ کی توسیع اور توضیح ہے۔ اس ضمن میں متعدد اشعار
بطور مثال پیش کیے جا چکے ہیں تاہم یہاں چند ایسے اشعار کا مزید حوالہ دیا جاتا ہے جن میں کسی
نہ کسی تعلق سے صرف گھر اور کھڑکی کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ ان کے مطالعہ سے شاعر کے دونوں
ادوار کی شاعری کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے

اب مرے ذہن میں اُس گھر کی بھی تصویر نہیں
ایک سایہ ہے کہ کھڑکی سے لگا رہتا ہے

(صن ش-۱۸)

یہ کن کی آنکھیں درپچوں سے لگ کے روتی ہیں
یہ خواب غنچے سر رہ گزار کن کے ہیں

(خ پ-۳۸)

تم جس پر کھڑکی کھولو گے وہ آواز کا دھوکا ہوگا
روشنی میرے گھر ٹھہرے گی سورج دیکھ کے جلتا ہوگا

(ص ن ش-۳۳)

دستک نہیں کسی کی، یہ جھونکا ہوا کا ہے
زنجیر در کے ساتھ پھر دھوکا ہوا کا ہے

تیری طرف جو یاد کی کھڑکی کھلی رہی
اس میں قصور مجھ سے زیادہ ہوا کا ہے

(خ پ-۲۷)

بند کمرے میں جھانک کر سورج
کھڑکیوں سے لپٹ کے ہنتا ہے

(ص ن ش-۳۶)

مدت سے جو بند پڑے تھے سارے درتچے کھول دیے
اب کمرے میں در آئیں گی دیکھو ہوائیں تازہ کیا

(خ پ-۳۳)

دل کی بستی کیا بستی ہے
گھر آگن سونا سونا ہے

(ص ن ش-۳۵)

کوئی کھیل نہ شور، نہ کوئی آن بن ہے
میرا دل اک سؤنے گھر کا آگن ہے

(خ پ-۷۸)

رات کو بارش سے بھیگا ہوں
ٹوٹی چھت کا گھر جیسا ہوں

(صن ش-۲۲)

نکلے تو سات رنگ کا موسم تھا ہم رکاب
گھر لوٹنے کی رت میں دریدہ لباس ہیں

(خ پ-۱۱۱)

اپنے ہی گھر میں مجھ کو نہ پہچان مل سکی
میرا شمار بس یونہی پر چھائیوں میں تھا

(صن ش-۴۴)

خالی گھر کے باہر بھی
کیوں آواز لگاتے ہو

(خ پ-۴۸)

کہاں لیے پھروں میں آرزوئے دل جاناں
یہ شوق پالنے کو ایک گھر بھی ہونا تھا

(خ پ-۴۹)

بھٹکتا پھر رہا ہوں راستوں پر
کہ جیسے گھر مکاں کوئی نہیں ہے

یہ کیسے شہر میں آیا ہوں میں بھی
یہاں تو ہم زباں کوئی نہیں ہے

(صن ش-۶۴)

یہ کیسا دشت کا چکر ہے میرے پاؤں میں
سفر تمام ہوا اور گھر نہیں آیا

نہ جانے کیسی کشش ہے کہ گھر ہوئے خالی
یہاں سے جو بھی گیا لوٹ کر نہیں آیا

(خپ-۵۰)

جس طرف جانے میں آسیب کا ڈر رہتا ہے
ایک سؤنی سی حویلی کا وہ درہوں میں بھی

(ص ن ش-۲۱)

آوازوں پر آسپی سناٹا ہے
کس گھر کی دیوار پہ لکھا اپنا نام

(خپ-۸۹)

دیوار و در کے ساتھ یہاں گھر بدل گئے
آنکھیں کھلیں تو رات کے منظر بدل گئے

(ص ن ش-۴۵)

آنکھیں بچھائے روزِ دیوار کے سوا
دستک کے انتظار میں درِ دیر تک رہا

(خپ-۳۲)

بچتی رہی ہیں رات بھر کمرے کی کھڑکیاں
احساسِ ہجرِ یار جگا کر گئی ہوا

(ایضاً، ۶۶)

میں نے کھڑکی کھول کے گزرے وقت میں جھانکا تھا
دھول شناسائی کی اڑ کر آنکھوں میں آئی

(ایضاً، ۷۰)

خالد بشیر احمد کے شعری مجموعہ 'صدائے نیم شب' کے آخر میں گیارہ آزاد یا نثری
نظمیں ہیں جو سب کی سب بغیر کسی عنوان کے ہیں۔ ان میں سے بیش تر منظومات

میں شاعر ”میں“ کی حیثیت سے مرکزی کردار کے طور پر موجود ہے۔
 ’خواب پارہ‘ میں غزلوں کے علاوہ حمد، نعت اور نظمیں ہیں۔ اس کی ابتدا میں دو ’حمد‘

ہیں اور دونوں وحدانیت کے اشعار سے مملو ہیں
 وہ پیاس دیتا ہے تو اُس کے بعد پانی بھی
 اسی یقین پر ہے میری خوش گمانی بھی

یہ رنگ سارے اُس کے زمیں پہ بکھرے ہیں
 ہرا بھی، لال بھی، دھانی بھی، ارغوانی بھی

نہیں ہے اُس کے سوا لائق سجود کوئی
 وہ لا شریک بھی، واحد بھی، غیر فانی بھی
 دوسری حمد کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

فرشِ زمیں تا عالمِ بالا اللہ تعالیٰ آپ کا نام
 سب سے ارفع، سب سے اعلیٰ اللہ تعالیٰ آپ کا نام

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک رہنے والی آپ کی ذات
 اُس کے بعد بھی رہنے والا اللہ تعالیٰ آپ کا نام
 ’خواب پارہ‘ میں ’حمد‘ کے بعد دو نعتیں شامل ہیں جو شاعر نے آقائے نامد صلی اللہ علیہ وسلم کے
 حضور میں اپنی عقیدت کے ارمغان کے طور پر پیش کی ہیں۔ اس شعری مجموعہ کے آخر میں
 قطعات اور فریادیں سے پہلے ’دُعا‘، والدہ مرحومہ کے نام، ادبی منظر نامہ، ایس پی کالج ترانہ
 اور میں نے خواب دیکھے ہیں کے عنوانات کے تحت پانچ نظمیں بھی شامل ہیں۔ ’دُعا‘ کے ان
 اشعار کو قبولیت کا شرف حاصل ہو چکا ہے۔

وہ عزم و حوصلہ ہمیں اے ذوالجلال دے
 سارا جہان جس کی ہمیشہ مثال دے

ایسا کبھی جہاں میں نہ پروردگار ہو
تیرے سوا کسی پہ کوئی انحصار ہو

دُنیا میں ماں سے کسے محبت نہیں؟ ماں لفظ ہی ایسا ہے جو انسان کو چلچلاتی دھوپ میں
ایک تناور اور چھتھنار پیڑ کا احساس دلاتا ہے۔ خالد بشیر احمد کی نظم 'والدہ مرحومہ کے نام' ماں سے
عقیدت، محبت اور ماں کی والہانہ شفقت کے اظہار کا ایک اعلیٰ مرقع ہے

دُنیا کی سب مائیں اچھی ہوتی ہیں
ان کے دشتِ شفقت گویا ایک دعا ہوتے ہیں
جن کے لمس سے سارے درد ہوا ہوتے ہیں
اولادوں کے حق میں سچی ہوتی ہیں
دُنیا کی سب مائیں اچھی ہوتی ہیں
میری پیاری اچھی ماں ا

تیری بہت تیرے صبر کو میرے لاکھ، کروڑ سلام
تیرا حقدِ خدایا سے ہے منور صبح و شام

خواب یاد میں ابھی نظر نہ لگے خون سے ملنے والی سڑک سے گھر پر ایک مختصر سی نظم
ہے جس میں خالد بشیر احمد نے ہر گھنٹہ کی اردو سے شام سالی، اردو کے نام پر معرٹوں و ہونو
میں آنے والی ہم تہذیبی انسانوں اور خواہ مخواہ فرشتوں کی طرح فرطی اذہوں، شاعروں
اور نقادوں کی چھائی میں کھڑے کھڑے کاٹنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ان کا تخلیقی کردہ
نہیں ہے کالجِ زمانہ بھی موجود ہے جو ۱۹۵۵ء میں سری ناپ کالج کی صد سالگرہیات کے
موقع پر جاری کیا گیا تھا جس نے خواب دیکھے ہیں ان کی ایک اور بالی بالی نظم ہے جس میں
انہوں نے فقط اپنے خواب بیان کیے ہیں جو حقیقت اور زمانہ کے انحراف کے ایک حسین
مرقع کی صورت تو اختیار کرتے ہیں مگر تعبیر سے ہم کنار نہیں ہوتے۔ خیر خواب تو بہر حال
خواب ہیں اور جب انہیں دیکھنے کا ہر کسی کا حق ہے تو پھر خالد بشیر احمد کو کیوں نہیں؟ ان کے تو
مجموعہ کلام کا نام ہی خواب پارہ ہے۔

احتجاجی لب و لہجہ کا شاعر

ڈاکٹر فرید پربتی

جہوں و کشمیر کے ادبی منظر نامے پر ابھرنے والی جن آوازوں نے فوراً اپنی جانب متوجہ کیا اُن میں خالد بشیر احمد کا نام سرفہرست ہے۔ اُن کا لہجہ تازہ کاری کے ساتھ ساتھ خلوص، بے ساختگی اور اعتماد کی قوتوں سے مزین ہے۔

خالد بشیر احمد کا پہلا شعری مجموعہ 'صدائے نیم شب' کے نام سے ۸۰ء کے آس پاس منصہ شہود پر آیا تھا جس کی ریاست اور بیرون ریاست کے ادبی حلقوں میں اچھی خاصی پذیرائی ہوئی تھی۔ اُن کا دوسرا شعری مجموعہ 'خواب پارہ' اُن کے ۲۵ سال سے زائد کی زندگی کا ثمرہ ہے۔ خالد بشیر احمد کی شاعری کی پہلی خوبی جو فوراً اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ اُس کا بے ساختہ پن اور فنی ارتکاز ہے اور وہ اپنے تخلیقی اظہار کے لئے اپنی زبان خود ہی وضع کرتے ہیں۔ وہ اتنی آسان اور تازہ کار زبان اپنے شعری اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں جو سہل ممتنع کی حدوں کو چھوٹی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہر خود آگاہ تخلیق کار اپنے تخلیقی اظہار کے لیے اپنی زبان خود ہی خلق کرتا ہے۔ ناسخ، غالب، مومن، داغ، یگانہ اور اقبال اپنے عہد کی زبان کو بعینہ شعری اظہار کے لیے بروئے کار نہیں لائے بلکہ نئے آب و رنگ سے آراستہ کر کے تولدِ دیگر کے عمل سے گزار کر نئی جہتوں سے آشنا کیا جس میں قدامت کی آن بان اور مجتمع کی تازہ کاری دونوں حوادث ہیں۔

خالد بشیر احمد بھی اپنے شعری اظہار کے لئے منفرد زبان خلق کرتے ہیں۔ جس میں آن بان، تازہ کاری اور قدیم وجدید کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات عیاں

ہو جاتی ہے کہ وہ لکیر کے فقیر قسم کے تخلیق کار نہیں بلکہ خود آگاہ اور تخلیقی صلاحیتوں سے یاد رہی ہیں۔ اس کے برعکس اُن کے ہم عصروں اور ہم آوازوں کے یہاں تکلف، ادراک، یکسانیت اور خارجیت پائی جاتی ہے۔

قرین جاں کھلے ہیں جیسے یاسمین و گلاب
یہ کس کمال کی خوشبو گلِ سخن میں ہے

ایک عصر میں عام انسان کو کن مصائب و مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے اور اس عصر میں اقدار کی پامالی کے کیا اسباب و عوامل ہیں اُن سے واقف ہونے کے لیے اُس زمانے کا تخلیقی ادب ہمارا معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ ایک مؤرخ خاص واقعات کو ہی تحریر میں لاتا ہے جب کہ ایک تخلیق کار عوام کے ساتھ زیست کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اُس کے یہاں جذبات کے ساتھ ساتھ عصری تقاضے جاہِ جاہلوہ نمائی کرتے ہیں۔

ایک عصر کا تخلیقی استعارہ ایک عصر کی یافت میں مدد دے سکتا ہے۔ اسی وجہ سے تخلیقی ادب میں نہ ماہٹ، احتجاج اور تیور ایک دوسرے میں ہم دیگر پیوست ہوتے ہیں۔ ہمارا عصر اُتھل پُتھل اور آشوب کا عصر ہے۔ اس آشوب اور اُتھل پُتھل کا بالواسطہ اظہار تخلیقی ادب میں پایا جاتا ہے۔ خالد بشیر احمد کا احتجاجی لب و لہجہ اُن کی شاعری کوئی جہتوں سے آشنا کرتا ہے۔

بہت دنوں سے سپاہِ جنوں کے ہاتھوں نے
گلی گلی میں فروزاں کیے ہیں ہو کے چراغ

یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر
ہوتے ہیں حادثات سے اب دل ملول کم

بڑا ادب خارجی اور عارضی حقائق سے ضرور اخذ و استفادہ کرتا ہے مگر وہ ارضی وزمینی حقائق کو ہمیشہ استعاروں اور علامتوں کا پہناوہ عطا کرتا ہے۔ علامت کا دائرہ کار استعارہ سے وسیع تر ہے۔ ایک خود آگاہ تخلیق کار کبھی بھی اور کسی بھی حال میں حقائق کو جوں کا توں بیان نہیں کرتا بلکہ علامتوں کی پرتیں اُس پر چڑھاتا ہے۔ تخلیقی ادب کی جمالیاتی آگہی حاصل کرنے کے

یہ علامتوں اور اُن پیکروں سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا جو تخلیقی عمل کے دوران معرض وجود میں آتے ہیں جو اُن کی شاعری میں تنوع پیدا کرتے ہیں۔ موج، ہوا، چراغ، سیاہ، جنوں، پھول وغیرہ کے ذریعہ ان کے یہاں جو پیکر ابھرتے ہیں وہ متحرک نظر آتے ہیں جن سے خالد بشیر احمد کی آگہی کا پتہ چلتا ہے۔

گلاب چہرے پہ رنگِ ملال روشن ہے

طلوعِ ماہ کے باہم زوال روشن ہے

خالد بشیر احمد کی غزلوں کا احتجاجی لب و لہجہ اُن کی شعری قوت کا پتہ دیتا ہے۔ اُن کے یہاں ٹھہراؤ نہیں بلکہ پھیلاؤ ہے۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ چوں کہ اُن کے یہاں حقائق سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ پایا جاتا ہے اسی وجہ سے اپنی شاعری کے ڈانڈے تصوف یا ماورائیت سے نہیں ملاتے۔ یہ اُن کے تخلیقی اعتماد کے اختصاصی پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔

ذرا سی بات پہ کیا ذل کو آبدیدہ کریں

یہ بے وفائی تو اس شہر کے چلن میں ہے

خالد بشیر احمد عام طور سے مطبوعہ مانوس اور مترنم اوزان استعمال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کے یہاں ترنم خیزی اور غنائیت جا بہ جانظر آتی ہے۔ شاعری میں ولی، حاتم اور سراج کے یہاں عام طور پر اُن اوزان کو مستعمل سمجھا گیا ہے جن میں گیت پن ہو اور جو کافی مترنم ہوں۔ اسی وجہ سے ہمارے قدیم شعرا نے ان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ خالد بشیر احمد بھی اس گروہ سے اچھی طرح واقف ہیں جو اُن کی شعری صلاحیتوں کو اجاگر کرتی ہے۔ مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ اس مختصر سے جائزے سے خالد بشیر احمد کی شاعری کا حق ادا نہیں ہوگا۔ پھر بھی میں نے حتی الامکان ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔

مجھے امید ہے کہ خالد بشیر احمد کا یہ مجموعہ خواب پارہ ریاست میں ہی نہیں بلکہ بیرونِ ریاست کے سبھی ادبی حلقوں میں سراہا جائے گا۔

خالد بشیر احمد - صدائے نیم شب اور خواب پارہ کا شاعر ڈاکٹر شفیق سوپوری

جہوں و کشمیر کے اردو شعراء کی صف میں خالد بشیر احمد ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے شاعری کا آغاز ۱۹۸۰ء سے قبل کیا اور ابتداء میں ہی ان کی مقبولیت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ مظہر امام کو اپنے مضمون میں ان کا ذکر ان الفاظ میں کرنا پڑا:

”نسبتاً نئے شاعر خالد بشیر کا ایک شعری مجموعہ جس میں ان کا ڈھائی سال کا کلام شامل تھا ’صدائے نیم شب‘ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کے کلام کا ایک سرسری مطالعہ زبان و بیان کے کچے پن کا احساس دلاتا ہے، لیکن کچے پھلوں کا بھی اپنا ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ ان کی بصری پیکر تراشی اکثر تصورات کی نئی گرہیں کھولتی ہے۔ وہ شناسا لہجے اور متوازی اسلوب کے شاعر ہیں۔“

خالد بشیر احمد کا اولین شعری مجموعہ ”صدائے نیم شب“ مارچ ۱۹۸۳ء میں شائع ہو کر آیا۔ اگر مظہر امام کی بات کو صحیح مان لیں تو اس مجموعے میں وہ شاعری شامل ہے جو خالد بشیر نے ۱۹۷۹ء سے لیکر ۱۹۸۲ء تک تخلیق کی۔ ظاہر ہے کہ اپنا ابتدائی کلام مجموعے کی صورت میں قارئین کے سامنے لا کر خالد بشیر نے نہ صرف اعتماد کا مظاہرہ کیا بلکہ ہمتِ مردانہ سے بھی کام لیا، ورنہ ہمارے بہت سے ایسے سخنور ہیں جن کی شاعری کا چرچا عرصہ دراز سے ہو رہا ہے مگر انہیں ہنوز اپنے کلام کو یکجا کر کے کتابی صورت میں چھپوانے کی نہ ہمت ہوئی اور نہ توفیق۔ ”صدائے نیم

شب“ کے بارے میں سب سے اہم بات جو کہی جاسکتی ہے یہ ہے، کہ اس مجموعے کو ریاستی کلچرل اکیڈمی نے سال ۱۹۸۴ء کے لیے بہترین کتاب کے اعزاز سے نوازا۔ اس بات سے ”صدائے نیم شب“ میں شامل کلام کی پختگی کا پتہ چلتا ہے اور جو مظہر امام نے یہ فرمایا ہے کہ ”اُن کے یہاں (صدائے نیم شب کے حوالے سے) زبان کے کچے پن کا احساس ہوتا ہے تو کسی بھی مبتدی کے کلام کے سرسری مطالعے سے ایسی رائے قائم کرنے کی توقع کی جاسکتی ہے اور پھر مظہر امام نے اس حقیقت کا بھی اظہار کیا ہے کہ خالد بشیر کی بصری پیکر تراشی اکثر تصورات کی نئی گرہیں کھولتی ہے اور وہ شناسا لہجے اور متوازی اسلوب کے شاعر ہیں۔ یہ کسی مبتدی کے بارے میں کہی گئی بڑی حوصلہ افزا بات ہے۔

خالد بشیر احمد ۱۹۹۰ء سے ۲۰۰۸ء تک (یعنی ’خواب پارہ‘ کی اشاعت تک) یہاں کے ادبی منظر نامے سے دور ہو گئے۔ بہت سے دوستوں نے اُن کی غیر موجودگی کو اس بات سے تعبیر کیا کہ اب ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ وہ کچھ دنوں کے لیے بزمِ سخن سے روٹھ کر اُٹھ گئے مگر اس دوران ان کا تخلیقی ذہن متحرک اور فعال رہا اور بزمِ سخن میں ان کی جگہ گرم رہی۔ اس بات کا ثبوت ان کا دوسرا مجموعہ کلام ’خواب پارہ‘ ہے جو ۲۰۰۸ء میں چھپ کر آیا اور جس کی اشاعت نے بہت سے اندیشوں اور وسوسوں کو غلط ثابت کیا۔ خواب پارہ کا مطالعہ اس بات کی دلیل فراہم کرتا ہے کہ شاعر کا فن ارتقائی مراحل سے گزر کر تکمیل یافتہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ خالد بشیر کی شاعری نہ صرف فکر کی بالیدگی اور بلندی بلکہ فن کی پختگی اور لہجے کی شرمیلی کے اوصاف سے مملو ہو گئی ہے۔

خالد بشیر احمد ایک صاف اور ستھرے اسلوب کے شاعر ہیں۔ اُن کا کلام ژولیدہ بیانی اور ابہام سے اپنا دامن بچا کر شاعر اور قاری کے درمیان ایک ایسے مکالمے کی صورت اختیار کرتا ہے جہاں مخاطب کی ذات مخاطب میں گم ہو جاتی ہے۔ کبھی کوئی شعر سہلِ منتع کی حدوں کو چھوٹا ہے اور قاری لفظوں کی حلاوت میں ایسے گم ہو جاتا ہے کہ معنی کی اور جہتوں پر غور نہیں کرتا:

کتنے ہاتھوں گزر گیا ہوگا

میری نظروں میں جو رسالہ ہے

دریا نے اپنی پیاس بجھائی کچھ اس طرح
بستی میں صرف میرا مکاں زیرِ آب تھا

جو بات کی وہی دل توڑ دینے والی کی
میں چپ رہا ہوں تو اس کا ملال اُس نے کیا

ہونٹوں کا ترے دل سے کوئی ربط نہیں ہے
اقرار بھی ایسا ہے کہ انکار ہے گویا

خالد بشیر احمد کی شخصیت کا ایک لطیف پہلو یہ بھی ہیں کہ وہ ایک مدت تک صحافت سے جڑے رہے۔ ادبی صحافت کے توسط سے ان کا تعلق اخباروں کے ساتھ بھی رہا ہے۔ انہوں نے کشمیر کے سیاسی حالات کا ایک صحافی کی طرح مشاہدہ کیا اور ان کا اظہار تخلیقی سطح پر ایک حساس شاعر کے طور سے کہیں علامتی اور کہیں استعاراتی پیرائے میں کیا۔ گزشتہ دہائیوں سے جن حالات سے اہل کشمیر دوچار ہیں، ان کی المناکی سے ہر حساس اور درد مند شاعر متاثر ہوا ہے اور ریاست جموں و کشمیر کے تقریباً ہر شاعر نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے عصر کے درد و کرب کا تذکرہ کیا ہے۔ عصری حسیت کے تعلق سے خالد بشیر احمد اس وجہ سے بھی زیادہ بیدار ہیں کہ انہوں نے کشمیر کی المناک سیاسی تاریخ کے دردناک ابواب کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ لہذا ان کے کلام میں جگہ جگہ اہل کشمیر کی حرماں نصیبی کا ذکر مختلف پیرایوں میں ملتا ہے۔ انہوں نے اپنی سرزمین کو خونین چادر کا کفن اوڑھتے ہوئے خود دیکھا ہے۔ مگر حالات و واقعات کی ترجمانی میں وہ راست بیانی سے بہت کم کام لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے استعارے اور ان کی علامتیں عالمگیر دردناکی کا مظہر بن جاتی ہیں:

کہانی کار! میرے شہر کے حوالے سے
نظر اٹھاتے شفق منظروں سے آگے بھی

کس جرم میں ہے حلقہ زنجیر میں ہوا
خوشبوؤں پر عتاب کیوں ہر رہ گزر میں ہے

ہوا گزر گئی بارش کے درمیاں ایسے
اڑا کے لے گئی جنگلی گلاب کے قصے

فیصل شہر پر لہرا رہا تھا امن کا پرچم
درون شہر لیکن راستوں سے خون جاری تھا

نفس مضمون کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہ چاروں شعر ایک ہی مضمون کی ترجمانی کرتے ہیں۔ خالد بشیر احمد کے مجموعے 'خواب پارہ' سے اگر ایسے اشعار کو الگ کر کے نکال دیا جائے تو ایک ایسے شہر آشوب کو مرتب کیا جاسکتا ہے جو کشمیر کی سیاسی بد نصیبی کی منہ بولتی تصویر کے طور پر پیش کرنے کے قابل ہوگا۔ متذکرہ بالا اشعار میں 'شفق منظروں'، 'خوشبوؤں پر عتاب' بارش کے درمیان ہوا کا گزر جانا، 'فیصل شہر پر پرچم امن لہرانے کے ساتھ درون شہر راستوں سے خوں جاری ہونا'... سخت آلام و مصائب کے استعارے ہیں جن کے آمیزے سے کئی صورتوں کو مجسم کیا گیا ہے۔

خالد بشیر احمد بنیادی طور پر نازک حالات کے شاعر ہیں۔ لہذا وہ اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے نازک پیکروں کی تشکیل کی ضمن میں فطرت کے گونا گون عناصر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اُن کے پیکروں کی تشکیل میں ہوا، بارش، دھوپ، خوشبو، پھول، موسم، سمندر، چاند وغیرہ جیسے الفاظ کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔ اس طرح سے خالد بشیر احمد کے پیکر مختلف حواس کو متحرک کر کے قاری کو اسی تجربے سے گزارتے ہیں جس تجربے سے شاعر خود گزر کے آیا ہے:

پھولوں نے بھی خوشبوئیں چھپالی ہیں تہوں میں
اب خال ہی آتی ہے پرندوں کی صدا بھی

تیری طرف جو یاد کی کھڑکی کھلی رہی
اس میں قصور مجھ سے زیادہ ہوا کا ہے

آنکھوں پر جب یاد کا موسم چھا جائے گا
دل آنگن میں سرسوں پھول مہک جائیں گے

یوں تو اس سوچ سمندر پہ کئی عکس اُگے
میں نے جس چاند کو آنگن میں اُتارا، تُو تھا

کنارِ آب بھی ہے، چاندنی بھی، جذبہ دل بھی
مگر چھستی ہے میرے یار، یعنی تیری خاموشی

خواب بچوں نے بنائے پھول ہیں
میڑھے میڑھے بھی مگر رنگین بھی

سبز موسم میں ہرے پتوں کو گرتے دیکھ کر
سوچتا ہوں اب، مرے شہبات بھی بے جانہ تھے
ان اشعار میں ”پھولوں نے خوشبو چھپائی تھوں میں“، ”یاد کی کھڑکی کھلنا“،
”آنکھوں پر یاد کا موسم چھا جانا“، ”سوچ سمندر میں کئی عکس اُگنا“، ”چاند کا آنگن میں اتر
آنا“، ”کنارِ آب، چاندنی، خاموشی“ خواب بچوں کا پھول بنانا، ”سبز موسم میں ہرے پتوں کا
گرنا“۔ پر غور کیجیے تو کئی پیکر بیک وقت مشکل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً
- پھول، خوشبو۔۔۔ بصری، شامعی، تھوں میں چھپانا۔۔۔ حرکی پیکر
- یاد کی کھڑکی کا کھلنا۔۔۔ بصری، حرکی پیکر

۔ آنکھوں پر یاد کا موسم چھا جانا۔۔ بصری، حرکی پیکر

۔ سوچ، سمجھ، عکس۔۔ بصری، اُگنا۔۔ حرکی پیکر

۔ کنار آب، چاندنی، خاموشی۔۔ بصری (کنار آب سے ظاہر ہے پانی کی روانی کا مشاہدہ بھی ہوگا اور قلیل آب بھی سنائی دیگی لہذا۔۔ سمعی اور حرکی پیکر

۔ خواب، بچوں کا پھول۔۔ بصری، بنانا۔۔ حرکی پیکر

۔ سبز موسم میں ہرے پتے۔۔ بصری، گرنا۔۔ حرکی پیکر

قابل غور بات یہ ہے کہ خالد بشیر احمد کے ہر پیکر میں حرکت کا عمل شامل ہے جس سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے تجربات، محسوسات اور مشاہدات کو متحرک بنا کر پیش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں قاری کے تمام حواس انگیزت ہو کر اُس پر حقائق کے اثر کا جادو جگاتے ہیں۔

خالد بشیر احمد کی شاعری کا مطالعہ کر کے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ ان کی شاعرانہ شخصیت، مزاج اور افتادِ طبع نیز تجربات و محسوسات حقیقی ہیں۔ ان کی فکر کی جڑیں زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہو کر ان کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ وہ بڑے خلوص کے ساتھ شاعری کی تخلیقی شرائط کو پورا کرنے کی کوشش میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ اُن کے مستعمل الفاظ، استعارے اور علامتیں زندگی کی حقیقتوں سے آب و تاب لے کر اپنے فکری آہنگ کو اس میں آمیز کر کے معاملاتِ زیست پر شاعرانہ اور دانشورانہ تبصرہ کرتے ہیں۔ ایسا کرنے میں وہ اپنے فن کو کمینٹ کے عنصر سے پاک رکھتے ہیں اور اس میں تازگی اور دلکشی کے ہزار پہلو بھر دیتے ہیں

خدا جانے کس کی نظر لگ گئی

تتفر تو اُس کے نفس میں نہ تھا

عیاری میں بھولے پن کی اتنی سی آمیزش ہے
چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی لڑ پڑتے ہیں میں اور وہ

وہ اتفاق بھی کرتا ہے اختلاف کی صورت
نہ جانے کس نے اُسے بدگماں کیا مجھ سے

بس ایک خوف سا اپنے تمام رشتوں کا
نہیں تو آپ ہی اپنے سے پیار کیا کرتے

معمولی باتوں میں بھی آجائے گا

میرا دل کیا اعلیٰ ذات براہمن ہے

خالد بشیر احمد کی شاعری دراصل اُس عظیم عقیدے پر استوار ہے جس کی شاخوں سے
انسان دوستی، حسن اور سچائی کی عقیدت اور صداقت و خیر کے گلابوں کی خوشبو آتی ہے۔ انہوں نے
ایک سچے فنکار کی طرح انسانی روح کو خلوص اور محبت کا پیغام دیا ہے۔ خالد بشیر کے یہاں زندگی
اپنی تمام تر نچاہت اور حقیقت کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ زندگی کے اس گہرے مطالعے میں وہ اپنے
حواس اور تجربات اور عرفان و ادراک کے درپے کھول کے رکھ دیتے ہیں۔ کارزارِ حیات میں
ان کی تنہائی کا کرب، تلاش و جستجو کی اذیت، انجانی اور انہونی وارداتوں کا خوف، اجنبی اشیاء سے
متعارف ہونے کا گھنا اور ڈراؤنا احساس۔ اس سب میں سچائی، خلوص اور صداقت نظر آتی ہے۔

نشان اپنے پیچھے راستے کے سب مٹا دیے

اور اب یہاں سے لوٹنے کا اختیار دے گیا

ہزار خواب اور اتنی ہی زخمِ تعبیریں

حسابِ زیست کا یہ میرا گو شوارہ ہے

دل کے رشتے ٹوٹنے سے کب بھولتے ہیں

ان پھولوں میں رہتی ہے یو باس ہری

میں اپنے اندر شریر لڑکا لیے چلا ہوں
مرے قریب و جوار میں کیا نمائش ہیں
خالد بشیر احمد کے یہاں اپنے دوسرے ہمعصر شعراء کے علی الرغم زندگی میں عشق کی
فضیلت، مرکزیت اور اذیت کا ایک مقدس جذبہ نظر آتا ہے۔ ان کا جذبہ عشق میر تقی میر کی خود
پسردگی کی حدود کو چھوٹا نظر آتا ہے جہاں:

دور بیٹھا غبارِ میر اُس سے

عشق بن یہ ادب نہیں آتا

کا فلسفہ روشن ہے۔ خالد بشیر احمد آدابِ عشق کو آدابِ غزل کی آبرو اور عظمت سمجھتے ہیں۔ یہی ان
کا فلسفہ عشق ہے جس کے ڈانڈے ان کے فلسفہ حیات سے ملتے ہیں:

مری کتاب کسی نے پڑھی نہیں لیکن

زبانِ عام پہ ہیں انتساب کے قصے

وفا کا دور ہے جب سے زوال آمادہ

یہ دل ہوا ہے زیادہ وصال آمادہ

جدائیوں کا یہ موسم بھی اپنی قسمت ہے

رفاقوں کے زمانے، نصیب تھے وہ بھی

ہم سے کہتے ہو محبت کا عوض ہے دردِ دل

ہم بھی اپنی قوتِ دل آزمائیں، بھیج دے

آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ خالد بشیر احمد انسانی حیات اور اسکے ماحول کے رشتوں کو
بالکل انوکھے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کی غزل میں داخلیت اور خارجیت کی تمام سرحدیں
ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کے کلام میں وہ سب کیفیتیں ہیں جن سے آج کے بد نصیب شاعر کو دو چار

ہونا پڑتا ہے:

مرا مزاج وہی نرم تُو ہے پہلے سا
وہ تیری بات میں ہی اشتعال ایسا تھا

اسی امید پہ دل کا سکون لٹایا ہے
عتابِ شب کا مداوا نئی سحر میں ہے

یہی تھی فکر چھپالیں دریدہ دامن کو
ہم ایسے وقت ستارے شمار کیا کرتے

ایک جگنو کی چمک باقی تھی وہ بھی کھو گئی
دور تک پھر جنگلوں میں راستہ کوئی نہ تھا

رنگ اور خوشبو کا شاعر۔ خالد بشیر احمد

ڈاکٹر پریمی رومانی

خالد بشیر احمد عصر حاضر کے ایک باصلاحیت شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی محنت، مسلسل ریاضت اور پورے انہماک کے ساتھ نئی اردو شاعری میں بہت ہی قلیل مدت میں امتیازی مقام پیدا کیا۔ انہوں نے اگرچہ بعض قابل مطالعہ نظمیں بھی لکھی ہیں مگر انکی پسندیدہ اور دلپذیر صنف غزل ہے۔ اس صنف سے انہیں فطری مناسبت ہے۔ وہ اپنے قلم کی جولانی اور فکر کی گہرائی سے اس میں نئے نئے رنگ بھرتے ہیں اور اردو شعر و ادب کی شاندار روایت کو آگے بڑھانے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتے۔ خالد ایک حقیقت پسند فنکار ہیں۔ انہوں نے اگرچہ اپنا ادبی سفر افسانہ نگاری سے شروع کیا لیکن بہت جلد وہ شاعری کی طرف مائل ہوئے اور اپنی غزلوں اور نثری نظموں سے قارئین کو محظوظ کرتے رہے۔ ”صدائے نیم شب“ ان کا اولین شعری پڑاؤ ہے جو مارچ ۱۹۸۴ء میں پہلی بار اشاعت پذیر ہوا اور اپنے گونا گوں شعری خصوصیات کی وجہ سے علمی و ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی نے ۱۹۸۳ء میں خالد کے اس شعری مجموعے کو گراں قدر اعزاز سے نوازا لیکن خالد کے لئے سب سے بڑا اعزاز یہ ہے کہ ان کی شاعری قارئین نے پسند کی اور اس کی کھلے دل سے داد دی۔ ”صدائے نیم شب“ کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو گیا جو میں خالد کی کامیابی کی ضمانت سمجھتا ہوں۔ پروفیسر حامدی کا شمیر صدائے نیم شب کے مقدمے میں رقمطراز ہیں:

”کشمیر کے نئے شعراء میں خالد بشیر بھی پورے انہماک لگن

اور آگہی سے اپنی ذات کے حوالے سے نئی حسیّت کی پیکر تراشی کر رہے ہیں۔ وہ ابھی چند برسوں سے لکھ رہے ہیں لیکن اُن کے یہاں شروع ہی سے لفظوں کے دشت و سراپ میں بھٹکنے کے بجائے چھوٹے چھوٹے جسی تجربوں کی باز آفرینی کا جو تجسس اور اشتیاق ملتا ہے وہ اُن کے روشن مستقبل کا پتہ دیتا ہے“

‘صدائے نیم شب‘ ۴۹ غزلیں، نثری نظمیں اور چند متفرق اشعار کا خوبصورت گلدستہ

ہے جو قابلِ مطالعہ ہے۔

خالد کا دوسرا شعری مجموعہ ۲۰۰۸ میں خواب پارہ کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ اُن کی رنگارنگ شاعری پر دال ہے۔ اس میں حمد، نعت، غزلیں، اختصاری غزلیں، نظمیں اور متفرقات شامل ہیں۔ اپنے ایک شعر میں خالد خواب پارہ کو یوں شاعرانہ پیکر عطا کرتے ہیں:

سوارِ آب کے زیرِ نظر کنارہ ہے

سفیرِ دشت کی آنکھوں میں خواب پارہ ہے

‘صدائے نیم شب‘ سے ‘خواب پارہ‘ تک خالد نے ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ انہوں نے اس دوران شعر کہنے کے ساتھ ساتھ تاریخ کے مطالعے سے بھی گہری دلچسپی لی اور دیدہ آبِ رواں کے نام سے ایک اور عمدہ کتاب منظر عام پر لائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کا بھی گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی غزلوں میں ڈھونڈنے اور تلاش کرنے کا عمل جا بجا ملتا ہے۔ خالد اپنی شاعری کے کینوس کو مختلف رنگوں سے مزین کرتے ہیں اور اپنے فن کو تازگی اور توانائی عطا کرتے ہیں۔ سہ ماہی، لمحے، لمحے، بدایوں میں اُن کے حسی تجربات کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ اُن کی آواز جدید غزل کی تندرست اور توانا آواز ہے۔ غزل کے منظر نامے پر ابھرنے والی یہ آواز تقلید سے زیادہ اجتہاد کی طرف مائل ہے۔ صدائے نیم شب کے ہر صفحہ پر حسی تجربات کی ایک ایسی انوکھی اور چھوٹی ہوئی مثالیں موجود ہیں جو خالد بشیر احمد کے انفرادی رنگ و آہنگ کی غمازی کرتی ہے۔ اس ضمن میں اُن کے درج ذیل اشعار سے اُن کی شاعرانہ انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ مثلاً

سنائی دیتی تھیں مضطرب سی صدائیں شب بھر
کوئی پرندہ کہ راستے میں بھٹک گیا تھا

خود اپنا ہمسایہ بن کر
میں اپنے اندر رہتا ہوں

تمام وقت نظر ہٹ سکی نہ ہونٹ ہلے
بڑا عجیب ملاقات کا وہ منظر تھا

یوں میرا نام نہ اُونچا کر دو
میں کئی بار گرا ہوں اب تک

یہ سانحہ بھی میری زندگی میں لکھا تھا
تمہارے سامنے ہو کر بھی کچھ نہ کہنا تھا

خالد بشیر احمد کی شاعری میں عصری آگہی کا عرفان ملتا ہے۔ انہیں موجودہ دور کے
مسائل اور اُن سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کا بھرپور ادراک ہے۔ یہ چیز اُن کو اُن کے
معاصرین سے الگ اور انفرادی مقام عطا کرتی ہے۔ کیونکہ اُن کی شاعری اپنے اندر گہری
معنویت رکھتی ہے۔ اس میں جہاں ایک طرف فلسفانہ بوباس ملتی ہے وہاں دوسری طرف فکرو
نظر کی گہرائی اور احساس کی شدت بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن اس احساس کو جس زبان میں انہوں
نے اپنی غزلوں میں اُتار دیا، وہ اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ خالد کی
شاعری میں نئے اور تازہ کار فکری جذبات کے ساتھ ساتھ کلاسیکی شاعری کا بھرپور احساس ملتا
ہے۔ اُن کے خیالات میں پاکیزگی ہے وہ جچے تئے انداز میں بات کہنے کا گر رکھتے ہیں اور اپنی
شاعری میں تازگی پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنے کلیئے کو اشعار کی زبان دے کر یوں پیش کرتے ہیں:

میرے باہر سے ملا، میرا نہ اندر دیکھا
کیا عجب شخص تھا بس دُور سے چھوکر دیکھا

میں بہت دور گیا ہوں اب تک
تم سے لیکن نہ جدا ہوں اب تک

میں ہوں آواز مجھے قید نہ کر خوابوں میں
تُو ہوا ہے تو میرے در پہ ٹھہرتا کیوں ہے

فساد ہر طرف برپا ہے دِل کی بستی میں
ترا خیال بھی آکے کہاں پہ ٹھہرا ہے

ابھی ہے ذہن میں میرے گئی رتوں کی طرح
وہ میرا ساتھ نبھاتا ہے موسموں کی طرح

خالد بشیر احمد کی غزلوں میں جہاں تفکر کی سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے وہاں اُن کے خیالات کی پختگی اور شوخی کا گمان بھی ہوتا ہے۔ اُن کے ہاں طنز یہ لہجہ بھی ملتا ہے اور تلخی بھی، مٹھاس اور چاشنی بھی اور درد و غم کی ان گنت ٹیسیں بھی۔ حقیقت بیانی بھی اور تاثیر اور شدت بھی، شادابی بھی اور جہلم کی روانی بھی۔ بقول حامدی کا شیری اُن کی غزلوں میں ناصر کاظمی کی پہلی بارش کی غزلوں کے اثرات مرتب ہیں اور کئی جگہوں پر اُن کی آواز پر بعض دیگر شعراء کی صدائے بازگشت کا گماں ہوتا ہے۔ لیکن خالد کہتے ہیں کہ اُن کی یہ غزلیں شائع ہونے کے بعد ہی انہیں ناصر کاظمی کی شاعری کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ ایک جگہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”صدائے نیم شب کی شاعری کے حوالے سے جناب
حامدی کا شیری کو میرے لہجے، زبان اور طرزِ فکر پر جو ناصر کاظمی کے

اثرات نظر آئے ہیں۔ اُن کے بارے میں عرض ہے کہ یہ مجموعہ چھپنے
تک میں ناصر کاظمی یا اُن کی شاعری سے متعارف نہیں تھا۔ صدائے نیم
شب بازار میں آنے کے بعد ہی میں نے اُن کی غزلیں پڑھیں۔“

اس بات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خالد شروع سے ہی ذہین، بیدار مغز، پرگو
اور نئے تجربات سے ہم آہنگ ہونے والا شاعرانہ دماغ لے کے آئے تھے۔ اُن کی محنت لگن
اور خدا داد صلاحیت نے انہیں میں ایسی طاقت عطا کی ہے کہ اُن کا کلام شروع سے ہی قارئین کو
دعوتِ غور و فکر دیتا رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خالد مجھے ہوئے شاعر ہیں۔ اُن کے خیالات میں
پاکیزگی اور فنکارانہ چابکدستی ہے۔ اسی لئے اُن کی غزلیں زندگی کے قریب نظر آتی ہیں۔ اُن
کے مضامین کا انتخاب بھی آہستہ آہستہ روح میں اُترنے والا ہے۔ اُن کے الفاظ کی درو بست
انہیں معاصرین سے الگ اور منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ ”اسی لئے اُن کی شاعری عصر حاضر
کے ممتاز شعرا کے ہم پلہ نظر آتی ہے۔ اور جو خالد کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔“ مثلاً اُن
کے درج ذیل اشعار کو دیکھئے اور اُن کی ذہانت کی داد دیجئے:

سمندروں کی تہوں میں موتی چھپے ہوئے تھے
مگر میں ساحل کی سمت آتے تھکا ہوا تھا

یہ زلزلہ بھی تباہی مچا گیا کیسی
مکان کھڑا تو ہے کمرہ نظر نہیں آتا

تنہائیوں کے بعد ملاقات کیا ہوئی
پھر وہ سکوتِ آب میں ہلچل مچا گیا

خود اپنا ہمسایہ بن کر
میں اپنے اندر رہتا ہوں

گلاب جسم سے خوشبو تمام لب سے ہے
وہ شخص جیسے گلوں کے حسب نسب سے ہے

ہریالی اور تیرے لمس کا ذکر ہی کیا
دھوپ بھی آئے ہو کر تیرے پاس ہری

خالد کی غزلوں میں ڈرامائیت اور خود کلامی کا جذبہ ملتا ہے۔ اُن کے ہاں نہ صرف زندگی کے مختلف کردار نظر آتے ہیں بلکہ وہ ان کرداروں کے ذریعے سے ایک نہ ختم ہونے والی کہانی کو بھی جنم دیتے ہیں۔ اُن کے ہاں عمل اور رد عمل کا جوتا اثر ملتا ہے۔ وہ اُن کے ایک ایک لفظ کو حرکت اور حرارت بخشتا ہے۔ اپنے خوبصورت اشعار اور تشبیہات سے وہ اپنی شاعری میں احساس کی گرمی اور شدت پیدا کرتے ہیں۔ وہ خود اپنے آپ سے ہم کلام ہونے لگتے ہیں اور گھنٹوں اپنے آپ سے ایسے سوالات کرنے لگتے ہیں جن کا کوئی بھی حل نہیں۔ اُن کی غزلوں میں ابہام نہیں بلکہ وہ انسان کو ہر دم دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ شعری زبان استعمال کرنے کا خاص گُر رکھتے ہیں۔ اُن کی غزلوں میں بعض ایسی علامتیں ملتی ہیں، جن کو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں انوکھے پیکر عطا کئے ہیں۔ ان علامت میں گلاب 'آنکھ' رنگ، پرندہ، جنگل، مکاں، آب، شہر، سمندر، موسم، پتھر، چراغ، رات، وغیرہ ہیں جو خالد کی غزلوں کے نئے امکانات کی ضامن ہیں۔ پرندوں سے خالد کو خاص دلچسپی ہے۔ وہ اپنی اس پسندیدہ علامت کو نئے نئے پیکر عطا کرتے ہیں:

پھولوں نے بھی خوشبوئیں چھپائی ہیں تہوں میں
اب خال ہی آتی ہے پرندوں کی صدا بھی

محبتیں بھی نہیں اُن کو روک پائی تھیں
کہ شاخ شاخ کے ہی عندلیب تھے وہ بھی

آسمانوں کے پرندوں کی طرح
اب ہواؤں کے سفر پر جاؤں میں

مہاجر پرندے، ہوا، خوشبوئیں
کبھی روکنے سے رکا ہے کوئی

چھپھاتے ہیں کئی روز پرندے دل میں
وہ جو ملتا ہے تو کھلتے ہیں سویرے دل میں

تیرا خیال بڑا خوشنما پرندہ تھا
مگر اٹھان میں ہی انتقال اُس نے کیا

عجیب رُت میں گلوں پر بہار آئی ہے
پرند شوق کہ ہے انتقال آمادہ

خالد کے ہاں مضامین کی کمی نہیں۔ وہ ہر ایک چیز پر بہ غائر نظر ڈالتے ہیں اور نئے
نئے سوالات کے جوابات اخذ کرتے ہیں۔ اُن کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ غضب کا ہے۔ انہیں
روایات کا بھی احترام ہے اور اکیسویں صدی میں ہونے والی سائنسی پیش رفت کا بھی۔ دیکھئے
وہ رشتوں کی نزاکتوں کا خیال کیسے کرتے ہیں اور ہر ایک رشتے کو کیسے مقدس بنانا چاہتے ہیں۔
انہوں نے کمپیوٹر سافٹ ویئر اور وائرس کا استعمال کس خوبی سے کیا ہے اور اپنے خیالات میں
وسعت پیدا کی ہے۔ مثلاً

دوستی کا کمپیوٹر، اطمینان سے بھائی
اس کے سافٹ ویئر کو وائرس نہ ہو جائے
دیکھئے خوشبو کو وہ کیسے زبان عطا کرتے ہیں:

خوشبو کی آواز، ہوا کا جھونکا نام
اُس سیماب سراپا کو میں دوں کیا نام

ایک خوشبو ہی میرے غم کا مداوا ہوگی
کیا کوئی اُس کو مرے پاس ٹھہرنے دے گا

خوشبو ہے تو ہمسائے بھی معلوم کریں گے
یوں برگِ گل جاں کو بکھیرا نہیں ہوتا

وہی خوشبو وہی ریشم سی باتیں
ابھی ہوں خواب کی آوارگی میں

گلاب خالد کا پسندیدہ پھول ہے۔ وہ اس پھول کو ہر دیدہ نگاہ سے دیکھنے کے متمنی
ہیں اس کی خوشبو سے وہ لطف اندوز ہوتے ہیں اور یہ کہنے پر مائل ہوتے ہیں کہ
گلاب جسم سے، خوشبو تمام لب سے ہے
وہ شخص جیسے گلوں کے حسب نسب سے ہے
وہ رنگوں کا استعمال شعروں میں یوں کرتے ہیں:

یہ رنگ سارے اُسی کے زمیں پر بکھرے ہیں
ہرا بھی، لال بھی، دھانی بھی، ارغوانی بھی

خالد کی نظمیں بھی فکر انگیز ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر مختصر نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں
پابند بھی ہیں اور آزاد بھی۔ ان نظموں میں بھی شوخی، شگفتگی اور گہرائی ملتی ہے۔ اُن کا ایک وصف
یہ بھی رہا ہے کہ وہ بات کو پھیلانے سے گریز کرتے ہیں۔ اور اختصار سے کام لیتے ہیں، سچے
تلے انداز میں بات کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں بھی اُن کی غزلوں کی طرح فنکارانہ چابکدستی
ملتی ہے۔ وہ براہِ راست قاری سے مخاطب ہوتے ہیں۔ دُعا، والدہ مرحومہ کے نام، ادبی منظر
نامہ، ترانہ (ایس پی کالج)، میں نے خواب دیکھے ہیں اُن کے دوسرے شعری مجموعے 'خواب
پار میں شامل نظمیں ہیں۔ جو گونا گوں خصوصیات کی حامل ہیں۔ صدائے نیم شب میں اُن کی
نثری نظمیں نظر نواز ہوتی ہیں۔ جن کی اہمیت مسلم ہے۔ دیکھئے وہ مختصر الفاظ میں اپنی بات

کس طرح لوگوں تک پہنچاتے ہیں:

تم ایک پیڑ ہو

جو میرے اندر کی مٹی میں اُگ کر

اس قدر پھیل گیا ہے

کہ اس کی ٹہنیوں اور پتوں کے نیچے

میں کھو گیا ہوں

اپنی اس نظم میں انسانی زندگی کی تلخ حقیقت بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں

ایک بھونرا

جو کہ پھولوں سے بہت مانوس ہے

اُڑاؤ کر گلستان میں آ گیا

ایک دلکش پھول کے چاروں طرف

سینکڑوں ناکام چکر کاٹ کر

اس پریشانی میں ہے

سوچتا ہے

مجھ میں نامردی کا یہ عنصر نہ تھا۔

خالد بشیر احمد رنگ اور خوشبو کے شاعر ہیں۔ اُن کے ہاں خوشنما تراکیب اور

خوبصورت اور معنی خیز علامت ملتے ہیں۔ اُن کی نظمیں پڑھکر ذہنی آسودگی کا سامان مہیا ہوتا ہے۔

رمزیت کی چاشنی الفاظ کی جادوگری اور مترنم لہجہ خالد کی شاعری کا خاصا رہا ہے۔ اُن کی شاعری

میں گلاب، تتلی، پھول، بلبل، بہار، خوشبو، لال، دھانی، ارغوانی، ہریالی، دھوپ، چاند اور بے شمار

علامت ملتی ہیں جن کے استعمال سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ وہ رنگ اور خوشبو کے

شاعر ہیں۔ اُن کی شاعری ہر زمانے اور ہر دور میں تسکین کا سامان مہیا کرتی رہے گی۔ اور یہ کیا

کم اہم ہے۔

خالد بشیر 'خواب پارہ' کے تناظر میں

بیتاب جے پوری

سوارِ آب کے زیرِ نظر کنارہ ہے
سفرِ دشت کی آنکھوں میں خواب پارہ ہے
مذکورہ شعر کے خالق خالد بشیر احمد کا دوسرا شعری مجموعہ 'خواب پارہ' میرے زیرِ نظر
ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعہ کو ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی تھی اور جموں و کشمیر
کلچرل اکادمی نے اسے بہترین کتاب کے انعام سے نوازا تھا۔
جہاں تک خالد بشیر احمد کی ذات کا تعلق ہے، وہ فطرتاً خاموش طبع انسان ہیں۔ غیر
ضروری باتوں سے اجتناب ان کا خاص وصف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اختصار و
جامعیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ 'خواب پارہ' میں حمد اور نعت کی شمولیت اس بات کی غماز ہے کہ
خالد کے ذہنی سانچے کی تشکیل دینی ماحول میں ہوئی ہے اور انہوں نے جس انداز سے زندگی کو
دیکھا، زمانے کے رنگ و مزاج کو جانچا، پرکھا اور سمجھا ہے، حالات اور ماحول کے جبر و مفاہمت
سے گزر کیا ہے، وہی ان کے شعری منظر نامے کا حصہ ہے۔

لہو لہو تھے مناظر گھروں سے آگے بھی

لُٹا چکے تھے بہت کچھ سروں سے آگے بھی

'خواب پارہ' میں روایتی شاعری کی اعلیٰ قدریں بھی اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ
جلوہ گر ہیں تو جدید رنگ میں ڈھلی شاعری میں قلبی واردات کی گداختگی کے ساتھ ساتھ خارجی

تجربات بھی شامل ہیں۔ خالد کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ ہماری اور آپ کی شاعری ہے۔ موجودہ دور کے سلگتے ہوئے مسائل اور سماجی ناہمواریاں خالد کو طنز سے کام لینے پر اکساتی ہیں اور وہ طنزیہ ادبی منظر نامہ جیسی نظم نما غزل کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو کہ مجموعہ میں شامل ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مختصر یہ کہ خواب پارہ میں شاعر نے عصری مسائل، قدروں کی شکست و ریخت، ماضی کے ماحول کی شگفتگی اور دور حاضر کی تلخیوں کو اپنے شعروں میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

’خواب پارہ‘ میں 62 غزلیں اور 21 اختصاری غزلوں کے علاوہ حمد، نعت، چند نظمیں اور متفرقات بھی شامل ہیں جو قاری کو متاثر کیے بنا نہیں رہ سکتیں۔ ’خواب پارہ‘ پر اگر مکمل مضمون لکھنے کو کہا جائے تو ایک اور کتاب جنم لے سکتی ہے۔ خالد پیشہ سے صحافت کے قریب رہے ہیں اور ڈائریکٹر انفارمیشن کے عہدے سے حال ہی میں تبدیل ہو کر ڈائریکٹر آف لائبریریز تعینات ہوئے ہیں۔ یعنی آج کل وہ صحافت اور ادب کا سنگم بنے ہوئے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ’خواب پارہ‘ میں شامل چند غزلوں کے شعر پیش کر رہا ہوں تاکہ وہ خود فیصلہ کر سکیں کہ میزری اس عبارت میں کہاں تک سچائی ہے۔

دیارِ خواب کے ہم شب گزیدہ لوگوں کے
دلوں میں خوف بہت ابتدائے شب سے ہے

ہزار خواب اور اتنی ہی زخم تعبیریں
حسابِ زیست کا یہ میرا گوشوارہ ہے

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ خالد دل کے سادہ اور خاموش طبع انسان ہیں۔ اس شعر میں وہ اس بات کی تائید بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے یہ شعر اور کسی کے حوالے سے کہا ہے لیکن ان کی ذات پر پورا اترتا ہے۔

صورت سے معصوم تو تھا ہی لیکن وہ
بات کا سچا دل کا سادہ اور بھی ہے

دل کے رشتے ٹوٹنے سے کب بھولتے ہیں
ان پھولوں میں رہتی ہے بُوِ باس ہری

ہریالی اور تیرے لمس کا ذکر ہی کیا
دھوپ بھی آئے ہو کر تیرے پاس ہری

جو بات کی وہی دل توڑ دینے والی کی
میں چپ رہا ہوں تو اس کا ملال اُس نے کیا

تیرا خیال بڑا خوشنما پرندہ تھا
مگر اٹھان میں ہی انتقال اُس نے کیا

اس اشتیاق میں ساحل پہ آکے بیٹھا ہوں
کہ دیکھیں آج کیا دریا اُچھال دیتا ہے

بھلا دیا ہے مگر خواب بن کے لوٹے گا
کہ اُس کے کرتبوں کا احتمال روشن ہے

دہلیز کا چراغ بجھانے کے کھیل میں
تیرا بھی ہاتھ ہے کہ یہ تنہا ہوا ہے

کشمیر کے حالات سے شاعر متاثر ہو کر کہتا ہے
بقائے امن کو اک جان کی ضرورت تھی
سو، دوستوں کی نظر میں جواب میں ہی تھا

فصیل شہر پر لہرا رہا تھا امن کا پرچم
دروں شہر لیکن راستوں سے خون جاری تھا

خاموشیوں پہ ثبت ہیں شب خون کے ستم
آگ اور لہو کی داستان چشم تر میں ہے

میرے وطن میں سپاہ جنوں کے ہاتھوں نے
گلی گلی میں فروزاں کیے ہیں ہو کے چراغ

ہم ہی پتھر مارنے کا فن بھول نہ جائیں
کون سی رُت میں شاخوں پر پھل پک جائیں گے

بریدہ جسموں کے یہ اشتہار کن کے ہیں
کہاں کی میتیں، یہ سوگوار کن کے ہیں
حوالے کے طور پر آخر کتنے شعر دیے جائیں۔ اس لیے ان دو شعروں کے ساتھ ہی
قارئین سے رخصت چاہوں گا:

میری کتاب کسی نے پڑھی نہیں لیکن
زبانِ عام پہ ہیں انتساب کے قصے

مجھے خبر ہے زباں ساتھ دے نہ پائے گی
سو لکھ کے رکھ دیا ہے عرض حال لفظوں میں

خوشبو کا پیکر تراش۔ خالد بشیر احمد

جاوید انور

خالد بشیر احمد اردو زبان و ادب کی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے اردو نثر میں تاریخ نویسی کے اعتبار سے اور اردو نظم میں غزل اور دوسری اصناف میں اپنے ادبی تخلیقی ذہن کو قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ اس ضمن میں ایک لفظ ”خوشبو“ ہے جسے انہوں نے اپنے متعدد اشعار میں برتا ہے۔ انہیں میں سے ۳۵ اشعار کا انتخاب اور ان پر اظہار خیال اس مضمون کا موضوع ہے۔ ویسے تو ”خوشبو“ کی مناسبت سے جو موضوعات ذہن میں آتے ہیں، ان میں رومانیت اور مناظر فطرت کے مختلف گوشوں کا غلبہ ہوتا ہے۔ خالد بشیر احمد کے یہاں بھی یہ تمام موضوعات ہیں لیکن اسلوب ان کا اپنا ہے۔ ان کی تخلیقی حیثیت ایک شعر میں کئی معنوں کو پرودیتی ہے۔ کئی مقامات پر ایسے سوالات سامنے آتے ہیں جن کے جوابات تلاش کرنے کے لیے مختلف معنوی رخوں کی جانب سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس نوعیت کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں۔

خوشبو تھی یا ہوا تھی میرے دل کے آس پاس
کیا تھا کہ جس کا نام بھی سوچا گیا نہ تھی

کس جرم میں ہے حلقہ زنجیر میں ہوا
خوشبوؤں پر عتاب کیوں ہر رہگزر میں ہے

ایک خوشبو ہی مرے غم کا مداوا ہوگی
کیا کوئی اس کو مرے پاس ٹھہرنے دے گا

اسی کو ڈھونڈتے شب گرد ہوگئی خوشبو
کہیں پہ نقش کفِ پائے یار ہے کہ نہیں

مندرجہ بالا اشعار جو سوالات قائم کرتے ہیں ان کے لٹن سے کئی اور سوال ابھرتے ہیں مثلاً پہلے شعر میں دل کے آس پاس خوشبو یا ہوا کا ہونا اور پھر اس تجسس کا ابھرنا کہ ان کے علاوہ بھی شاید کچھ اور ہو۔ دوسرے یہ کہ واقعی یہ کوئی حقیقی احساس ہے کہ وہم و گمان۔ دوسرے شعر میں خوشبو کو علامتی طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ جو خوشبوؤں کی کئی Images کو وجود میں لاتا ہے لیکن کوئی بھی پیکر منفی نہیں ہے۔ خوشبو بذاتِ خود دل کو فرحت بخشنے والا، مسرت بانٹنے والا اور اپنے ہونے کی بشارت دینے والا لفظ ہے۔ اس مناسبت سے شعر میں جو بھی صورتیں ابھرتی ہیں مثلاً وفادار وطن، کوئی حسین دوشیزہ، کوئی بے گناہ، کوئی اپنی آن پر مٹنے والا، کوئی شکست خوردہ بادشاہ جس میں نیکی کی بھی خصوصیت ہو وغیرہ۔ خوشبو کی مناسبت سے ہوا کا استعمال بھی علامتی ہے اور تجسس آمیز اور حیرت کن مطالب اس کے لٹن سے پھوٹتے ہیں۔ تیسرے شعر میں بھی خوشبو کا شعری عمل علامتی ہے اور جبر و استحصال کے منظر کو بھی ابھارتا ہے۔ چوتھے شعر میں بھی تجسس، تذبذب، وہم و گمان اور صداقت کے درمیان کشمکش کی فضا علامت کی اس معنی خیزی کا اظہار ہے جس کے بارے میں ایڈمنڈسن نے لکھا ہے:

”ہمارا ہر احساس، ہمارے عالم شعر کا ہر لہجہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں ہمارے لیے مروجہ ادبی زبان میں اپنے احساس کا بعینہ اظہار ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہر شاعر کی اپنی انفرادی شخصیت ہوتی ہے۔ اس کا ہر لہجہ اپنا ایک مخصوص لہجہ رکھتا ہے اور اس میں مخصوص عناصر کا ایک مخصوص امتزاج ہوتا ہے۔ اور شاعر کا کام یہی ہے کہ وہ ایسی مخصوص زبان مہیا کرے، ایجاد کرے جو اس کے ان

احساسات اور شخصیت کا اظہار کر سکے۔ ایسی زبان لامحالہ علامتوں کا استعمال کرے گی۔“

(بحوالہ اردو غزل میں علامت نگاری، از: انیس اشفاق، ص ۳۲)
خالد بشیر کے بعض اشعار رومانی احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان پر ایک نظر کی جائے۔

لمس کی خوشبو ہواؤں میں کہاں سے آگئی
میرے ہونٹوں پر کسی کا نام بس آیا ہی تھا

گلاب جسم سے خوشبو تمام لب سے ہے
وہ شخص جیسے گلوں کے حسب نسب سے ہے

میں سانس لوں تو تری خوشبوؤں کے ہمسایہ
تجھے بھی مجھ سے رہے قرب لازوال ایسا

خوشبو ترے بدن کی مرے دل کی خواہشیں
اس وصلِ ناتمام میں کیا کیا ہوا کا ہے

کبھی کسی نے کیا خوشبو کا رنگ دیکھا ہے
کہے سنئے ہیں یہ سارے کتاب کے قصے

پھول، دھنک، خوشبو، تتلی
یہ القاب تمہارے نام

خوشبو کی آواز، ہوا کا جھونکا نام

اس سیماب سراپا کو میں دوں کیا نام

یہ تمام اشعار پہلی نظر میں رومانی احساسات سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن یہ رومانیت اس نوعیت کی نہیں ہے جس کے بارے میں شیلے نے لکھا ہے:

”رومانیت پرستوں کو عام طور پر زندگی میں برائیاں، غم اور

حرام نصیبی ہی نظر آتی ہے اور اس سلسلے میں شوپنہار، میلویل اور بائرن

پیش پیش ہیں۔“

(بحوالہ جدید اردو تنقید، اصول و نظریات، از: ڈاکٹر شارب رودولوی، ص ۸۱)

بلکہ ان کے اشعار مجنوں گورکھپوری کے ان نظریات کے عین مطابق ہیں جو انہوں

نے شوپنہار کے متعلق بیان کیے ہیں۔

”شوپنہار کا خیال تھا کہ اگر آج دنیا میں حسن و عشق، فنون

لطیفہ اور مذہب کا وجود نہ ہوتا تو ہمارے پاس کوئی ایسا دارونہ تھا جس سے

زندگی کی المناکیاں اور زمانے کی تلخیاں گھٹائی جاسکتیں۔“

(ایضاً، ص ۸۲)

خالد بشیر نے جہاں ’خوشبو‘ کو دوسرے معنوں میں برتا ہے، ان میں ایک شعر

دوسرے پہلوؤں کے علاوہ نعت کا معنوی پہلو بھی شامل ہے۔ شعر یہ ہے۔

چمن کی زینتیں اس کو سلام کرتی ہیں

تو خوشبوئیں بھی اسی سے کلام کرتی ہیں

اس شعر یا شعر کے اس معنی سے احساس ہو جاتا ہے کہ خالد بشیر شاعری کی رسمیں

زدگی اور کسی تخلیقی تجربے کے اظہار کی بجائے رائج الوقت مضامین کی تکرار کی محدودیت سے

بہت دور ہیں۔ اس طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ معنی سے ان کے شعوری رابطے کا نتیجہ ہے

شعری تجربے کے ارتکاز کے ساتھ ساتھ اظہار کے سانچوں میں تبدیلی ان کے مذاق سے

رابطہ رکھتی ہے۔ ان کے یہاں نچرل شاعری کی قدریں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ نظر

ہیں۔

جنگل، بارش، بھینی خوشبو گھاس ہری
ایسا منظر اور آنکھوں کی پیاس ہری
نیچرل شاعری کے دوسرے انداز بھی دیکھئے۔
پھولوں نے تو خوشبوئیں چھپالی ہیں تہوں میں
اب خال ہی آتی ہے پرندوں کی صدا بھی

وہ برگِ گل کی طرح خار و خس سے خوشبوئیں
نچوڑ کر مجھے حیرت میں ڈال دیتا ہے

اب اس زمین پہ خوشبو کا رقص ہونا ہے
گلاب ہونٹوں پہ یہ سسکیاں نہیں ہوں گی

رفاقتِ دھنک بھی، خوشبوئیں بھی میرے حق میں تھیں
مگر اسی کے ساتھ چشمِ انتظار دے گیا

خوشبو ہے تو ہمسائے بھی معلوم کریں گے
یوں برگِ گل جاں کو بکھیرا نہیں کرتے
ان میں پہلا شعر مناظرِ فطری کی عکاسی کرتا ہے۔ اور باقی فطرتِ انسانی
(Human nature) اور اس کے احساسات کے آئینہ دار ہیں۔ ان میں روحانی اظہار
کے وہ طریقہ کار بھی شامل ہیں جس کے بارے میں مارکس نے لکھا ہے:
”تم یہ مطالبہ تو نہیں کرتے کہ گلاب کے پھولوں میں گل
ہنقشہ کی خوشبو ہو لیکن وہ جو فطرت کا سب سے بڑا خزانہ ہے یعنی روح،

اس کے اظہار کے لیے تم تو صرف ایک ہیئت کی اجازت دیتے ہو۔
(مان لو کہ) میں ایک مزاح نگار ہوں لیکن قانون یہ حکم نافذ کرتا ہے کہ
سنجیدہ انداز میں لکھو۔ میں بے باک ہوں لیکن قانون یہ چاہتا ہے کہ میرا
اسلوب نرم ہو، شبنم کا ہر قطرہ جس میں سورج کا عکس جھلکتا ہے، رنگوں کی
ایک بے نہایت نمائش سے جگمگاتا ہے۔ پھر روح کا سورج تو اس سے
کہیں زیادہ افراد اور اشیا میں منتشر ہو سکتا ہے۔“

(بحوالہ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس، از: شمیم حنفی، ص ۲۵۷)

شعری زبان میں قانون سے مراد معاشرتی پابندیاں بھی ہو سکتی ہیں جو جسم کے
مراحل سے گزر کر روح تک کو جھنجھوڑ دیتی ہیں۔ ان احساسات کے بیان کا ایک ذریعہ جہاں
شعر ہے تو اس شعر کی توصیف کرنے کا اسلوب بھی بہترین شعر ہو سکتا ہے جیسا کہ خالد بشیر کے
ان اشعار سے ظاہر ہے۔

اُس کے سخن نے پھول کھلائے ہزار رنگ
خوشبو کا جان و دل پہ اثر دیر تک رہا

اس کے سخن نے پھولوں سی خوشبو اچھال دی
اور میں نے اس کے پاؤں میں تلوار ڈال دی

ترے کلام سے دن خوشبوؤں میں ڈوب گیا
ترے خیال سے شب ہو رہی سہانی ہے

قرین جاں کھلے ہیں جیسے یاسمین و گلاب
یہ کس کمال کی خوشبو گل سخن میں ہے
خالد بشیر کی تخیلاتی اساس معینہ قدر کے دائرے سے آگے دیکھنے کی قائل ہے۔ ان

کے شعری افکار احساسات کے پس منظر میں ارتقا کے تصور سے وابستگی کے باعث اپنی معنوی ساخت میں ترقی کرتے ہیں۔ جیسے کہ یہ شعر۔

مہاجر پرندے ہوا خوشبوئیں
کبھی روکنے سے رکا ہے کوئی

خالد بشیر کے جذباتی اضطراب جو سنجیدہ غور و فکر کے آخری مرحلوں کے بعد کی منزل کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ ان کے ہيجان اور جنون کی معنویت سماجی اور تہذیبی ہيجان اور اس کی معنویت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ ان کی ادبی فکر جہاں ناامیدی کو محسوس کرتی ہے وہیں ذہنی فضا امید کا بھی سراغ لگاتی ہے۔ مختلف احساسات پر مشتمل مختلف اشعار جن کا مرکزی لفظ 'خوشبو' ہے۔ اپنے اعلیٰ انسلالات کے ساتھ کس سطح کی تخلیق کو وجود میں لاتے ہیں، خالد بشیر کے اشعار اس کا بین ثبوت ہیں۔

وہی خوشبو، وہی ریشم سی باتیں
ابھی ہوں خواب کی آوارگی میں

بس ایک ہی گلاب تھا آنکھوں کے روبرو
خوشبو تمام جس کی اڑا لے گئی ہوا

کئی مہینوں موسم نے کچھ رنگ نہ بدلا تھا
آج اچانک وصل کی خوشبو سانوں میں آئی

یہ کسی شخص کے ہونے سے ہی سب اچھا ہے
ورنہ خوشبوئے گل و لمس ہوا بے معنی

میرے خوشبو خواب سمیٹے اپنے ساتھ
بند کیے سارے دروازے اپنے ساتھ

خوشبوئیں، کلیاں، مہک، سارے کے سارے خواب تھے
 نیند کھلتے ہی ہمارا آسرا کوئی نہ تھا
 ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے ادب کی ایک جامع تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔
 ”ادب ایک فن لطیف ہے جس کا موضوع زندگی ہے، اس کا
 مقصد اظہار و ترجمانی اور تنقید ہے۔ اس کا سرچشمہ تحریک احساس ہے۔
 اس کا معاون اظہار خیال اور قوت مختصر ہے اور اس کے خارجی روپ وہ
 حسین ہیئت اور وہ خوبصورت پیرایہ ہائے اظہار ہیں جو لفظوں کی مدد
 سے تحریک کی صورت اختیار کرتے ہیں۔
 اس فن لطیف میں الفاظ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی چیز
 اس کو باقی فنون لطیفہ سے جدا کرتی ہے۔“

(مباحث، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ص ۲۲)

اس اقتباس کو نقل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ خالد بشیر احمد کے ذریعہ پیش کیا جانے والا
 ادب اور ان کا مستعمل مرکزی لفظ ”خوشبو“ اردو ادب میں کس اہمیت کے حامل ہیں اور ہو سکتے
 ہیں، اس کا اندازہ ہو جائے۔ چونکہ پہلا مرحلہ اہل ادب کو اور پورے سماج سے اپنے اظہار کو
 الفاظ کے توسط سے معترف کرانا ہوتا ہے، اس نقطہ نظر سے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کا یہ نظریہ خالد
 بشیر کے اشعار سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے آگے کے مراحل طے نہ کیے جائیں تو ادب فن
 برائے فن (Art for art sake) کے زمرے میں بھی شامل ہو سکتا ہے۔ پیلینخوف
 (Plekhanou) نے اپنی کتاب Art and social life میں فن برائے فن کے متعلق
 لکھا ہے۔

”فن برائے فن کا عقیدہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ فنکار اور
 عوام جن کو اس میں بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے، اپنے سماجی ماحول سے
 ہم آہنگ نہیں ہوتے۔“

(بحوالہ جدید اردو تنقید، اصول و نظریات، از: ڈاکٹر شارب رودولوی)

خالد بشیر احمد کے چند اشعار دیکھے جائیں۔

خوشبوؤں کے بیچ سفر آغاز ہوا
پیار کے دو بولوں سے گھر آغاز ہوا

اب تک ہیں تخیل کے در و بام معطر
خوشبوئے بدن تھی کہ وہ باتوں کی مہک تھی

خوشبوؤں کے زیرِ سایہ تتلیوں کے درمیاں
میں نے اپنے خواب پالے ہیں گلوں کے درمیاں

گلاب پھول ہے اور ایک استعارہ بھی
یہی سراغ ہے خوشبو کا بھی، تمہارا بھی

تمہارے آنے سے خوشبو قبائیں کھولتی تھی
کبھی تو کھولو درِ گفتگو دوبارہ بھی

ہم نے پہلی بار دیکھا ہے تمہارے ساتھ ہی
رنگِ محو گفتگو اور خوشبوئیں چلتی ہوئی

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے کہ خالد بشیر احمد کے اشعار اپنے سماجی ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ زندگی اور سماجی جہات کے ساتھ ان کے اشعار کی یہ ہم آہنگی حال کے مندرجہ ذیل بیان کی تصدیق کے ساتھ اپنے وزن و وقار کا تعین کرتی ہے۔ حالی نے لکھا ہے:

”نفس انسانی کی باریک گہری اور بوقلمون کیفیات صرف

الفاظ ہی کے ذریعہ ادا ہو سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیائے

خوشبوئیں، کلیاں، مہک، سارے کے سارے خواب تھے
 نیند کھلتے ہی ہمارا آسرا کوئی نہ تھا
 ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے ادب کی ایک جامع تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔
 ”ادب ایک فن لطیف ہے جس کا موضوع زندگی ہے، اس کا
 مقصد اظہار و ترجمانی اور تنقید ہے۔ اس کا سرچشمہ تحریک احساس ہے۔
 اس کا معاون اظہار خیال اور قوت مختصر ہے اور اس کے خارجی روپ وہ
 حسین ہیئت اور وہ خوبصورت پیرایہ ہائے اظہار ہیں جو لفظوں کی مدد
 سے تحریک کی صورت اختیار کرتے ہیں۔
 اس فن لطیف میں الفاظ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی چیز
 اس کو باقی فنون لطیفہ سے جدا کرتی ہے۔“

(مباحث، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ص ۲۲)

اس اقتباس کو نقل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ خالد بشیر احمد کے ذریعہ پیش کیا جانے والا
 ادب اور ان کا مستعمل مرکزی لفظ ”خوشبو“ اردو ادب میں کس اہمیت کے حامل ہیں اور ہو سکتے
 ہیں، اس کا اندازہ ہو جائے۔ چونکہ پہلا مرحلہ اہل ادب کو اور پورے سماج سے اپنے اظہار کو
 الفاظ کے توسط سے معترف کرانا ہوتا ہے، اس نقطہ نظر سے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کا یہ نظریہ خالد
 بشیر کے اشعار سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے آگے کے مراحل طے نہ کیے جائیں تو ادب فن
 برائے فن (Art for art sake) کے زمرے میں بھی شامل ہو سکتا ہے۔ پلینخوف
 (Plekhanou) نے اپنی کتاب Art and social life میں فن برائے فن کے متعلق
 لکھا ہے۔

”فن برائے فن کا عقیدہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ فنکار اور
 عوام جن کو اس میں بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے، اپنے سماجی ماحول سے
 ہم آہنگ نہیں ہوتے۔“

(بحوالہ جدید اردو تنقید، اصول و نظریات، از: ڈاکٹر شارب رودولوی)

خالد بشیر احمد کے چند اشعار دیکھے جائیں۔

خوشبوؤں کے بیچ سفر آغاز ہوا
پیار کے دو بولوں سے گھر آغاز ہوا

اب تک ہیں تخیل کے در و بام معطر
خوشبوئے بدن تھی کہ وہ باتوں کی مہک تھی

خوشبوؤں کے زیر سایہ تتلیوں کے درمیاں
میں نے اپنے خواب پالے ہیں گلوں کے درمیاں

گلاب پھول ہے اور ایک استعارہ بھی
یہی سراغ ہے خوشبو کا بھی، تمہارا بھی

تمہارے آنے سے خوشبو قبائیں کھولتی تھی
کبھی تو کھولو درِ گفتگو دوبارہ بھی

ہم نے پہلی بار دیکھا ہے تمہارے ساتھ ہی
رنگ محو گفتگو اور خوشبوئیں چلتی ہوئی

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے کہ خالد بشیر احمد کے اشعار اپنے سماجی ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ زندگی اور سماجی جہات کے ساتھ ان کے اشعار کی یہ ہم آہنگی حال کے مندرجہ ذیل بیان کی تصدیق کے ساتھ اپنے وزن و وقار کا تعین کرتی ہے۔ حالی نے لکھا ہے:

”نفس انسانی کی باریک گہری اور بوقلمون کیفیات صرف

الفاظ ہی کے ذریعہ ادا ہو سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیائے

خوشبوئیں، کلیاں، مہک، سارے کے سارے خواب تھے
 نیند کھلتے ہی ہمارا آسرا کوئی نہ تھا
 ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے ادب کی ایک جامع تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے۔
 ”ادب ایک فن لطیف ہے جس کا موضوع زندگی ہے، اس کا
 مقصد اظہار و ترجمانی اور تنقید ہے۔ اس کا سرچشمہ تحریک احساس ہے۔
 اس کا معاون اظہار خیال اور قوت مختصر ہے اور اس کے خارجی روپ وہ
 حسین ہیئت اور وہ خوبصورت پیرایہ ہائے اظہار ہیں جو لفظوں کی مدد
 سے تحریک کی صورت اختیار کرتے ہیں۔

اس فن لطیف میں الفاظ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی چیز
 اس کو باقی فنون لطیفہ سے جدا کرتی ہے۔“

(مباحث، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ص ۲۲)

اس اقتباس کو نقل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ خالد بشیر احمد کے ذریعہ پیش کیا جانے والا
 ادب اور ان کا مستعمل مرکزی لفظ ”خوشبو“ اردو ادب میں کس اہمیت کے حامل ہیں اور ہو سکتے
 ہیں، اس کا اندازہ ہو جائے۔ چونکہ پہلا مرحلہ اہل ادب کو اور پورے سماج سے اپنے اظہار کو
 الفاظ کے توسط سے معترف کرانا ہوتا ہے، اس نقطہ نظر سے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کا یہ نظریہ خالد
 بشیر کے اشعار سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے آگے کے مراحل طے نہ کیے جائیں تو ادب فن
 برائے فن (Art for art sake) کے زمرے میں بھی شامل ہو سکتا ہے۔ پلینخوف
 (Plekhanou) نے اپنی کتاب Art and social life میں فن برائے فن کے متعلق
 لکھا ہے۔

”فن برائے فن کا عقیدہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ فنکار اور
 عوام جن کو اس میں بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے، اپنے سماجی ماحول سے
 ہم آہنگ نہیں ہوتے۔“

(بحوالہ جدید اردو تنقید، اصول و نظریات، از: ڈاکٹر شارب رودولوی)

خالد بشیر احمد کے چند اشعار دیکھے جائیں۔

خوشبوؤں کے بیچ سفر آغاز ہوا
پیار کے دو بولوں سے گھر آغاز ہوا

اب تک ہیں تخیل کے در و بام معطر
خوشبوئے بدن تھی کہ وہ باتوں کی مہک تھی

خوشبوؤں کے زیرِ سایہ تتلیوں کے درمیاں
میں نے اپنے خواب پالے ہیں گلوں کے درمیاں

گلاب پھول ہے اور ایک استعارہ بھی
یہی سراغ ہے خوشبو کا بھی، تمہارا بھی

تمہارے آنے سے خوشبو قبائیں کھولتی تھی
کبھی تو کھولو درِ گفتگو دوبارہ بھی

ہم نے پہلی بار دیکھا ہے تمہارے ساتھ ہی
رنگِ محو گفتگو اور خوشبوئیں چلتی ہوئی

جیسا کہ اشعار سے ظاہر ہے کہ خالد بشیر احمد کے اشعار اپنے سماجی ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ زندگی اور سماجی جہات کے ساتھ ان کے اشعار کی یہ ہم آہنگی حال کے مندرجہ ذیل بیان کی تصدیق کے ساتھ اپنے وزن و وقار کا تعین کرتی ہے۔ حالی نے لکھا ہے:

”نفس انسانی کی باریک گہری اور بوقلمون کیفیات صرف
الفاظ ہی کے ذریعہ ادا ہو سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیائے

خارجی اور ذہنی کا نقشہ اتار سکتی ہے۔ عالم محسوسات دولت کے انقلابات، سیرت انسانی، معاشرت، نوع انسانی تمام چیزیں جو فی الحقیقت موجود ہیں اور تمام وہ چیزیں جن کا تصور مختلف اشیاء کے اجزاء کو ایک دوسرے سے ملا کر کیا جاسکتا ہے، سب شاعری کی سلطنت میں محصور ہیں۔ شاعری ایک سلطنت ہے جس کی قلم رواں قدر وسیع ہے جس قدر خیال کی قلم رو۔“

(ایضاً، ص ۲۲۱)

خالد بشیر احمد اردو زبان و ادب کی آبیاری میں سرگرم عمل ہیں، ان کی ادبی کاوشوں پر غور کرتے ہوئے ان سے بہترین ادبی معاونت کی امید کی جاسکتی ہے۔

خالد بشیر احمد کی شعری خدمات

محمد الیاس

خالد بشیر احمد ریاست جموں و کشمیر کے اردو شعراء میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ وہ بلاشبہ ریاست کے ان ادباء کی فہرست میں شمار کیے جاسکتے ہیں جنہیں نظم و نثر پر یکساں دسترس حاصل ہے۔ خالد بشیر احمد نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں اور تخلیقی کاوشوں سے اردو شعر و ادب کے سرمایے میں جو اضافہ کیا ہے وہ قابلِ قدر بھی ہے اور لائقِ تحسین بھی۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اگرچہ افسانہ نگاری سے کیا لیکن بہت جلد وہ شعر گوئی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے ”صدائے نیم شب“ اور ”خواب پارہ“ شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان مجموعوں کے علاوہ خالد بشیر احمد کی شعری تخلیقات برصغیر کے معیاری اخبارات اور رسائل میں وقفہ وقفہ شائع ہوتی ہیں۔ اس سے قبل کہ خالد بشیر احمد کی شعری خدمات پیش کی جائیں مناسب معلوم ہوتا کہ ان کے شعری مجموعوں کا ایک اجمالی تعارف کرایا جائے۔

خالد بشیر احمد کا پہلا شعری مجموعہ ”صدائے نیم شب“ مارچ ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کی دوسری اشاعت مارچ ۲۰۰۹ء میں عمل میں آئی۔ اس کا ناشر بک مین پبلشرز، ۲۹۴، زنگھ گڑھ، سرینگر ہے۔ ۸۸ صفحات پر مشتمل اس شعری مجموعے کے اولین آٹھ صفحات اندرونی سرورق اور مختصر سے انتساب کی نذر ہوئے ہیں۔ مجموعے کے صفحہ ۹ سے ۱۳ تک پروفیسر حامد کی کاشمیری کا لکھا ہوا فکر انگیز مقدمہ ہے۔ صفحہ ۱۴ پر شاعر نے اپنے اس مجموعے کے بارے میں ”ایک بات“ عنوان کے تحت اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس کتاب کی کمپیوٹر کمپوزنگ اور

سرورق کو احمد اور فیاض نے انجام دیا ہے۔

”صدائے نیم شب“ کے صفحہ ۱۵ پر مختصر سا پیش لفظ ہے جو کہ نہایت ہی دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ دراصل یہ پیش لفظ ایک آزاد نظم ہے جو شاعر کے خیالات اور جذبات کی ان الفاظ میں ترجمانی کرتی ہے۔

میں ازل سے

ایک ایسی زمین کی تلاش میں تھا

جہاں سورج کی سلگتی ہوئی تمازت سے بچنے کے لیے

میں ایک شجر سایہ دار اُگالیتا

میرے اس سفر میں

میرے ہمراہ

صرف ایک بے پردہ کا شخص تھا

جس کا بدن خوشبو

اور جس کا لمس احساس تھا

یہ شخص مجھے ایک ایسے جزیرے تک لے آیا

جہاں کی زمین بڑی حساس اور نرم تھی

زیر بحث شعری مجموعے کا صفحہ ۱۶ خالی ہے۔ صفحہ ۱۷ سے ۲۵ تک ۴۹ غزلیں موجود

ہیں جن میں ۲۶ پانچ اشعار کی، ۱۵ چار اشعار کی اور آٹھ غزلیں صرف تین اشعار کی ہیں۔ صفحہ ۲۶

سے ۲۸ تک گیارہ متفرق اشعار ہیں اور صفحہ ۲۹ سے ۸۷ تک گیارہ آزاد اور نثری نظمیں ہیں۔

صفحہ ۸۸ پر شاعر کی مختصر سی سوانح درج ہے۔ صدائے نیم شب کو جموں و کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لٹریچر کی طرف سے ۱۹۸۴ء میں سال کی بہترین اردو کتاب کا ایوارڈ حاصل ہوا ہے۔

”خواب پارہ“ خالد بشیر احمد کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جو ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔

اس مجموعے کی طباعت جے کے آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد دہلی کے زیر اہتمام ہوئی ہے۔ اس کا ناشر بھی بک مین پبلشرز ۲۹۴، زینک گڑھ، سرینگر ہے۔ اس کتاب کی کمپیوٹر کمپوزنگ اور

سرورق فیاض، ساجد اور زُہیب کے مرہونِ منت ہے۔

خالد بشیر احمد کا یہ شعری مجموعہ ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع کے سات صفحات اندرونی سرورق اور انتساب پر مشتمل ہیں۔ خالد بشیر احمد نے اس مجموعے کا انتساب اپنے برادرِ مرحوم کے نام ان الفاظ میں تحریر کیا ہے۔

اپنے اُمّی و معصوم برادرِ مرحوم غلام محی الدین کے نام
..... کہ دل میں تیری جدائی کا داغ روشن ہے

خواب پارہ کا صفحہ آٹھ خالی ہے۔ صفحہ ۹ اور ۱۰ پر دو حمد ہیں جن کے اشعار عشقِ الہی کے جذبات سے سرشار ہیں۔ نمونہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ پیاس دیتا ہے تو اس کے بعد پانی بھی
اسی یقین پر ہے میری خوش گمانی بھی

نہیں ہے اُس کے سوا لائقِ سجود کوئی
وہ لاشریک بھی، واحد بھی، غیر فانی بھی

فرشِ زمین تا عالم بالا اللہ تعالیٰ آپ کا نام
سب سے ارفع سب سے اعلیٰ اللہ تعالیٰ آپ کا نام

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک رہنے والی آپ کی ذات
اُس کے بعد بھی رہنے والا اللہ تعالیٰ آپ کا نام
خواب پارہ کے صفحہ ۱۱ اور ۱۲ پر دو نعتیں شامل اشاعت ہیں، ان میں سے ایک نعت کے یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

صورتِ حال ہے غمِ ناک، رسولِ عربی ﷺ
دامنِ صبر بھی صد چاک رسولِ عربی ﷺ

داورِ حشر کی بجائے تو مطالعہ تیری

میرے اعمالِ شرمناک، رسولِ عربی ﷺ

خواب پارہ میں صفحہ ۱۳ سے ۹۵ تک ۸۳ غزلیں ہیں۔ جن میں سے ۳۶ کے پانچ، ۲۶ کے چار اور ۲۱ کے تین اشعار ہیں۔ صفحہ ۹۶ تا ۱۰۶ پانچ نظمیں ہیں اور صفحہ ۱۰۷ سے ۱۲۰ تک متفرق اشعار ہیں۔ خالد کے دونوں مجموعوں میں ایک بھی شعر مقطع کا نہیں ہے۔

جہاں تک خالد بشیر احمد کے ان شعری مجموعوں ”صدائے نیم شب“ اور ”خواب پارہ“ کا تعلق ہے ان کے گہرے مطالعے کے بعد قاری اس حقیقت سے آشنا ہوتا ہے کہ خالد بشیر احمد ریاست جموں و کشمیر کے شعراء میں جدید حسیت اور عصری آگہی کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں عصر حاضر کے انسان کی نامرادیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ ساتھ جدید حسیت کا شدید احساس ملتا ہے اور احساس کی یہ شدت ان کی ذات کو بھی اپنی پلیٹ میں لے لیتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ خالد نہ صرف اپنے عصری حالات سے پوری طرح آگاہ ہیں بلکہ وہ اپنے عہد کی زندگی کے ایک ایک پہلو پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ گرد و پیش کی دنیا کا مشاہدہ اور نظارہ کر رہا ہے کیونکہ خالد بشیر احمد نے اپنے عہد کے انسان کے درد و کرب کو بڑی شدت سے محسوس کیا ہے۔ انہوں نے انسان کو طرح طرح کے مصائب اور مسائل سے نبرد آزما ہوتے دیکھا ہے۔ وہ خود جس سماج اور ماحول کا حصہ ہیں اس کی اونچ نیچ، طبقاتی کشمکش اور سماجی نابرابری کا انہوں نے قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری ان کے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کی غماز ہے۔ انہوں نے اس دنیا میں جس بات، واقعے اور حادثے کو جس طرح محسوس کیا ہے اُسے شعری پیکر عطا کر کے من و عن پیش کرنے کی کامیاب سعی کی ہے۔

خالد بشیر احمد کا پہلا شعری مجموعہ ”صدائے نیم شب“ اُن کے ابتدائی اڑھائی برس کی شاعری کا انتخاب ہے۔ یہ مجموعہ اگرچہ ان کے دورِ شباب کا ہے لیکن بقول پورن سنگھ، نثر:

”اس میں عشوہ و غمزہ و ادا، جبین و سنگِ در، عارض و زخار، کاکلِ شبِ رنگ، گیسوئے عنبریں، ہجر و وصال، قلق و اضطراب، حسرت

و حراماں کا تذکرہ عنقا و معدوم ہے۔

صدائے نیم شب“ کے ہر صفحہ پر حسی تجربات کی ایک ایسی انوکھی اور اچھوتی مثالیں موجود ہیں جو خالد بشیر احمد کے انفرادی رنگ و آہنگ کی غمازی کرتی ہیں۔

خالد بشیر احمد کا دوسرا شعری مجموعہ ”خواب پارہ“ ان کی پچیس سال سے زائد کی زندگی کا ثمرہ ہے۔ زندگی کے ان پچیس برسوں میں شاعر جن کٹھنائیوں، مصیبتوں، ناکامیوں اور مشکلات سے رو برو ہوا ہے، اس مجموعے میں ان کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ زندگی کی تلخیوں کے علاوہ اس میں گرد و نواح کی بے بسی اور بے کسی کے ماحول کی منہ بولتی تصویریں بھی نظر آتی ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر کے ایک اردو شاعر اور تجزیہ نگار جناب بے تاب جے پوری ”خواب پارہ“ کا تجزیہ کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

”خواب پارہ“ میں شاعر نے عصری مسائل، قدروں کی شکست و ریخت، ماضی کے ماحول کی شگفتگی اور دورِ حاضر کی تلخیوں کو اپنے شعروں میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔“

غزل، اردو شاعری کی ایک ہر دل عزیز صنفِ سخن ہے۔ اردو کے تقریباً ہر شاعر نے اس میں طبع آزمائی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردو شاعری کا بہت بڑا سرمایہ غزل کی شکل میں محفوظ ہے۔ خالد بشیر احمد کے ہاں بھی دیگر شعراء کی طرح غزل اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ غزل ان کا خاص میدان ہے۔ انہوں نے غزل کہی ہے اور بہت خوب کہی ہے۔ خالد بشیر احمد نے نہ صرف غزل کی روایت کو آگے بڑھایا بلکہ اپنی خداداد صلاحیتوں سے اس روایت کو مستحکم بھی کیا ہے۔ انہوں نے روایتی قدروں کے قدیم اور جدید امتزاج سے غزل کو ایک نیا اسلوب و آہنگ عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غزلوں کو پڑھ کر تازگی اور نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس ضمن میں مصطفیٰ اکبر لکھتے ہیں:

”ان کی غزلوں کا مزاج بڑی حد تک جدیدیت کے شعری مزاج سے ہم آہنگ ہے لیکن جہاں تک ممکن ہو سکا ہے وہ جدیدیت کے لیبل سے اپنا دامن بچانے میں کامیاب بھی نظر آئے ہیں۔“

غزل بنیادی طور پر ایک دائمی صنف فن ہے۔ اس میں شاعر صرف وہی بیان کرتا ہے جو اس کے دل پر بیتی ہو۔ شاعر کے دل پر گزرنے والی کیفیات وہی ہوتی ہیں جو دوسروں پر بیت چکی ہوتی ہیں۔ لہذا پڑھنے والے یا سننے والے کو غزل میں اپنی داستان سنائی دیتی ہے۔ جو کچھ شاعر کے دل پر گزرتی ہے اس کے لیے تنقید میں مختلف الفاظ موجود ہیں۔ مثلاً احساسات، جذبات، واردات قلبی، تجربہ، شعری تجربہ وغیرہ۔ لیکن غزل کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے، احساسات و جذبات کے علاوہ غزل میں فکر کا عنصر بھی داخل ہو گیا ہے۔ جدید غزل کا شاعر صرف وہی کچھ پیش نہیں کرتا جو وہ محسوس کرتا ہے بلکہ وہ، وہ بھی پیش کرتا ہے جو وہ سوچتا ہے، اور دیکھتا ہے لیکن آج بھی یہی بہتر سمجھا جاتا ہے کہ شاعر کا خیال یا اس کی فکر جذبہ اور احساس بن کر غزل کے شعر میں ڈھل جائے۔

غزل کے لغوی معنی ”سخن بیاہر گفتن“ یعنی محبوب سے باتیں کرنا، عورتوں سے باتیں کرنا یا عورتوں کے حسن و جمال کی تعریف کرنا ہیں۔ اس طرح عشق و محبت غزل کے خمیر میں داخل ہے۔ لیکن غزل صرف محبت اور حسن و جمال کے موضوعات تک ہی محدود نہیں بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں سیاسی اور سماجی مسائل، فلسفہ اور تصوف اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی بھی موجود ہے لیکن بحیثیت مجموعی حسن اور عشق ہی غزل کے بنیادی اور خاص موضوعات ہیں۔

جہاں تک خالد بشیر احمد کا تعلق ہے انہوں نے بھی غزل میں موضوع عشق کو اپنے مخصوص رنگ میں پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو پھول کی ناز کی کو پتھر اور پتھر کی سختی کو پانی بنا سکتا ہے۔ عشق وہ فسوں ہے جو فانی شے کو لافانی بنا دیتا ہے۔

پھول کو پتھر بنائے، سنگ کو پانی کرے

عشق وہ منتر ہے، فانی شے کو لافانی کرے

عام شعری روایت کے مطابق خالد بشیر احمد بھی اپنی شاعری کا بیشتر مواد حسن و عشق ہی سے حاصل کرتے ہیں۔ ان کی بیشتر غزلوں پر جذبہ عشق و محبت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ وہ حسن کی مختلف کیفیات اور عشق و محبت کی واردات کو اپنے محسوسات اور اپنی داخلیت کی مدد سے

لازوال بنادیتے ہیں۔ وہ حسن سے متعلق محض نظریہ نہیں رکھتے بلکہ وہ انسان کی ذہنی و جذباتی کیفیت، قلب و نظر کے تقاضے اور اس کے فکر و شعور کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہیں۔ ان کے یہاں محبوب سے عجز و نیاز، شوخی و شرارت، شکوہ و شکایت، وضع و خودداری غرض تمام موضوعات کو شعری پیکر عطا ہوئے ہیں اور انہوں نے ان تمام کیفیات کا اظہار اپنے جس مخصوص لب و لہجہ میں کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

انہوں نے اپنی غزلوں میں جہاں حسن کا ذکر کیا ہے وہاں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اکثر شعراء حسینوں کی ظاہری اداؤں کی داد دیتے ہیں۔ ان کے حسن اور خوبصورتی کو مبالغے کے ساتھ پیش کرتے ہیں لیکن ان کی باطنی حالت زار سے بے خبر ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی ہنستا ہوا انسان اندر سے بھی اتنا ہی پرسکون اور خوش ہو جتنا وہ بظاہر دکھائی دیتا ہے۔

جس کے چہرے پر ہمیشہ پھول ہی کھلتے رہے

اس کے سینے میں مگر اک زخم بھی گہرا ہی تھا

انسان کا دل خوش ہو تو اسے ہر شے خوبصورت نظر آتی ہے، فطرت کی ہر ادا اس کے دل کو بھاتی ہے، خزاں کے عالم میں بھی اُسے موسم بہار کا احساس ہوتا ہے لیکن جب دل حیران و پریشان ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی چیز اُسے اچھی نہیں لگتی خواہ وہ موسم بہار میں پر شباب رنگ برنگے پھول ہی کیوں نہ ہوں، پرندوں کی چہچہاہٹ، چاند ستاروں کی چمک، جھرنوں کے دلکش ترانے، جھیل کی خاموشی، بریلی وادیوں کے دلفریب نظارے، غرض فطرت کے تمام دلکش اور حسین مناظر اُسے بے وقعت اور پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ خالد بشیر احمد کا یہ انداز ملاحظہ ہو۔

سارے منظر میری آنکھوں کو بھلے لگتے تھے

میں گئی رُت میں عجب طرز کا جذباتی تھا

دل کی بستی کیا بستی ہے

گھر آنگن سونا سونا ہے

کوئی کھیل نہ شور نہ کوئی ان بن ہے
میرا دل اک سونے گھر کا آنگن ہے

اردو شاعری کا خاصا رہا ہے کہ محبوب عاشق کو ذلیل کرتا ہے۔ اس پر طرح طرح سے ظلم و ستم روا رکھتا ہے مگر عاشق ہے کہ بے آبرو ہونے کے باوجود محبوب کے اُسی در اور اُسی کوپے کی خاک ہو کر پڑا رہتا ہے۔ اس کے برعکس خالد کی شاعری کا جہاں تک تعلق ہے اس میں غیرت مندی اور خودداری کا احساس ملتا ہے۔ ان کے یہاں خودداری کا یہ عالم ہے کہ ان کا محبوب اگر ان سے خفا ہو جاتا ہے، ملنا جُلنا چھوڑ دیتا ہے تو وہ بھی اس سے ملنے کی پروا نہیں کرتے۔

اُس نے آواز نہیں دی مجھ کو

اور میں بھی نہ گیا ہوں اب تک

خالد بشیر احمد کی یہ غیرت اور خودداری دیکھ کر قاری کا ذہن آتش کے اس شعر کی جانب چلا جاتا ہے۔

جب وہ نہیں ملتا ہے تو ہم بھی نہیں ملتے

غیرت کا اب اپنی بھی تقاضا ہے تو یہ ہے

یہ صحیح ہے کہ خالد بشیر احمد اپنے روٹھے ہوئے محبوب کو منانے کے لیے اس کے پیچھے نہیں جاتے۔ تاہم اسے اس کی خطاؤں کا شدید احساس دلاتے ہیں۔ پھر اسے ایسے حسین انداز سے دعوت دیتے ہیں کہ وہ مجبور ہو کر ان کی طرف چلا آتا ہے۔ محبوب کی خطاؤں کو معاف کرنا اگرچہ خالد کا وطیرہ ہے مگر وہ بھی تو ایک مدت سے اس کی راہ تک رہے ہیں۔

ایک مدت سے تیری راہ تکی ہے میں نے

صبح کے بھولے چلو شام ہوئی گھر آؤ

خالد بشیر احمد کی شاعری کا عاشق بھی محبوب کے ہجر میں آہیں بھرتا ہے، نالہ و فریاد کرتا ہے اور اس کی بے وفائی کا شکوہ بھی کرتا ہے۔ لیکن چاک گریباں ہو کر صحراؤں کی خاک نہیں چھانتا۔ اس کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر محبوب اُسے بھولنے کا اختیار دیتا ہے تو وہ اُسے بھلا بھی دیتا

ہے

میں تجھ کو بھولنا چاہوں تو بھول بھی پاؤں
بس اک ذرا مجھے خود اختیار رہنے دے
خالد کی شاعری میں جب محبوب کی بے وفائی کا شکوہ ہوتا ہے تو اس میں بھی عاشق کی
سادگی جھلکتی ہے۔

اتنی دور سے آتے ہو
بس اک رسم نبھاتے ہو

آگ تماشا بھی دیکھو
چھوڑو پانی لاتے ہو

رات ہوئی سو جانے دو
کیوں بے کار ستاتے ہو

رسم دستورِ وفاداری ادا کس نے کی؟
تو نے جو مجھ سے وفا کی تو جفا کس نے کی؟

میں نے اپنا فرض نبھایا، بھول گیا
تم کو بھی کچھ یاد نہ آیا، بھول گیا؟

معمولی باتوں میں بھی آجائے گا
میرا دل کیا اعلیٰ ذات براہمن ہے؟
آدمی کے شعور میں کیا ہے اور غیر شعوری طور پر وہ کون سی حرکات کا مرتکب ہوتا ہے۔

کوئی کھیل نہ شور نہ کوئی آن بن ہے
میرا دل اک سونے گھر کا آنگن ہے

اردو شاعری کا خاصا رہا ہے کہ محبوب عاشق کو ذلیل کرتا ہے۔ اس پر طرح طرح سے ظلم و ستم روا رکھتا ہے مگر عاشق ہے کہ بے آبرو ہونے کے باوجود محبوب کے اُسی در اور اُسی کوپے کی خاک ہو کر پڑا رہتا ہے۔ اس کے برعکس خالد کی شاعری کا جہاں تک تعلق ہے اس میں غیرت مندی اور خودداری کا احساس ملتا ہے۔ ان کے یہاں خودداری کا یہ عالم ہے کہ ان کا محبوب اگر ان سے خفا ہو جاتا ہے، ملنا جُلنا چھوڑ دیتا ہے تو وہ بھی اس سے ملنے کی پرواہ نہیں کرتے۔

اُس نے آواز نہیں دی مجھ کو
اور میں بھی نہ گیا ہوں اب تک
خالد بشیر احمد کی یہ غیرت اور خودداری دیکھ کر قاری کا ذہن آتش کے اس شعر کی جانب چلا جاتا ہے۔

جب وہ نہیں ملتا ہے تو ہم بھی نہیں ملتے
غیرت کا اب اپنی بھی تقاضا ہے تو یہ ہے
یہ صحیح ہے کہ خالد بشیر احمد اپنے روٹھے ہوئے محبوب کو منانے کے لیے اس کے پیچھے نہیں جاتے۔ تاہم اسے اس کی خطاؤں کا شدید احساس دلاتے ہیں۔ پھر اسے ایسے حسین انداز سے دعوت دیتے ہیں کہ وہ مجبور ہو کر ان کی طرف چلا آتا ہے۔ محبوب کی خطاؤں کو معاف کرنا اگرچہ خالد کا دھیرہ ہے مگر وہ بھی تو ایک مدت سے اس کی راہ تک رہے ہیں۔

ایک مدت سے تیری راہ تکی ہے میں نے
صبح کے بھولے چلو شام ہوئی گھر آؤ

خالد بشیر احمد کی شاعری کا عاشق بھی محبوب کے ہجر میں آہیں بھرتا ہے، نالہ و فریاد کرتا ہے اور اس کی بے وفائی کا شکوہ بھی کرتا ہے۔ لیکن چاک گریباں ہو کر صحراؤں کی خاک نہیں چھانتا۔ اس کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر محبوب اُسے بھولنے کا اختیار دیتا ہے تو وہ اُسے بھلا بھی دیتا

ہے

میں تجھ کو بھولنا چاہوں تو بھول بھی پاؤں
بس اک ذرا مجھے خود اختیار رہنے دے
خالد کی شاعری میں جب محبوب کی بے وفائی کا شکوہ ہوتا ہے تو اس میں بھی عاشق کی
سادگی جھلکتی ہے۔

اتنی دور سے آتے ہو
بس اک رسم نبھاتے ہو

آگ تماشا بھی دیکھو
چھوڑو پانی لاتے ہو

رات ہوئی سو جانے دو
کیوں بے کار ستاتے ہو

رسم دستور وفاداری ادا کس نے کی؟
تو نے جو مجھ سے وفا کی تو جفا کس نے کی؟

میں نے اپنا فرض نبھایا، بھول گیا
تم کو بھی کچھ یاد نہ آیا، بھول گیا؟

معمولی باتوں میں بھی آجائے گا
میرا دل کیا اعلیٰ ذات براہمن ہے؟
آدمی کے شعور میں کیا ہے اور غیر شعوری طور پر وہ کون سی حرکات کا مرتکب ہوتا ہے۔

عاشق ہزار قسمیں کھاتا ہے کہ میں اپنے معشوق کو بھلا دوں گا اور اس کا نام تک بھی اپنی زبان پر نہیں لاؤں گا لیکن اس کے باوجود اس کے قلب و ذہن سے محبوب کا نقش نہیں مٹتا۔ اگر اس کے لبوں پر محبوب کا نام ایک بار آجائے تو پھر بار بار آتا ہے اور اس عمل میں وہ ایک خاص لذت محسوس کرتا ہے۔ خالد بشیر احمد کا یہ شعر اس امر کی غمازی کرتا ہے۔

دریا کے پانیوں میں کوئی نقش چھوڑ دیں

اس شوق میں بھی ایک زمانہ گزر گیا

ہر شاعر نے اپنے محبوب کو خوبصورت کہا ہے۔ خالد بھی اپنے محبوب کو خوبصورت کہتے ہیں لیکن ان کا انداز فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ انہوں نے اس میں جذت پیدا کرنے کی بھرپور سعی کی ہے اور وہ بڑی حد تک اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

صدائیں آتی ہیں، چہرہ نظر نہیں آتا

وہ شخص خوبیوں والا نظر نہیں آتا

خوشبو تھی یا ہوا تھی میرے دل کے آس پاس

کیا تھا کہ جس کا نام بھی سوچا گیا نہ تھا

ان کا خیال ہے کہ اگر دلبر پہلو میں ہے تو سب کچھ اچھا لگتا ہے، ورنہ اس کی جدائی میں سب کچھ بے معنی ہے۔

یہ کسی شخص کے ہونے سے ہی سب اچھا ہے

ورنہ خوشبوئے گل و لمس ہوا بے معنی

خالد بشیر احمد جب محبوب کے خدو خال اور اس کے حسن و جمال کا تذکرہ کرتے ہیں تو ایک سماں باندھ دیتے ہیں۔

بھری جوانی اور اس پر یہ خدو خال ایسا

کہاں سے لائی ہو یہ حسن بے مثال ایسا

گلاب جسم سے خوشبو تمام لب سے ہے

وہ شخص جیسے گلوں کے حسب نسب سے ہے
 کبھی کبھی محبت میں ترکِ تعلق کی نوبت بھی آجاتی ہے اور جب عاشق اور معشوق کو
 اس مرحلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس نازک گھڑی میں خالد دل کو یوں تسلی دیتے ہیں۔
 یونہی کب کسی کا ہوا ہے کوئی
 محبت بھی کیا آسرا ہے کوئی

مہاجر پرندے، ہوا، خوشبوئیں
 کبھی روکنے سے رُکا ہے کوئی

محبتیں بھی نہیں ان کو روک پائی تھیں
 کہ شاخ شاخ کے ہی عندلیب تھے وہ بھی
 خالد کو اپنی وفا پہ ناز ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ابھی بھی گاؤں کے چوپال میں بزرگ کوئی
 وفا کے باب میں میری مثال دیتا ہے
 خالد بشیر احمد کا تصورِ عشق محدود نہیں ہے۔ وہ اپنے ارد گرد عشق و محبت کا حصار کھینچ کر
 زندگی کے مسائل اور عصری تقاضوں سے آنکھیں نہیں پُراتے۔ وہ عشق کو محبوب کی جلوہ گاہ تک
 محدود رکھنے کے بجائے اس میں ساری کائنات کو شامل کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے فرد کی
 محرومیوں اور نا کامیوں کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ اپنی ایک غزل میں انہوں نے اس کی
 یوں عکاسی کی ہے۔

بریدہ جسموں کے یہ اشتہار رکن کے ہیں
 کہاں کی میتیں، یہ سوگوار رکن کے ہیں

کسی کا سرگیا ہے اور کسی کی عزت بھی
 زمین گل تیرے دل میں مزار کن کے ہیں

ہتھیلیوں پہ سروں کو لیے گزرتے ہیں
حسب نسب سے طلبگار دارکن کے ہیں

بلا کی آندھیوں میں کون یہ شمار کرے
یہ پھول کن کے ہیں، یہ برگ و بار کن کے ہیں

یہ کس کی آنکھیں دریچوں سے لگ کے ہیں روتی
یہ خواب غنچے سر رہ گزار کن کے ہیں
خالد بشیر احمد نے زندگی کے کئی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق سے مسلسل نبرد آزما ہونے کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں ناامیدی اور مایوسی کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں کہیں اس طرح کے مضامین موجود ہیں وہ اپنا ایک الگ ہی لہجہ لیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان اشعار میں مایوسی اور ناامیدی کے ساتھ ساتھ ہمت اور حوصلے کا پرتو بھی جھلکتا ہے۔ ان کی ایسی غزلوں کے مضامین ان کے مشاہدے اور تجربے کا آئینہ ہیں۔

خواہشوں کے بیکراں صحرا سے شاید آج پھر
دل کے دروازے تلک کوئی نہ کوئی آئے گا

میرا قاتل ہے کہ ہے میرا مسیحا کہدے
یوں میرے پاس کئی روپ بدلتا کیوں ہے

میں بے ضمیر رہ کے بڑا معتبر رہا
میں نے پیسہروں کا اثر ہی لیا نہ تھا
انسان خواہشات کا پتلا ہے۔ اس کے دل میں ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی

ہے۔ ایک خواہش پوری ہو جائے تو سینکڑوں نئی خواہشیں اس کے اندر جنم لیتی ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کی ہر خواہش پوری ہو لیکن وہ بے بس اور مجبور ہے۔ اس کی زندگی اس کے ساتھ وفا نہیں کرتی کیوں کہ وہ تو بہت مختصر ہے۔ وہ فقط رقصِ شرر ہے۔ زندگی کی ناپائنداری کو خالد نے اس شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔

زندگی میں آرزوئیں بے حساب
زندگی کیا ہے فقط رقصِ شرر

زندگی میں انسان کو نام و نمود کی شدید خواہش رہتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد لوگ اس کا نام لیں۔ اسے یاد کریں اور وہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہے۔ زندگی کے اس پہلو کو خالد بشیر اپنے ایک شعر میں یوں پیش کرتے ہیں۔

لوحِ دنیا پر کوئی تحریر ایسی چھوڑیے

اہلِ دنیا کے لیے پھر جاوداں ہو جائیے

انسان کو زندگی میں کبھی کبھی زندگی کے ظلم و ستم سے سرگراں ہونے کا حوصلہ بھی پیدا کرنا چاہیے۔ اس طرح سے وہ اپنے آپ پر کم از کم مہربان تو ہو سکتا ہے:

زندگی کے ظلم سے اب سرگراں ہو جائیے

کچھ تو اپنے آپ پر بھی مہربان ہو جائیے

خالد بشیر احمد حد درجہ حساس ہیں۔ اس لیے جہاں کہیں بھی وہ نا انصافی یا زیادتی دیکھتے ہیں تو ملول ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی کو تڑپتا ہوا دیکھ کر خود بھی تڑپ اٹھتے ہیں اور سماج میں ہو رہی ایسی نا انصافیوں اور زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔

تہمتوں کی پھوار ہے گھر میں

اور چھت پر کوئی سسکتا ہے

میرا تو کچھ نہیں ہے میں ویسے بھی کون ہوں

اس عہدِ آگہی کے پیہر بدل گئے

خالد بشیر احمد نہ صرف خلوص و صداقت کا مظاہرہ ہیں بلکہ وہ سادہ طبیعت کے مالک بھی ہیں اور یہی خلوص و صداقت اور سادگی ان کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قارئین کو ان کے کلام میں خلوص و صداقت کا جو برملا اظہار ملتا ہے وہ ان کا ایک منفرد انداز ہے۔

صرف لہجہ ہی جارحانہ ہے
میری نیت تو دوستانہ ہے

کب تم سے محبت کا صلہ مانگ رہا ہوں
ناداں ہوں جفاؤں پہ جفا مانگ رہا ہوں

اس طرح تقاضوں پہ تو برہم نہ ہوا کر
محرومی قسمت کی وفا مانگ رہا ہوں
خالد بشیر احمد گو خاموش طبع اور خلوت پسند شخص ہیں مگر دوستوں کا وسیع حلقہ رکھتے ہیں اور کبھی کبھی انہیں اپنے دوستوں سے گلہ شکوہ بھی رہتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ بڑے نرالے انداز میں شکوہ سنجہ ہوتے ہیں۔

میرے رفیق تھے لیکن عجیب تھے وہ بھی
ضرورتوں پہ کہاں کے قریب تھے وہ بھی

ایک شاعر یا ادیب کی شخصیت کو پروان چڑھانے میں اُس ماحول کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے جس میں وہ پرورش پاتا ہے۔ خالد بشیر احمد نے بھی جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی اس کا اثر ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں کہ شاعر اپنے عہد سے کبھی بھی خوش نہیں ہوتا۔ اسے اپنا عہد سب سے مشکل نظر آتا ہے۔ اپنے عہد کے مسائل، مشکلات اور رکاوٹیں اس کے دل کو جہاں مسلسل تڑپاتی ہیں وہاں اسے شعری غذا بھی مہیا کرتی ہیں۔

خالد بشیر احمد جب کسی واقعے سے متاثر ہوتے ہیں تو اس کے ردِ عمل کے طور پر فوراً شعر نہیں کہتے بلکہ یہ خیال یا واقعہ ان کے دماغ میں اپنے وجود کا مسلسل احساس دلاتا رہتا ہے

یہاں تک کہ وہ شعر کی صورت اختیار کرتا ہے۔

سینے میں کسک، آنکھ میں منظر نہیں کوئی
دے آگ کو دامن سے ہوا، ڈر نہیں کوئی

سفر میں کچھ نہ کچھ رنج سفر بھی ہونا تھا
جو سر لیا ہے تو پھر دردِ سر بھی ہونا تھا
خالد بشیر احمد اگرچہ جدید دور کی غزل کے شاعر ہیں مگر ان کے کلام میں غزل اور اردو
شاعری کی روایتی قدروں کا احترام بھی ملتا ہے۔ انہوں نے قدیم اور جدید روایتوں کے حسین
امتزاج سے اردو غزل کو ایک نیا اسلوب و آہنگ دینے کی سعی کی ہے۔

یا میری بد قسمتی کا ذکر رہنے دیجیے
یا حریفوں کے مقابل ہم زباں ہو جائیے

معیارِ اہل جفا بھی بدل گیا ہے کیا
کہ اب کے وہ بھی ہمیں مہرباں سا لگتا ہے
خالد بشیر احمد کی غزلوں کے مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی کی
جن تلخ و شیریں حقیقتوں کا بغور مشاہدہ کیا ہے، انہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے ایسے خوبصورت
شعری پیکر عطا کیے ہیں کہ قارئین کے اذہان پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ وہ
سیدھے سادے الفاظ میں ایسی بات کہہ دیتے ہیں جو دلوں میں اتر جاتی ہے۔
نہ کوئی وعدہ نہ اُمید ہی مگر پھر بھی
سیاہ رات کو پلکوں پہ لے کے بیٹھا تھا

ذائقہ بیتے ہوئے ایام کا
تلخ بھی، نمکین بھی، شیرین بھی

کیا خبر ہے کہ کہاں وقت کی نظریں بدلیں
اپنے اشکوں کے خزانوں کو سنبھالے آئے
خالد بشیر احمد کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی جدت اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اُن کے
لب و لہجہ اور اسلوب و انداز کے پیش نظر بعض ناقدین اور اہل نظر اُن کے کلام میں ناصر کاظمی
کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل، سابق صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ ایف۔
سی۔ کالج لاہور، خالد بشیر احمد کے شعری مجموعے ”صدائے نیم شب“ کے حوالے سے ایک
تاثراتی خط میں لکھتے ہیں:

”مجھے آپ کے کلام کے مطالعے سے بے حد مسرت حاصل
ہوئی۔ آپ کی فکر میں تازگی، تخیل میں تنوع اور ادائیگی میں ندرت ہے۔
آپ پر ناصر کاظمی کا اثر نمایاں ہے۔ ناصر مرحوم سے قربت کی بنا پر مجھے
یہ فکری ارتباط بہت اچھا معلوم ہوا“

ریاست جموں و کشمیر کے نامور شاعر، ادیب اور نقاد جناب پروفیسر حامدی کا شمیری
”صدائے نیم شب“ کے مقدمے میں یوں رقمطراز ہیں:

”ان کے لہجے، زبان اور طرز فکر پر نئی شاعری کے بعض
علمبرداروں مثلاً ناصر کاظمی کی پہلی بارش کی غزلوں کے اثرات مرتسم ہیں۔“
لیکن یہ بات درست نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خالد بشیر احمد کا اپنا ایک منفرد
رنگ ہے جسے انہوں نے ہر جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

”جناب حامدی کا شمیری کو میرے لہجے، زبان اور طرز فکر پر
جو ناصر کاظمی کے اثرات نظر آئے ان کے بارے میں عرض ہے کہ یہ
مجموعہ (صدائے نیم شب) چھپنے تک میں ناصر کاظمی یا اُن کی شاعری
سے متعارف نہیں تھا۔“

خالد بشیر احمد کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا اپنا ایک
اسلوب اور اندازِ بیاں ہے۔ یہ شاعر کی باطنی کیفیات، تجربات و مشاہدات کا ایسا خزانہ ہیں جن

سے شاعری واردات قلبی پر روشنی پڑتی ہے۔ اُن کی غزلوں میں جدتِ فکر اور غزل کے روایتی اسلوب سے کہیں کہیں شعوری انحراف بھی ملتا ہے۔ روایتی اسلوب سے کسی حد تک انحراف اور جدت طرازی کے شوق میں وہ کئی ایک مقام پر آوارگی کیف کے شکار نظر آتے ہیں لیکن ایسی سعی عمل سے انہوں نے جہاں کہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر گریز کیا ہے، شاعری نقطہ عروج کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تنہائیوں کی شند ہوائیں بھی میرے نام
بے خواب کروٹوں کی جلن بھی میرے لیے

جھنڈ کے جھنڈ اُداسی کے پرندے اُترے
دل کسی ٹھہری ہوئی جھیل کا منظر سا ہے

ہر چیز بانٹنے کی گھڑی آن پڑی ہے
میں اپنے لیے اپنا خدا مانگ رہا ہوں
خالد بشیر احمد اگرچہ براہ راست قدیم شعراء سے متاثر نہیں معلوم ہوتے مگر ان کے بعض اشعار پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن بعض قدیم شعراء کے اشعار اور مصرعوں کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اُن کا یہ شعر:

وفا کا دور ہے جب سے زوال آمادہ

یہ دل ہوا ہے زیادہ وصال آمادہ

پڑھنے کے بعد فیض احمد فیض کا یہ خوبصورت شعر لبوں پر آ جاتا ہے:

نہ پوچھ جب سے تیرا انتظار کتنا ہے

کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں

یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر
ہوتے ہیں حادثات سے اب دل ملول کم

کیا خبر ہے کہ کہاں وقت کی نظریں بدلیں
اپنے اشکوں کے خزانوں کو سنبھالے آئے
خالد بشیر احمد کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی جدت اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اُن کے
لب و لہجہ اور اسلوب و انداز کے پیش نظر بعض ناقدین اور اہل نظر اُن کے کلام میں ناصر کاظمی
کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل، سابق صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ ایف۔
سی۔ کالج لاہور، خالد بشیر احمد کے شعری مجموعے ”صدائے نیم شب“ کے حوالے سے ایک
تاثراتی خط میں لکھتے ہیں:

”مجھے آپ کے کلام کے مطالعے سے بے حد مسرت حاصل
ہوئی۔ آپ کی فکر میں تازگی، تخیل میں تنوع اور ادائیگی میں ندرت ہے۔
آپ پر ناصر کاظمی کا اثر نمایاں ہے۔ ناصر مرحوم سے قربت کی بنا پر مجھے
یہ فکری ارتباط بہت اچھا معلوم ہوا“

ریاست جموں و کشمیر کے نامور شاعر، ادیب اور نقاد جناب پروفیسر حامدی کا شمیری
”صدائے نیم شب“ کے مقدمے میں یوں رقمطراز ہیں:

”ان کے لہجے، زبان اور طرزِ فکر پر نئی شاعری کے بعض
علمبرداروں مثلاً ناصر کاظمی کی پہلی بارش کی غزلوں کے اثرات مرتسم ہیں۔“
لیکن یہ بات درست نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خالد بشیر احمد کا اپنا ایک منفرد
رنگ ہے جسے انہوں نے ہر جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

”جناب حامدی کا شمیری کو میرے لہجے، زبان اور طرزِ فکر پر
جو ناصر کاظمی کے اثرات نظر آئے ان کے بارے میں عرض ہے کہ یہ
مجموعہ (صدائے نیم شب) چھپنے تک میں ناصر کاظمی یا اُن کی شاعری
سے متعارف نہیں تھا۔“

خالد بشیر احمد کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا اپنا ایک
اسلوب اور اندازِ بیاں ہے۔ یہ شاعر کی باطنی کیفیات، تجربات و مشاہدات کا ایسا خزانہ ہیں جن

سے شاعر کی واردات قلبی پر روشنی پڑتی ہے۔ اُن کی غزلوں میں جدتِ فکر اور غزل کے روایتی اسلوب سے کہیں کہیں شعوری انحراف بھی ملتا ہے۔ روایتی اسلوب سے کسی حد تک انحراف اور جدت طرازی کے شوق میں وہ کئی ایک مقام پر آوارگی کیف کے شکار نظر آتے ہیں لیکن ایسی سعی عمل سے انہوں نے جہاں کہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر گریز کیا ہے، شاعری نقطہ عروج کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تنہائیوں کی تہند ہوائیں بھی میرے نام
بے خواب کروٹوں کی جلن بھی میرے لیے

جھنڈ کے جھنڈ اُداسی کے پرندے اترے
دل کسی ٹھہری ہوئی جھیل کا منظر سا ہے

ہر چیز بانٹنے کی گھڑی آن پڑی ہے
میں اپنے لیے اپنا خدا مانگ رہا ہوں
خالد بشیر احمد اگرچہ براہ راست قدیم شعراء سے متاثر نہیں معلوم ہوتے مگر ان کے بعض اشعار پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن بعض قدیم شعراء کے اشعار اور مصرعوں کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اُن کا یہ شعر:

وفا کا دور ہے جب سے زوال آمادہ

یہ دل ہوا ہے زیادہ وصال آمادہ

پڑھنے کے بعد فیض احمد فیض کا یہ خوبصورت شعر لبوں پر آ جاتا ہے:

نہ پوچھ جب سے تیرا انتظار کتنا ہے

کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں

یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر
ہوتے ہیں حادثات سے اب دل ملول کم

کیا خبر ہے کہ کہاں وقت کی نظریں بدلیں
اپنے اشکوں کے خزانوں کو سنبھالے آئے
خالد بشیر احمد کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی جدت اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ اُن کے
لب و لہجہ اور اسلوب و انداز کے پیش نظر بعض ناقدین اور اہل نظر اُن کے کلام میں ناصر کاظمی
کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل، سابق صدر شعبہ اُردو گورنمنٹ ایف۔
سی۔ کالج لاہور، خالد بشیر احمد کے شعری مجموعے ”صدائے نیم شب“ کے حوالے سے ایک
تاثراتی خط میں لکھتے ہیں:

”مجھے آپ کے کلام کے مطالعے سے بے حد مسرت حاصل
ہوئی۔ آپ کی فکر میں تازگی، تخیل میں تنوع اور ادائیگی میں ندرت ہے۔
آپ پر ناصر کاظمی کا اثر نمایاں ہے۔ ناصر مرحوم سے قربت کی بنا پر مجھے
یہ فکری ارتباط بہت اچھا معلوم ہوا“

ریاست جموں و کشمیر کے نامور شاعر، ادیب اور نقاد جناب پروفیسر حامدی کا شمیری
”صدائے نیم شب“ کے مقدمے میں یوں رقمطراز ہیں:

”ان کے لہجے، زبان اور طرز فکر پر نئی شاعری کے بعض
علمبرداروں مثلاً ناصر کاظمی کی پہلی بارش کی غزلوں کے اثرات مرتسم ہیں۔“
لیکن یہ بات درست نہیں ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ خالد بشیر احمد کا اپنا ایک منفرد
رنگ ہے جسے انہوں نے ہر جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

”جناب حامدی کا شمیری کو میرے لہجے، زبان اور طرز فکر پر
جو ناصر کاظمی کے اثرات نظر آئے ان کے بارے میں عرض ہے کہ یہ
مجموعہ (صدائے نیم شب) چھپنے تک میں ناصر کاظمی یا اُن کی شاعری
سے متعارف نہیں تھا۔“

خالد بشیر احمد کی غزلوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان کا اپنا ایک
اسلوب اور اندازِ بیاں ہے۔ یہ شاعری باطنی کیفیات، تجربات و مشاہدات کا ایسا خزانہ ہیں جن

سے شاعر کی واردات قلبی پر روشنی پڑتی ہے۔ اُن کی غزلوں میں جدتِ فکر اور غزل کے روایتی اسلوب سے کہیں کہیں شعوری انحراف بھی ملتا ہے۔ روایتی اسلوب سے کسی حد تک انحراف اور جدت طرازی کے شوق میں وہ کئی ایک مقام پر آوارگی کیف کے شکار نظر آتے ہیں لیکن ایسی سعی عمل سے انہوں نے جہاں کہیں شعوری یا غیر شعوری طور پر گریز کیا ہے، شاعری نقطہ عروج کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تہائیوں کی تند ہوائیں بھی میرے نام
بے خواب کروٹوں کی جلن بھی میرے لیے

جھنڈ کے جھنڈ اُداسی کے پرندے اترے
دل کسی ٹھہری ہوئی جھیل کا منظر سا ہے

ہر چیز بانٹنے کی گھڑی آن پڑی ہے
میں اپنے لیے اپنا خدا مانگ رہا ہوں
خالد بشیر احمد اگرچہ براہ راست قدیم شعراء سے متاثر نہیں معلوم ہوتے مگر ان کے بعض اشعار پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن بعض قدیم شعراء کے اشعار اور مصرعوں کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اُن کا یہ شعر:

وفا کا دور ہے جب سے زوال آمادہ

یہ دل ہوا ہے زیادہ وصال آمادہ

پڑھنے کے بعد فیض احمد فیض کا یہ خوبصورت شعر لبوں پر آ جاتا ہے:

نہ پوچھ جب سے تیرا انتظار کتنا ہے
کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں

یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر
ہوتے ہیں حادثات سے اب دل ملول کم

Digitized By eGangotri

مذکورہ بالا شعر پڑھنے کے بعد غالب کا یہ شعر ذہن میں آتا ہے:

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

خالد کا یہ مصرع۔

مفلسی کھودیتی ہے سب آدمی کا اعتبار

پڑھ کر ولی دکنی کا یہ مشہور شعر ذہن کے درپچوں سے نکرانے لگتا ہے:

مفلسی سب بہار کھوتی ہے

مرد کا اعتبار کھوتی ہے

لوح دنیا پر کوئی تحریر ایسی چھوڑیے

اہل دنیا کے لیے پھر جاوداں ہو جائے

پڑھ کر شیخ ابراہیم ذوق کا یہ خوبصورت مطلع یاد آتا ہے۔

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا

پل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا

خالد کا یہ مصرعہ

سفر ہے لازمی تو دل میں اضطراب نہ رکھ

پڑھنے کے بعد آتش کا یہ شعر پیش نظر ہو جاتا ہے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

خالد بشیر احمد اپنے عصری حالات سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔ وہ اپنے دور کی

سماجی و سیاسی زندگی کے ایک ایک پہلو پر نظر رکھتے ہیں۔ نئی حسیت کی پیکر تراشی کرتے ہوئے وہ

جو کچھ کہتے ہیں وہ ہمارے دور کا المیہ ہے۔ ان کے حسی تجربات کا خمیر عصر حاضر کی اس

پیچیدگی، کرب و انتشار اور یاسیت سے اٹھا ہے جو اس وقت ایک آفاقی مسئلے کی حیثیت اختیار

کر گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ حاضر کے انسان کی نامرادیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کو جس طرح انہوں نے اشعار کا جامہ پہنایا ہے وہ ایک باکمال شاعر ہی کا وصف ہے۔ اس ضمن میں اُن کی ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

صبح کا سورج یہاں تہائیاں پھیلانے کا
رات کی تاریکیوں میں ہی نگر مٹ جائے گا

پانیوں پر فوج کا پہرہ کڑا ہو جائے گا
ایک قطرے کے لیے ہر شخص کو ترسائے گا

گھر کی دیواریں سبھی اندر سے ہو گئی منہدم
اور دروازے پہ تالا جھولتا رہ جائے گا

بے تحاشا رات کے اندھے سفر میں بھاگ جا
کچھ نہیں معلوم کیا لے کر سویرا آئے گا

اس غزل کے اشعار خالد کی عصری آگہی کی نمائندگی کرتے ہیں:

ہوائے زرد تھی، موسم بڑا بے اعتباری تھا
اب ان حالات میں آنا مگر بے اختیاری تھا

فصیلِ شہر پر لہرا رہا تھا امن کا پرچم
درونِ شہر لیکن راستوں سے خون جاری تھا

نگاہوں نے لیا پیغام کی ترسیل کا ذمہ
لبوں پر احتیاطاً جب سکوتِ مرگ طاری تھا

کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ یہی حصول پر گزری
سبھی کہتے رہے قاتل کا فعلِ اضطراری تھا

نگاہِ دل سے ہی اُس شخص کی پہچان ممکن تھی
تخاطبِ دوستانہ تھا، تکلمِ کاروباری تھا

خالد بشیر احمد نے اپنی شاعری میں وادی کشمیر کے کر بناک اور اضطراب سے بھرے
واقعات کی بھی بالواسطہ ترجمانی کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کشمیر کی سیاسی اور سماجی اُتھل
پُتھل نے ان کے دل پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ گزشتہ تین چار دہائیوں میں ایسے حالات
پیدا ہوئے ہیں کہ یہاں کا ہر شخص ستم زدہ نظر آتا ہے۔ ہر کوئی بے بس اور لاچار ہے، ہر طرف ظلم
و ستم اور قتل و غارت کا بازار گرم ہے۔ ہر طرف بے بسی اور کسمپرسی کا عالم ہے۔ ان حالات کو
خالد بشیر احمد نے شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہاں کے عوام کی اس بے
کسی کی اپنے اشعار میں بھرپور عکاسی کی ہے۔

ہوتا نہیں ہوائے بلا کا نزول کم
اس گلِ زمیں پہ کھلتے نہیں پھر بھی پھول کم

یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر
ہوتے ہیں حادثات سے اب دل ملول کم

سیرابیِ زمینِ وطن کا خیال ہے
اپنے لہو کا پیشِ نظر ہے حصول کم

کچھ ابتلا میں تمہیں اہلِ فلسطین نہیں
تمہارے حال سا ہے ہو بہو ہمارا بھی

زمیں پہ موسمِ ظلم و ستم ہے وہ جس کے
دھوئیں میں دیدہ ہر مہر و ماہ جاتی ہے

لہو لہو تھے مناظر گھروں سے آگے بھی
لٹا چکے تھے بہت کچھ سروں سے آگے بھی

ہوا کا رخ بھی مخالف، گھنیرے بادل بھی
پرندے! سوچ لے اپنے پروں سے آگے بھی
اس شعر میں آج کے اہل کشمیر کی ہو بہو ترجمانی ملتی ہے جب کہ سارا کشمیر سوگوار بنا ہوا ہے:

سوگواروں کو تسلی کون دے
حالِ سب کا آج کل زیروزبر

کشمیر کی اس حد تک ابتری کے باوجود خالد بشیر احمد موجودہ حالات سے مایوس نہیں ہیں۔ انہیں اپنا مستقبل روزِ روشن کی طرح تابناک نظر آتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ لہو بے کار نہیں جائے گا۔ ہماری قربانیاں رنگ لائیں گی اور یہ پُر آشوب اور پُر خطر دور ختم ہو جائے گا۔ ایک بار پھر نئی اور خوشحال زندگی کی شروعات ہوگی اور ہم ترقی کی راہ پر گامزن ہوں گے۔

روشنی میرے گھر ٹھہرے گی
سورج دیکھ کے جلتا ہوگا

آنے لگے ہیں صاف نظر رہ گزر کے موڑ
ہوتی گئی لہو کی پھواروں سے دھولِ کم
۱۹۶۰ء کے بعد اُردو کے شعری رویوں میں جو تبدیلیاں آئیں اور اُن کے تحت
جدیدیت کی اصطلاح کے ساتھ شاعری میں بھی نئے نئے تجربے روبہ عمل آئے، خالد بشیر احمد

بھی ان سے متاثر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں اپنی وضاحت اور مقصدیت سے انحراف کے ساتھ ساتھ خود کلامی، ایجاز اور بلا واسطہ جمالیاتی اظہار کی کوشش ملتی ہے:

تیلیوں کا شمار کرتا ہے
جانے کب سے سڑک پہ لٹکا ہے

مجھے لے کے تنہائیاں اپنے ساتھ
یہ کن راستوں پر بھٹکتی رہیں
خالد بشیر احمد کی شاعری میں تنہائی اور اندرونی کرب کا شدید احساس جا بجا ملتا ہے۔
یہ احساس ان کے گہرے مشاہدات اور وسیع تجربات کا آئینہ دار ہے۔ اس کے علاوہ ان کے
یہاں طنز کی ایک لطیف چمک بھی ملتی ہے۔

کوئی لفظ کہنے کی فرصت نہ تھی
زبانوں کے ذمے بڑا کام تھا

میرا تو کچھ نہیں ہے میں ویسے بھی کون ہوں
اس عہدِ آگہی کے پیہر بدل گئے
خالد بشیر احمد کے متعدد اشعار ایسی اعلیٰ کیفیت کے حامل ہیں کہ وہ قطرہ میں قلمزم کی
حیثیت رکھتے ہیں

میں بے ضمیر رہ کے بڑا معتبر رہا
میں نے پیہروں کا اثر ہی لیا نہ تھا
یہ شعر عہدِ حاضر کی بدلتی ہوئی اقدار کا مرقع ہے۔ یہ دور اہل نظر کا نہیں بلکہ کم سواد اور
کوتاہ میں کج رویوں کا ہے:

غموں کی بارشوں میں دل بہت اُداس ہوا
اب اپنا چہرہ پروں میں چھپائے رہتا ہوں

موجودہ دور میں شناختِ ذات کا مسئلہ تقریباً ہر فنکار کو درپیش ہے اور یہی احساس باہر سے اندر کی جانب فنکار کی مراجعت اور احساسِ تنہائی کی شدت کا سبب بھی ہے۔ خالد بشر احمد بھی اس احساس سے خالی نہیں ہیں۔ تنہائی، اضمحلال اور شناخت کا کرب ان کی شاعری میں کبھی اس قوت سے ابھرتا ہے کہ وہ فرار اور رہبانیت کی حدوں کو چھوٹے چھوٹے بچ نکلتے ہیں۔ لیکن یہ عنصر معاشرتی عوامل کا ردِ عمل ہے۔ وہ شکایتی لب و لہجہ اختیار کر کے معاشرتی زندگی سے اپنی گہری وابستگی کا بلا واسطہ یوں اعلان بھی کرتے ہیں۔

تو میرا خوف، تیری ذات کا ڈر ہوں میں بھی
تیرے آنگن میں کھڑا ایک شجر ہوں میں بھی

تنہا پیڑ ہوں چوراہے کا
بچوں کی زد میں آیا ہوں
یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جا بجا خود کلامی اور تلاشِ ذات کا شدید احساس ملتا

ہے

اپنے ہی گھر میں مجھ کو نہ پہچان مل سکی
میرا شمار بس یونہی پر چھائیوں میں تھا
شاعری ہو یا نثر، انداز و اسلوب اور زبان و بیان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ آتش کے
نزدیک تو شعر میں بندشِ الفاظ زیور میں گلیں جڑنے کے مترادف ہے
بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشِ مرصع ساز کا
غالب بھی اندازِ بیاں کا بڑا قائل نظر آتا ہے:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا
جوشِ ملیح آبادی کے نزدیک اگر معمولی سے معمولی بات بھی بہتر انداز و اسلوب میں

کہی جائے تو زمانے بھر میں وجود کی کمی ہے۔ چال کی یہ ہے کہ وہ بہتر انداز و اسلوب ہے کیا؟
 ولیم ورڈز ورثہ بول چال کی زبان کو شعر و شاعری کے لیے بہتر خیال کرتا ہے۔ کولرج کے
 نزدیک شعر کی تعریف یہ ہے کہ بہترین الفاظ بہترین ترتیب کے ساتھ ہوں۔ خالد بشیر احمد کے
 کلام کا مطالعہ کرتے وقت یہ خصوصیات نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ انہوں نے اپنے
 جذبات و احساسات اور تجربات و مشاہدات کے موثر اظہار کے لیے عام بول چال کی زبان بھی
 استعمال کی ہے اور عام لب و لہجہ سے ہٹ کر ایسا لب و لہجہ بھی اختیار کیا ہے جس کی بدولت ان
 کے اشعار میں نئے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں شعری زبان پر قدرت حاصل ہے اور انتخاب
 الفاظ کا ہنر وہ بخوبی جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بندش الفاظ اور انتخاب الفاظ کے ہنر
 سے عام بول چال کی زبان کو تخلیقی اور شعری زبان بنا لیا ہے۔ خالد بشیر احمد کا یہ انداز ملاحظہ ہو

پھول، دھنک، خوشبو، قتلی

یہ القاب تمہارے نام

اک اک سانس ہے اک اک شعر

میری کتاب تمہارے نام

آنگن آنگن، کوچہ کوچہ ایک سراب
 اس بستی کا سارا نقشہ ایک سراب

اسی نے وار کیا مجھ پہ دوستوں جیسا
 یہ شخص پہلے ملا مجھ سے دشمنوں کی طرح

صحیح کہ بات بڑی صاف صاف کہتا ہے
 مگر یہ شخص کوئی بدزبان سا لگتا ہے

کوئی خواب، نہ پھول نہ کوئی خواہش ہے
زیست ترے بن کتنی بے اسباب ہوئی

الفاظ کبھی زخم کا مرہم بھی ہوئے ہیں
دریاؤں کی گہرائی کو کنکر نہیں بھرتے

خالد بشیر احمد کے یہاں لب و لہجہ کی تازگی کے علاوہ زبان و بیان کا اسلوب بھی حد درجہ تک رچا اور منجھا ہوا ملتا ہے۔ ان کے اشعار میں الفاظ کا استعمال منفرد انداز میں ہوا ہے۔ صحر، سمندر، گھر، دیوار، شام، رات، فصیل شب، دھوپ، سورج، بارش، برف، تلاش ذات اور بے چہرگی جیسے الفاظ نے ان کی شاعری کو نئے مفاہیم عطا کیے ہیں۔ وہ اپنے شعری اظہار کے لیے منفرد زبان خلق کرتے ہیں جس میں آن بان، تازہ کاری اور قدیم و جدید روایات کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے:

قرین جاں کھلے ہیں جسے پامین و گلاب
یہ کس کمال کی خوشبو گل سخن میں ہے

خالد بشیر احمد نے بعض ایسی نادر تشبیہات اور تراکیب تراشی ہیں کہ قاری پڑھنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ خالد بشیر احمد اپنے معاصرین میں ایک منفرد اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ خالد بشیر احمد کے کلام کی ایک خصوصیت نغمگی بھی ہے۔ ان کی غزلوں میں ہمیں ایک مخصوص ترنم، موسیقیت اور شیرینی ملتی ہے۔ انہوں نے چھوٹی اور بڑی بحرؤں کا فنکارانہ استعمال کر کے بہت ہی عمدہ اشعار تخلیق کیے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ انہیں چھوٹی بحریں استعمال کرنے میں کمال کی مہارت حاصل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

نیندیں، خواب تمہارے نام
سب اسباب تمہارے نام

اک اک سانس ہے اک اک شعر
میری کتاب تمہارے نام

کہی جائے تو زمانے بھر میں وجود رکھتی ہے۔ کولرج کی یہ ہے کہ وہ بہتر انداز و اسلوب ہے کیا؟
ولیم ورڈز ورثہ بول چال کی زبان کو شعر و شاعری کے لیے بہتر خیال کرتا ہے۔ کولرج کے
نزدیک شعر کی تعریف یہ ہے کہ بہترین الفاظ بہترین ترتیب کے ساتھ ہوں۔ خالد بشیر احمد کے
کلام کا مطالعہ کرتے وقت یہ خصوصیات نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ انہوں نے اپنے
جذبات و احساسات اور تجربات و مشاہدات کے موثر اظہار کے لیے عام بول چال کی زبان بھی
استعمال کی ہے اور عام لب و لہجہ سے ہٹ کر ایسا لب و لہجہ بھی اختیار کیا ہے جس کی بدولت ان
کے اشعار میں نئے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں شعری زبان پر قدرت حاصل ہے اور انتخاب
الفاظ کا ہنر وہ بخوبی جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بندش الفاظ اور انتخاب الفاظ کے ہنر
سے عام بول چال کی زبان کو تخلیقی اور شعری زبان بنا لیا ہے۔ خالد بشیر احمد کا یہ انداز ملاحظہ ہو

پھول، دھنک، خوشبو، تتلی

یہ القاب تمہارے نام

اک اک سانس ہے اک اک شعر

میری کتاب تمہارے نام

آنگن آنگن، کوچہ کوچہ ایک سراب
اس بستی کا سارا نقشہ ایک سراب

اسی نے وار کیا مجھ پہ دوستوں جیسا
یہ شخص پہلے ملا مجھ سے دشمنوں کی طرح

صحیح کہ بات بڑی صاف صاف کہتا ہے
مگر یہ شخص کوئی بدزبان سا لگتا ہے

کوئی خواب، نہ پھول نہ کوئی خواہش ہے
زیست ترے بن کتنی بے اسباب ہوئی

الفاظ کبھی زخم کا مرہم بھی ہوئے ہیں
دریاؤں کی گہرائی کو کنکر نہیں بھرتے

خالد بشیر احمد کے یہاں لب و لہجہ کی تازگی کے علاوہ زبان و بیان کا اسلوب بھی حد درجہ تک رچا اور منجھا ہوا ملتا ہے۔ ان کے اشعار میں الفاظ کا استعمال منفرد انداز میں ہوا ہے۔ صحر، سمندر، گھر، دیوار، شام، رات، فصیل شب، دھوپ، سورج، بارش، برف، تلاش ذات اور بے چہرگی جیسے الفاظ نے ان کی شاعری کو نئے مفاہیم عطا کیے ہیں۔ وہ اپنے شعری اظہار کے لیے منفرد زبان خلق کرتے ہیں جس میں آن بان، تازہ کاری اور قدیم و جدید روایات کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے:

قرین جاں کھلے ہیں جیسے یاسمین و گلاب
یہ کس کمال کی خوشبو گلِ سخن میں ہے

خالد بشیر احمد نے بعض ایسی نادر تشبیہات اور تراکیب تراشی ہیں کہ قاری پڑھنے کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ خالد بشیر احمد اپنے معاصرین میں ایک منفرد اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ خالد بشیر احمد کے کلام کی ایک خصوصیت نغمگی بھی ہے۔ ان کی غزلوں میں ہمیں ایک مخصوص ترنم، موسیقیت اور شیرینی ملتی ہے۔ انہوں نے چھوٹی اور بڑی بحرؤں کا فنکارانہ استعمال کر کے بہت ہی عمدہ اشعار تخلیق کیے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ انہیں چھوٹی بحریں استعمال کرنے میں کمال کی مہارت حاصل ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

نیندیں، خواب تمہارے نام
سب اسباب تمہارے نام

اک اک سانس ہے اک اک شعر
میری کتاب تمہارے نام

پھول، دھنک، خوشبو، تتلی

یہ القاب تمہارے نام

شاخ کا درد مرا حصہ

سُرخ گلاب تمہارے نام

خالد بشیر احمد چھوٹی بحر کی طرح بڑی بحر میں غزل کہنے کا ملکہ بھی رکھتے ہیں۔ بڑی بحر میں ان کی ایک غزل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہوا یہ لکھا ہوا ہے دائم نوازشیں ہیں

سمندروں کے سفر میں سبزے کی خواہشیں ہیں

اُجاڑ کر جو یہاں کے آنگن چلا گیا ہے

نئی نئی بستیوں میں اُس کی رہائش ہیں

اُسے میں شاید ہلاک کر کے بھلا بھی دیتا

مگر مرے ہی لہو میں اُس کی سفارشیں ہیں

ہرے بھرے موسموں کی کس نے بشارتیں دیں

کہ چشم دیوار و در میں سمٹی گزارشیں ہیں

میں اپنے اندر شریر لڑکا لیے چلا ہوں

مرے قریب وجوار میں کیا نمائشیں ہیں

خالد بشیر احمد نے اپنی شاعری کے لیے نئی نئی تراکیب تراشی ہیں اور اپنے اشعار میں ان کا استعمال بڑے فن کارانہ انداز میں کیا ہے۔ چوراسے کا تنہا پیڑ، فٹ پاتھ، مضطرب

صدائیں، لنگڑاکتا، اداس پرندے، خواب جزیرے، سولی حویلی، زرد رُت، ضبط کی لہریں، دشتِ ناامیدی، شہر خیالات، آسیب زدگی، بارش کے چھینٹے، دروازے پہ جھولتا تالا، انتشارِ بدن، پرندوں کے غول، بخاری سے اٹھنے والا دھواں، آبیسی سناٹا، طائرِ اُمید، پیکرِ جاں، بدن کا شہر، فصلِ سراور شریر لڑکا، وغیرہ تراکیب محض کھوکھلی لفاظی نہیں ہے بلکہ یہ وہ حسی پیکر ہیں جو چھوٹے چھوٹے تجربات کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

آج کی نئی غزل میں پیکر تراشی کو جو اہمیت حاصل ہے خالد کو اس کا شعور ہے۔ انہوں نے نئے نئے پیکر تراش کر اپنی شاعری کو ایک نئی نہج عطا کی ہے۔

یہ زلزلہ بھی تباہی مچا گیا کیسی
مکان کھڑا تو ہے کمرہ نظر نہیں آتا

گھر کی دیواریں سبھی اندر سے ہونگی منہدم
اور دروازے پر تالا جھولتا رہ جائے گا

خالد بشیر احمد کو فنِ پیکر تراشی میں الفاظ کے انتخاب کے ساتھ ساتھ مختلف صنائع کے استعمال پر بھی مہارت ہے۔ تشبیہ، استعارہ، رعایتِ لفظی، حسنِ تعلیل، تلمیح وغیرہ ایسی صنعتیں ہیں جو پیکر تراشی میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ بلکہ یہ ایسے زیورات ہیں جن کی بدولت شاعر اپنے کلام کو زیادہ سے زیادہ فکر انگیز اور معانی آفریں بناتا ہے۔ جہاں تک خالد بشیر احمد کا تعلق ہے ان کے یہاں صنائع کا خوب استعمال ہوا ہے۔ ان کی بدولت انہوں نے اپنی شاعری میں جذبات اور ندرت پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ خالد بشیر احمد کے فنِ پیکر تراشی کے چند اور نمونے ملاحظہ ہوں:

بھری جوانی اور اس پر یہ خدو خال ایسا
کہاں سے لائی ہو یہ حسنِ ابے مثال ایسا

گلاب چہرے پہ رنگِ ملال روشن ہے
طلوعِ ماہ کے باہم زوال روشن ہے

ان کے ان اشعار میں صنعت تکرار کا استعمال ملاحظہ ہوں۔

آنگن آنگن، کوچہ کوچہ ایک سراب
اس بستی کا سارا نقشہ ایک سراب

اک اک سانس ہے اک اک شعر
میری کتاب تمہارے نام

لکھتے لکھتے کاغذ کے اک کونے پر
اس نے اپنے نام سے جوڑا میرا نام

خالد نے تشبیہ اور استعارے کا استعمال ایسی ہنرمندی کے ساتھ کیا ہے کہ شعر پڑھنے کے بعد ایک جیتی جاگتی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ چند تشبیہات کے نمونے پیش ہیں:

قرین جاں کھلے ہیں جیسے یاسمین و گلاب
یہ کس کمال کی خوشبو گل سخن میں ہے

نہا رہی ہے دھنک بھیگتے درختوں میں
خیال یار کوئی مور ہے کہ بن میں ہے

وہ شخص پھول سا خوش رنگ بھی ملائم بھی
کہ جس کے ہوتے سکوں دل کا پارہ پارہ ہے
خالد بشیر احمد کا استعاراتی انداز بھی معنی خیز ہے

قریب و دور تک سب زلزلے جھنجھوڑ گئے
شریر بچے مرے گھر کو توڑ پھوڑ گئے

بہت دنوں سے جسے دیکھنے کی خواہش تھی
وہ آفتاب جب نکلا تو سورہا تھا میں
خالد بشیر احمد کے اشعار میں منظر نگاری کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

چاند بھرپور تھا، موسم تھا گلابوں والا
میرے ہمراہ وہی شخص تھا خوابوں والا

پھولوں کو چھو کے سامنے آئی، گزر گئی
دروازے تری یاد کے وا کر گئی ہوا

جنگل، بارش، بھینی خوشبو، گھاس ہری
ایسا منظر اور آنکھوں کی پیاس ہری
کبھی کبھی خالد بشیر احمد سیدھے سادھے اور عام فہم الفاظ میں بڑی پنپنے کی بات کہہ
دیتے ہیں۔

اپنی اُننگی تھامے گھر سے نکلا تھا
لوٹا اپنا آپ گنوا کے اپنے ساتھ
خالد بشیر احمد کے کلام میں کمپیوٹر، سافٹ ویئر، فون، ڈاک، ٹرین، وائرس، ٹی۔وی،
ریڈیو وغیرہ الفاظ کا استعمال بھی بے حد متاثر کن ہے:

دوستی کا کمپیوٹر، اطمینان سے بھائی
اس کے سافٹ ویئر کو وائرس نہ ہو جائے
خالد بشیر احمد نے اپنے اشعار میں علامتی پیرایہ اظہار بھی اختیار کیا ہے۔ انہوں نے
صحرا سمندر، گھر، دیوار، شام، رات، برف، سورج، بارش وغیرہ جیسی علامتوں کو بڑی
قادر الکلامی سے اپنے اشعار میں برتا ہے اور نامانوس علامتوں سے حتی الامکان احتراز کرنے کی
کوشش کی ہے۔

سمندر کی تہوں میں اتر کے دیکھو تو
گہر سے خالی سبھی سپیاں نہیں ہونگی

لنگڑا کتا سوچ رہا ہے
سارا گاؤں کدھر گیا ہے

تنہا پیڑ ہوں چوراہے کا
بچوں کی زد میں آیا ہوں

پھر اس کے بعد کوئی شاخ بھی کھلی ہی نہیں

لہو وہ اس طرح ہر پیڑ سے نچوڑ گئے

خالد کی شاعری میں عشقِ حقیقی کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ ان کے بعض اشعار متصوفانہ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں نہایت پاکیزہ خیالات بڑے سادہ مگر دلکش انداز و اسلوب میں بیان ہوئے ہیں۔

مرے گناہ بہت ہیں تو کیا سزا دو گے؟

اے ذوالجلال، میں بندہ تو اک ذرا سا ہوں

پیاس بھی ہے اور کچھ تسکین بھی

ہاتھ میں دنیا بھی ہے اور دین بھی

خالد بشیر احمد کی شاعری جہاں ان کی عصری آگہی اور جہاں بنی کی عکاس و ترجمان ہے وہاں وہ ان کے گہرے اور مسلسل مشاہدات اور تجربات کی آئینہ دار ہے۔ انہوں نے غزلوں اور نظموں کے علاوہ حمد و نعت اور مناجات وغیرہ لکھ کر اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچایا ہے کہ انہیں مذہب سے بھی گہرا شغف ہے، وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ سے والہانہ عقیدت

رکھتے ہیں اور ان کا دل عشقِ الہی اور عشقِ رسول ﷺ سے سرشار ہے۔ اُن کے دوسرے مجموعہ کلام ”خواب پارہ“ کا آغاز ہی اس خوبصورت حمد سے ہوا ہے:

وہ پیاس دیتا ہے تو اس کے بعد پانی بھی
اسی یقین پہ ہے میری خوش گمانی بھی

اُسی کے حکم سے چلتی ہے جنگوں میں ہوا
وہی جو دیتا ہے دریاؤں کو روانی بھی

یہ رنگ سارے اسی کے زمیں پہ بکھرے ہیں
ہرا بھی، لال بھی، دھانی بھی، ارغوانی بھی

اسی کے نام سے گھلتے ہیں بابِ ذہنوں کے
اسی کی بخششیں الفاظ بھی، معانی بھی

اسی نے بیج کو دی ہے حیات، بادل میں
چھپائی برق بھی، سایہ بھی اور پانی بھی

نہیں ہے اس کے سوا لائقِ سجود کوئی
وہ لاشریک بھی، واحد بھی، غیر فانی بھی

اُن کی دوسری حمد کے یہ اشعار بھی توجہ طلب ہیں۔

فرشِ زمیں تا عالم بالا اللہ تعالیٰ آپ کا نام
سب سے ارفع، سب سے اعلیٰ اللہ تعالیٰ آپ کا نام

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک رہنے والی آپ کی ذات
اس کے بعد بھی رہنے والا اللہ تعالیٰ آپ کا نام
خالد بشیر کے یہ نعتیہ اشعار جذبہٴ حُبِ رسول ﷺ سے سرشار ہیں:

صورتِ حال ہے غمِ ناک، رسولِ عربیؐ
دامنِ صبر بھی صد چاک، رسولِ عربیؐ

جُو تری نظرِ کرم پار کروں گا کیسے
پُل صراط اتنا خطرناک، رسولِ عربیؐ

داورِ حشر بھی بخشے تو سفارش پہ تری
میرے اعمالِ شرمناک، رسولِ عربیؐ

نام لیوا ہوں ترا کچھ تو مداوا کیجیے
میں کہ بیٹھا ہوں سرِ خاک رسولِ عربیؐ

مجھ کو بھی اذنِ سفر سوئے مدینہ آقاؐ
اور تری آس ہو املاک، رسولِ عربیؐ

القصہ خالد بشیر احمد کی آواز موجودہ عہد کی جدید ترین غزل کی ایک ایسی متاثر کن اور توانا
آواز ہے جو غزل کے منظر نامے پر ابھرنے والی بے شمار آوازوں کے مقابلے میں تقلید سے
زیادہ اجتہاد کی طرف مائل ہے۔ ”صدائے نیم شب“ اور ”خواب پارہ“ کی ساری شاعری میں
جسی تجربات کی ایسی انوکھی اور اچھوتی مثالیں موجود ہیں جو خالد بشیر احمد کے انفرادی رنگ و
آہنگ اور لب و لہجہ کی غمازی کرتی ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر حامدی کا شمیری کی اس دلیل سے
سرموخراف نہیں کیا جاسکتا:

”خالد بشیر ریاست کے دیگر شعراء کی مانند اپنے تخلیقی سفر میں مصروف ہیں۔ وہ تجربے اور اظہار کی کشاکش سے گزرتے ہوئے اپنے شعری تجارب کی توسیع و تشکیل کر رہے ہیں۔ ان کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو انہیں ملکی شعراء کے ہم پلہ بنانے کی ضمانت فراہم کرتے ہیں اور معاصرین نقادوں کے لیے چیلنج کا حکم رکھتے ہیں۔“

خالد بشیر احمد بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ اردو شاعری میں غزل ان کا خاص میدان ہے۔ جس میں انہوں نے اپنے اصل جوہر دکھائے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انہیں غزل ہی کی وجہ سے سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن غزل کے ساتھ ساتھ انہوں نے نظم میں بھی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے اور اپنی ایک شناخت بھی قائم کی ہے۔ ان کی شاعری کا اگر بحیثیت مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان کی غزلوں اور نظموں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا بلکہ ان کے شعری مزاج سے آگہی حاصل کرنے کے لیے دونوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ انہوں نے نظموں میں بھی غزل ہی کی طرح زندگی کے عام پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

جہاں تک خالد بشیر احمد کی منظومات کا تعلق ہے ”صدائے نیم شب“ میں ان کی گل گیرہ نظمیں ہیں۔ جو سب کی سب بلا عنوان ہیں اور آزاد نظم کے زمرے میں آتی ہیں۔ ان نظموں میں وہی کر بنا کی، نامرادی اور اندرونی کشمکش موجود ہے جس کی ترجمانی انہوں نے غزلوں میں کی ہے۔ اس مجموعے میں شامل بعض نظموں میں مایوسی، شکست خوردگی اور تلاش ذات کا عنصر زیادہ نمایاں ہے۔

یہ دنیا چونکہ فانی ہے اور جب ایک انسان پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ اس کی زندگی ختم ہونے والی ہے۔ وہ محض چند دنوں کا مہمان ہے اور اُسے جلد ہی موت آنے والی ہے تو اس کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ اس کی تمام آرزوئیں اور امنگیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ اس حقیقت کو خالد نے ایک نظم میں یوں بیان کیا ہے۔

مجھے محسوس ہوگا زندگی کے ہمالے سے
 پھسل کر میں بڑی تاریک گھاٹیوں میں گر گیا ہوں
 ابھی کچھ روز پہلے میرے دل میں
 جو حوصلے اور ولولے تھے
 وہ برف بن کر یک لخت جم گئے ہیں
 مجھے محسوس ہوگا میری زندگی کے دن
 سمٹ کر اس قدر کم ہو گئے ہیں
 کہ میں آگے نکلنا درکنار
 چند ہی قدم چل کر تھک ہار جاؤں گا
 یہ سب کچھ اس لیے ہوگا کہ
 مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوگی
 کہ میرے جسم کے اندر
 کسی حصے کو کینسر ہو گیا ہے

”صدائے نیم شب“ کی نظموں کا مطالعہ کرتے وقت یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظمیں
 نہیں بلکہ کسی شکستہ دل عاشق کی دلدوز صدائیں ہیں جو قاری کے دل میں نشتر کی طرح اتر جاتی
 ہیں۔ اس قبیل کی دو مختصر نظمیں پیش خدمت ہیں۔

ایک بھونرا

جو کہ پھولوں سے بہت مانوس ہے
 اُڑا اُڑ کر گلستان میں آ گیا
 ایک دلکش پھول کے چاروں طرف
 سینکڑوں ناکام چکر کاٹ کر
 اس پریشانی میں ہے
 سوچتا ہے

مجھ میں نامردی کا یہ عنصر نہ تھا
 کل تجھے مجھ سے بہت دور چلے جانا ہے
 میں تجھے روک تو سکتا نہیں لیکن
 دل ہے میرا کہ ڈوبا ہی چلا جاتا ہے
 تو چلی جائے گی تو میرے یہاں
 تیری صورت کے نشان رہ جائیں گے
 تو میرے پاس نہ ہوگی لیکن
 تیری آواز کے سائے ہوں گے
 یہی سائے میرے تعاقب میں رہیں گے ہر دم
 میں جدھر جاؤں، جہاں بیٹھوں، جہاں پر ٹھہروں
 عکس در عکس تیرا چہرہ نظر آئے گا

خالد بشیر احمد کے دوسرے شعری مجموعے ”خواب پارہ“ میں ”دُعا“، ”والدہ مرحومہ کے نام“، ”ادبی منظر نامہ“، ”ایس پی کالج کاترانہ“ اور ”میں نے خواب دیکھے ہیں“ جیسی قابل مطالعہ منظومات شامل ہیں۔ اپنی نظم ”دُعا“ میں خالد بشیر اپنے ربّ ذوالجلال سے یوں دُعا گو ہیں۔

وہ عزم و حوصلہ ہمیں اے ذوالجلال دے
 سارا جہان جس کی ہمیشہ مثال دے

ہم پر ہمارے بعد بھی دنیا کو ناز ہو
 اے ربّ کائنات ہمیں وہ کمال دے

وہ ذہن کر عطا کہ زمانہ سنوار دیں
 وہ ہاتھ دے کہ تارے فلک سے اُتار دیں

جو کام ہم کریں وہ آپ اپنی مثال ہو
جو لفظ ہم کہیں وہ فضائیں نکھار دیں

ایسا کبھی جہاں میں نہ پروردگار ہو
تیرے سوا کسی پہ کوئی انحصار ہو
”والدہ مرحومہ کے نام“ خالد کی ایک ایسی نظم ہے جس میں انہوں نے اپنی ماں کی
محبت، عقیدت اور والہانہ جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے اور لفظ ”ماں“ کی ایک
خوبصورت تفسیر بھی پیش کی ہے۔ اس نظم کا یہ بند ملاحظہ ہو۔

دنیا کی سب مائیں اچھی ہوتی ہیں
ان کے دستِ شفقت گویا ایک دعا ہوتے ہیں
جن کے لمس سے سارے درد ہوا ہوتے ہیں
اولادوں کے حق میں سچی ہوتی ہیں
دنیا کی سب مائیں اچھی ہوتی ہیں
اس نظم کے یہ اشعار بھی قابلِ توجہ ہیں۔

تیری شفقت، تیرا ترّحم گہرا، لامحدود سمندر
جس نے چھپالیں میری خطائیں، ہر کوتاہی اپنے اندر
تیرا تہنّم، غم کی دھوپ میں ایک تناور پیڑ کا سایہ
میری عمر کی ساری کمائی، یعنی میرا کل سرمایہ
تیری رفاقت میری حیات کا ایک بڑا اعزاز رہا
تیرے قدموں کی برکت سے میں تو سرفراز رہا

سرینگر میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے نام پر ۱۹۰۵ء میں ایک کالج قائم کیا گیا جو موجودہ
دور میں ایس پی کالج کے نام سے مشہور ہے۔ خالد بشیر احمد نے بی اے تک کی تعلیم اسی کالج
میں حاصل کی۔ انہیں اس کالج کا ترانہ تحریر کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا جسے ۲۰۰۵ء میں کالج

کے قیام کی پُر وقار صد سالہ تقریب کے موقع پر جاری کیا گیا۔ ترانے کا آغاز ان خوبصورت اشعار سے ہوتا ہے۔

یہ مرکزِ علم و دانش ہے یہ نور کا اونچا مینارہ
کشمیر کی وادی میں قائم تہذیب کا پہلا گہوارہ
اس شمعِ وطن کی تابانی پر رشک ہے چاند ستاروں کو
یہاں چلنے والی بادِ صبا ہے راسِ نئی بہاروں کو
یہاں علمی بحثیں ہوتی ہیں، یہاں دعوے پر کھے جاتے ہیں
یہاں آنے والے دامن میں موتی بھر بھر کر جاتے ہیں

”ادبی منظر نامہ“ اور ”میں نے خواب دیکھے ہیں“ خالد بشیر احمد کی اہم نظمیں ہیں۔ یہ دونوں نظمیں باقی تمام منظومات کے مقابلے میں طویل ہیں ”ادبی منظر نامہ“ خالد بشیر احمد کی ایک ایسی نظم ہے جس میں انہوں نے موجودہ دور میں اردو شعر و ادب کی قدر و قیمت اور اہمیت و افادیت کا تعین کیا ہے۔ دراصل ادبی منظر نامہ ایک طنزیہ نظم ہے جس میں انہوں نے ادبی اور سماجی ناہمواریوں پر خوب وار کیے ہیں۔ خالد بشیر احمد کو اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ وہ ایک ایسے ادبی ماحول میں شعر کہہ رہے ہیں جہاں ہر کس و ناکس شاعر بنا ہوا ہے اور جہاں بد قسمتی سے اب تک ہندی بھی شاعری کے نام پر سامنے آرہی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ یہاں وہ لوگ بھی شاعری کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن کا شعر و ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

ہر کس و ناکس کی اُردو سے شناسائی ہوئی
کچھ نہ کچھ شعر و ادب کی بھی پذیرائی ہوئی

صاحبِ دیوان لَو خان جب سے ہو گئے
ہے ادھر خاتونِ خانہ وجد میں آئی ہوئی

کلِ صمد دھوبی کا مجموعہ سخن چھپنے کے بعد
ساجدہ دھوبن سے ادبی جادہ پیائی ہوئی

سارے نائی اور پنساری یہاں اہل ادب
اور عروسِ فکر دفن ہے ان کے گھر دائی ہوئی

شہر میں اب نانوائی کر رہے ہیں بک ریلیز
مرحبا اُردو زبان کی عزت افزائی ہوئی
اس نظم کا آخری بند بھی قابلِ مطالعہ ہے۔ جس میں خالد بشیر احمد نے شاعروں،
ادیبوں اور نقادوں کو ہدفِ تنقید بنایا ہے۔

یہ ادیب و شاعر و نقاد، سب خوانچہ فروش
سب نے ہیں اپنی دکانیں خوب چمکائی ہوئی
یہ ادب کے گوشت خورے، یہ تمدن کے قصاب
ہے انہوں نے خود زبان کی لاش تک کھائی ہوئی
ریڈیو، ٹی۔وی کی جو بھی جیب تھی وہ صاف کی
بیچ کھاؤ گے کہاں تک ہڈیاں اسلاف کی
اے میری تہذیب کے سوداگرو! اب بس کرو
حد ہوئی ہے بس کرو، اب بس کرو، اب بس کرو
خالد بشیر احمد کی نظم ”میں نے خواب دیکھے ہیں“ میں ٹخیل کی بلندی، جذبات کی
پاکیزگی، معافی کی گہرائی اور بے ساختہ پن بدرجہ اتم موجود ہے۔ نظم کا یہ بند پیش ہے:

میں نے خواب دیکھے ہیں
خوشبوؤں کے پھولوں کے
روشنی کے، رنگوں کے
جگنوؤں کے، بادل کے

جنگلوں میں جل تھل کے

میں نے خواب دیکھے ہیں

خالد بشیر احمد نے اپنی شاعری کے ابتدائی ایام میں چند مثنویات بھی لکھی ہیں۔ نمونہ مثنوی ”قہر البیان“ سے چند اشعار پیش ہیں۔

مجھے آج ایم اے کی ڈگری ملی کہ میرے رقیبوں پہ بجلی گری
مگر جانتے ہیں وہ کبجنت یہ کہ تقدیر بدلے گی یک لخت یہ
یہ ڈگری میرے کام آجائے گی سمجھتے ہیں کچھ کام دلوائے گی
میرے گھر عزیزوں کا سیلاب ہے کہ ہر ایک ملنے کو بے تاب ہے

خالد بشیر احمد کے شعری مجموعے ”صدائے نیم شب“ اور ”خواب پارہ“ کی شاعری کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں خالد بشیر احمد کی شعری خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے کلام میں بے پناہ تازگی ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے عمومی لب و لہجے سے ہٹ کر ایک ایسا لب و لہجہ اختیار کیا ہے جو انہیں دوسرے شعراء سے ممتاز بنادیتا ہے۔ ان کی شاعری کے کئی پہلو اور جہات ہیں۔ ان کی شاعری میں بیان کی سچائی، زبان کی سادگی و شیرینی، جذبے کا خلوص، چونکا دینے والا اسلوب، معصوم سرگوشی کا انداز، اثر آفرینی، درد و کسک، شائستہ اور نکھرا ہوا شعور اور روایت اور جدت کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اردو ادب میں بالعموم اور کشمیر کے حوالے سے بالخصوص ان کی شاعرانہ خدمات قابل ذکر ہیں۔

بہر کیف خالد بشیر احمد ریاست جموں و کشمیر کے اردو شعراء میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر کے حوالے سے جب بھی کوئی شعر و ادب کی تاریخ تحریر کرے گا خالد بشیر احمد کی ادبی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ خالد بشیر احمد نے اپنی تخلیقات کے ذریعے اردو ادب کے سرمایے میں جو اضافہ کیا ہے اس کے لیے انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

دیدۂ آبِ رواں

خالد بشیر احمد کی فسون گری

پروفیسر رحمن راہی

اچانک کوئی کرشمہ ہو جائے تو آدمی غلبہ حیرت کے سبب یا فرط مسرت کے نتیجے میں کچھ نہیں تو دم بھر کے لیے مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے میں کرشمے کی واقعیت اور حقیقت کے بارے میں زباں سے کچھ کہنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو سکتا ہے، جبکہ تحت الشعور میں مولانا روم علیہ الرحمہ کی یہ معنی خیز دعا کسی خاموش جھیل میں رات کو کھلنے والے کنول کی طرح دلنواز ثابت ہو سکتی ہے۔

ای خدا بُمای ماراں مقام

کاندران بی حرف می رؤید کلام

(اے خدا ہمیں وہ مقام دکھا جہاں لفظ و لسان کے بغیر کلام اُگتا ہے)

خالد بشیر احمد صاحب کی زیر تبصرہ تازہ تصنیف 'دیدہ آب رواں' پر جب میں نے کل شام ڈھلے محض ایک نظر ڈورائی تو ایسا لگا جیسے میرے آگے ایک نہایت نادر واقعہ ایک عجب کرشمہ وقوع میں آیا ہو۔ دیدہ آب رواں۔ بہتے پانی کو آنکھ سے تعبیر کرنا بجائے خود ایک تخلیقی اچنکھا ہے۔ جیسے حافظ شیرازی کے تتبع میں فیض احمد فیض کا دستِ صبا۔ ماشا اللہ۔ وادی کشمیر کے پتوں بچ بننے والے دریائے جہلم کے آئینہ آب میں ایک پورے خطے کو جہت جہت جلوہ نما پانا، اور پھر اُس جلوہ سامانی سے اوروں کو بھی معمور و مسرور کرنا۔ واللہ کیا بات ہے! کشمیر، یعنی شارد اپیٹھ، یعنی ایرانِ صغیر اور پھر وہ کشمیر کہ جسکے خیال میں علامہ اقبال فریاد کریں کہ۔

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر

اساطیر و تاریخ، تہذیب و تمدن، فکر و ادب، مطلب متعدد صدیوں پر محیط، بقلم
تصویرات، واقعات، اُمَنگیں اور اُٹھکیلیاں، درد اور سوز، تِخ بستہ موسموں میں دہلا دینے والے
وسوسے اور بسنت رُت کے آتے ہی کلیوں کی طرح پھوٹنے والے خواب۔ یہ سب اور ان
ساری چیزوں کی عکس برداری اور تصویر کشی ایک آئینہ آب میں۔ اور پھر اُن عکس و تصاویر
حیات و حرکت بخشنا، اسے کرشمہ نہیں تو اور کیا کہیے۔ خالد بشیر صاحب کی فسوں گری محسوس
کرتے ہوئے مرزا غالب یاد آ رہے ہیں:

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے

جاں کا لبِ صورتِ دیوار میں آوے

اُس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ

طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

میں اس کارنامے کے لیے اپنے کم گو مگر بے حد عزیز جناب خالد بشیر احمد صاحب کو
خلوصِ دل سے مبارک دیتا ہوں۔ ساتھ ہی حقائق و حالات اور تخلیق و تعبیر سے دلچسپی رکھنے
والے حضرات و خواتین سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ خالد صاحب کی پہلے سے معروف شعری
کاوشوں کی طرح اُن کی زیرِ تبصرہ کتاب کے بھی مکافقہ قدر شناس بنیں گے۔

اسلوبِ نثر جس کی نظیر نہیں

پروفیسر حامدی کاشمیری

جب یہ کتاب میں نے پڑھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایک بالکل اجنبی اور نئی چیز میری آنکھوں کے سامنے آگئی۔ آتش کی ایک غزل ہے۔

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

اور اس غزل کا دوسرا شعر ہے ۔

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل، سو زر بکف

قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

خالد بشیر احمد یوں تو ہم سے بہت زیادہ کم عمر ہیں لیکن اس کتاب کے ذریعہ اُن کی ذہنی بلوغت اور اُن کے یہاں جو تحقیق، تنقید اور ترسیل کا ایک آمیزہ ہمارے سامنے آیا ہے وہ حیرت ناک ہے۔ مجھے حیرت یوں بھی ہوئی کہ میں جانتا ہوں خالد بشیر احمد جانے مانے اور محترم شاعر ہیں اور شاعری کے بعد نثر کی طرف آنا اور اتنی خوبصورت نثر لکھنا کہ کچھ لکھوں کے لیے اُن کی شاعری میرے ذہن سے اُتر جاتی ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ایسا نثر نگار یا ست نے پیدا کیا ہے جس کے کہیں نظیر نہیں ملتی۔ یہ کتاب سراسر استدلالیت پر مبنی ہے اور یہ کتاب لکھتے ہوئے انہوں نے ایک سائنٹفک اپروچ اپنایا ہے۔

رچرڈس نے جب نثر پر گفتگو کی تو اُس نے کہا کہ نثر یا تو سائنسی ہوتی ہے یا غیر

سائنسی۔ خالد بشیر احمد نے سائنسی طریقہ کار اور طرزِ ادا کو اپنایا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ جو شاعریت میں ڈوبا ہوا ہو اور شعریت کے جو تقاضے ہیں، یعنی اختصاریت اور لفاظی سے گریز شاعری کی تاثیریت، مختلف کیفیات، اُن سب کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے ایک ایسا اسلوب نثر introduce کیا ہے جیسا کہ میں نے کہا جس کی نظیر نہیں۔ اُردو ادب میں فارسیّتِ آریہ اسلوب ہے جو خالد بشیر احمد سے پیشتر تذکرہ نگاروں نے روا رکھا ہے۔ پھر تقصع، مُبالغہ آمیزی اور لفاظی سے معمور مختلف اسالیب نثر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اُس میں غالب کی نثر نگاری بھی ہے اور وہاں سے شروع ہوتے ہوئے ابوالکلام آزاد کی نثر ہے۔ ہر نثر نگار نے اپنی شخصیت کے مطابق اپنا ایک انداز نثر یا انداز اپنایا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ نثری کارنامہ (دیدہ آبِ رواں) بہت قیمتی ہے اس لیے کہ خالد بشیر احمد نے تحقیق، تنقید، ترسیل، توضیح اور ان سب کے برابر ترسیلیت کا حق ادا کیا ہے۔ اتنی ساری چیزیں کسی شخص کے یہاں یکجا نہیں ملتیں۔ وارث علوی، ہمارے ایک مشہور نقاد ہیں جن کو یہ چیز لے ڈوبی کہ وہ چھوٹی سی بات کو پینترے بدل بدل کے دس دس جملوں میں ادا کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ اس طرح انہوں نے نثر میں میدان مار لیا ہے۔ لیکن خالد بشیر احمد ہمیں سمجھاتے ہیں کہ نثر لکھنا بھی ویسا ہی سائنٹفک ہے جیسے کوئی سائنسی تحقیق۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے سائنسی انداز میں لکھا ہے۔ یعنی اس میں اختصار ہے، مرکزیت ہے اور بہت ہی to the point رہنے کا رجحان ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ انہوں نے اس نثر سے شفافیت، سادگی اور ترسیلیت کا ایک نمائندہ نثری کارنامہ پیش کیا ہے۔ میں اُن کو مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ کشمیر کی مٹی سے ایک ایسا شخص پیدا ہوا ہے جو اُردو کے اسالیب نثر میں اضافے کا باعث ہے۔ یہ یقیناً ایک اضافہ ہے۔ انہوں نے نثر لکھی ہے۔ اُس میں کہیں کہیں شاعرانہ چاشنی ہے لیکن جو جملہ لکھا ہے، جو پیرا گرافس لکھے ہیں، اُن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا دل و دماغ مکمل طور پر کام کر رہا ہے اور نثر کے جو مطالبات ہیں وہ پورے ہو رہے ہیں۔

دیدہ آبِ رواں، اُردو کتابوں میں نہ صرف سالِ رواں کی اُردو کتابوں میں بلکہ پوری اُردو دنیا میں جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں اُن میں ایک منفرد اور افضل مقام رکھتی ہے۔

یہ سب چیزیں نثر کے بارے میں تھیں جس سے ہمارا دل خوش ہوتا ہے کہ ایسا نثر نگار بھی ہمارے یہاں ہے۔ 'دیدہ آب رواں' کشمیر شناسی میں اپنا جواب نہیں رکھتی اس لیے کہ انہوں نے دریا کی علامت کو استعمال کر کے جیسا کہ پروفیسر جی آر ملک صاحب نے کہا اور پروفیسر رحمن راہی نے بھی کہا کہ ایک ایسی چیز ہمارے سامنے پیش کی کہ ہم متعجب ہوئے۔ انہوں نے مجھے کئی حیرتوں میں ڈال دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ جو نثر یہ لکھ رہے ہیں absolutely استدلال پر مبنی ہے، مطالعہ کی دعوت دیتی ہے اور ایک ایک جملہ جو ہم پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں منہج نور ہے جس پر اُن کی نظر ہے اور وہ منہج نور دریا ہے۔ دریا ہے جہلم کا سفر اُس کا ماخذ اُس کے ساتھ ہندی نالوں کا ملنا اور پھر پوری قوت کے ساتھ وادی کشمیر کے بیچوں بیچ بہنا، اور اس کے ساتھ دونوں کناروں پر آباد لوگ اُن کے مشغلے، اُن کی سماجیاتی زندگی، تہذیبی زندگی اور بدلتے حالات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

کشمیر کی بد نصیبی یہ ہے کہ ایک تو یہ خریدی گئی چیز ہے اور آج بھی ہم سر اٹھا کر نہیں چل سکتے کیونکہ ہم کو کسی نے خریدا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کشمیر سیاسی اعتبار سے عصر بعد عصر تشدد کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ کبھی ایک حکومت آئی پھر دوسری حکومت، پٹھان، سکھ، ڈوگرے تو انہوں نے اہل کشمیر کو نابود کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن اہل کشمیر زندہ رہے۔ جہلم کے آس پاس اور دُور دراز علاقوں میں جو ہماری تہذیبی زندگی ہے جو ہمارا تصوف ہے ریشیت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری، اتنا ہی نہیں بلکہ لوگ اُن کے مشغلے، اُن کی مصروفیات اُن کے توہمات اُن کے عقیدے ان ساری چیزوں پر روشنی پڑتی ہے اور وہ بھی چُن چُن کر ایک ایک نقطہ۔ بقول غالب

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب

خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

انہوں نے ایک ایک قطرہ خون کا حساب دیا ہے اور ایک ایسا چیز ہمارے سامنے رکھی ہے جو کشمیر شناسی میں اپنا مقام رکھتی ہے اور رکھے گی۔ ایک دو چیزوں کی طرف میری توجہ گئی وہ یہ کہ دریا ہے جہلم کے دونوں کناروں پر انہوں نے ایک یا دو تین ادیبوں، شاعروں کا ذکر کیا ہے۔

سائنسی۔ خالد بشیر احمد نے سائنسی طریقہ نثر اور طرزِ ادا کو اپنایا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ جو شاعریت میں ڈوبا ہوا اور شعریت کے جو تقاضے ہیں، یعنی اختصاریت اور لفاظی سے گریز شاعری کی تاثیریت، مختلف کیفیات، اُن سب کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے ایک ایسا اسلوب نثر introduce کیا ہے جیسا کہ میں نے کہا جس کی نظیر نہیں۔ اُردو ادب میں فارسیّتِ آریہ اسلوب ہے جو خالد بشیر احمد سے پیشتر تذکرہ نگاروں نے روا رکھا ہے۔ پھر تصنع، مبالغہ آمیزی اور لفاظی سے معمور مختلف اسالیب نثر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اُس میں غالب کی نثر نگاری بھی ہے اور وہاں سے شروع ہوتے ہوئے ابوالکلام آزاد کی نثر ہے۔ ہر نثر نگار نے اپنی شخصیت کے مطابق اپنا ایک انداز نثر یا انداز اپنایا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ نثری کارنامہ (دیدہ آبِ رواں) بہت قیمتی ہے اس لیے کہ خالد بشیر احمد نے تحقیق، تنقید، ترسیل، توضیح اور ان سب کے برابر ترسیلیت کا حق ادا کیا ہے۔ اتنی ساری چیزیں کسی شخص کے یہاں یکجا نہیں ملتیں۔ وارث علوی، ہمارے ایک مشہور نقاد ہیں جن کو یہ چیز لے ڈوبی کہ وہ چھوٹی سی بات کو پینترے بدل بدل کے دس دس جملوں میں ادا کرتے تھے اور سوچتے تھے کہ اس طرح انہوں نے نثر میں میدان مار لیا ہے۔ لیکن خالد بشیر احمد ہمیں سمجھاتے ہیں کہ نثر لکھنا بھی ویسا ہی سائنٹفک ہے جیسے کوئی سائنسی تحقیق۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے سائنسی انداز میں لکھا ہے۔ یعنی اس میں اختصار ہے، مرکزیت ہے اور بہت ہی to the point رہنے کا رجحان ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ انہوں نے اس نثر سے شفافیت، سادگی اور ترسیلیت کا ایک نمائندہ نثری کارنامہ پیش کیا ہے۔ میں اُن کو مبارکباد دیتا ہوں کیونکہ کشمیر کی مٹی سے ایک ایسا شخص پیدا ہوا ہے جو اُردو کے اسالیب نثر میں اضافے کا باعث ہے۔ یہ یقیناً ایک اضافہ ہے۔ انہوں نے نثر لکھی ہے۔ اُس میں کہیں کہیں شاعرانہ چاشنی ہے لیکن جو جملہ لکھا ہے، جو پیرا گرافس لکھے ہیں، اُن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا دل و دماغ مکمل طور پر کام کر رہا ہے اور نثر کے جو مطالبات ہیں وہ پورے ہو رہے ہیں۔

دیدہ آبِ رواں، اُردو کتابوں میں نہ صرف سالِ رواں کی اُردو کتابوں میں بلکہ پوری اُردو دنیا میں جو کتابیں لکھی جا رہی ہیں اُن میں ایک منفرد اور افضل مقام رکھتی ہے۔

یہ سب چیزیں نثر کے بارے میں تھیں جس سے ہمارا دل خوش ہوتا ہے کہ ایسا نثر نگار بھی ہمارے یہاں ہے۔ 'دیدہ آب رواں' کشمیر شناسی میں اپنا جواب نہیں رکھتی اس لیے کہ انہوں نے دریا کی علامت کو استعمال کر کے جیسا کہ پروفیسر جی، آر، ملک صاحب نے کہا اور پروفیسر رحمن راہی نے بھی کہا کہ ایک ایسی چیز ہمارے سامنے پیش کی کہ ہم متعجب ہوئے۔ انہوں نے مجھے کئی حیرتوں میں ڈال دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ جو نثر یہ لکھ رہے ہیں absolutely استدلال پر مبنی ہے، مطالعہ کی دعوت دیتی ہے اور ایک ایک جملہ جو ہم پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں منبج نور ہے جس پر اُن کی نظر ہے اور وہ منبج نور دریا ہے جہلم ہے۔ دریا ہے جہلم کا سفر، اُس کا ماخذ، اُس کے ساتھ ہندی نالوں کا ملنا اور پھر پوری قوت کے ساتھ وادی کشمیر کے بیچوں بیچ بہنا، اور اس کے ساتھ دونوں کناروں پر آباد لوگ، اُن کے مشغلے، اُن کی سماجیاتی زندگی، تہذیبی زندگی اور بدلتے حالات ہمارے سامنے آتے ہیں۔

کشمیر کی بد نصیبی یہ ہے کہ ایک تو یہ خریدی گئی چیز ہے اور آج بھی ہم سر اٹھا کر نہیں چل سکتے کیونکہ ہم کو کسی نے خریدا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کشمیر سیاسی اعتبار سے عصر بعد عصر تشدد کا نشانہ بنتا رہا ہے۔ کبھی ایک حکومت آئی پھر دوسری حکومت، پٹھان، سکھ، ڈوگرے تو انہوں نے اہل کشمیر کو نابود کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن اہل کشمیر زندہ رہے۔ جہلم کے آس پاس اور دُور دراز علاقوں میں جو ہماری تہذیبی زندگی ہے جو ہمارا تصوف ہے، ریشیت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سیاسی بیداری، اتنا ہی نہیں بلکہ لوگ، اُن کے مشغلے، اُن کی مصروفیات، اُن کے توہمات، اُن کے عقیدے ان ساری چیزوں پر روشنی پڑتی ہے اور وہ بھی چُن چُن کر ایک ایک نقطہ۔ بقول غالب

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب

خونِ جگر ودیعت مژگانِ یار تھا

انہوں نے ایک ایک قطرہ خون کا حساب دیا ہے اور ایک ایسا چیز ہمارے سامنے رکھی ہے جو کشمیر شناسی میں اپنا مقام رکھتی ہے اور رکھے گی۔ ایک دو چیزوں کی طرف میری توجہ گئی وہ یہ کہ دریا ہے جہلم کے دونوں کناروں پر انہوں نے ایک یا دو تین ادیبوں، شاعروں کا ذکر کیا ہے۔

کسی ملک کی عزت، وقار اور عظمت ادب کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی۔ مہاراج گنج کے قریب رحمن راہی رہتے تھے، خاکسار بھی وہیں رہتا تھا اور درجنوں شعراء ادباء جو زینہ کدل کے پاس دریائے جہلم کے دائیں بائیں ہیں۔ اگر اُن پر بھی نظر عنایت کرتے تو یہ بہت اچھا رہتا۔ ایک اور کی کا مجھے احساس ہوتا ہے وہ یہ کہ ریشیت اور تصوف ہماری تہذیبی زندگی کے باقاعدہ ادارے بن چکے ہیں۔ اُن پر بھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے لیکن وہاں جلدی میں کچھ جملے رہ گئے۔

میں خالد بشیر احمد کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہ کبھی خاموش نہ رہنے والے شخص ہیں۔ ان کے ڈیپارٹمنٹ میں بڑے بڑے گُرسی نشین آگئے۔ لیکن مجھے بتائیے کس نے اطلاعات کے مخزن کا ڈھکن اٹھایا اور وہاں سے کشمیر کے بارے میں کشمیر کی سیاست، ادب، تہذیب، سماجیات کے بارے میں قلم اٹھایا؟ یہ کام کچھ لوگ ہی کرتے ہیں اور اُن کچھ لوگوں میں خالد بشیر احمد ہیں جو وہاں شروع سے کام کرتے رہے لیکن اس اطلاعات کے سمندر میں غوطے لگاتے رہے۔ دوسرے لوگ تو appoint ہوتے ہیں اور اپنا وقت گزارتے ہیں۔ اخبار والوں کو advertisement دیتے ہیں لیکن یہ شخص اپنا خون پسینہ ایک کر کے سب کچھ کرتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے دوسرے لوگ خزانے پر شہمار کی طرح بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں۔ کسی کو قریب آنے نہیں دیتے۔ لیکن اس شخص نے اُس کا صفایا کر دیا اور اپنی قوت سے اپنی dedication سے اپنی دردمندی سے اور ادبی ذوق کی بنا پر ایک ایسی چیز ہمیں دے دی ہے کہ ہم برسوں تک ان کا حق ادا نہیں کر سکتے۔

ایک قابلِ قدر تحقیقی کارنامہ

پروفیسر غلام رسول ملک

’دیدہ آبِ رواں‘ ہمارے معروف شاعر اور نثر نگار خالد بشیر احمد صاحب کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ یہ کتاب دراصل ان کی انگریزی کتاب Jehlum-The River Through My Backyard کی اردو ترجمانی اور تعبیر ہے اور چونکہ یہ ترجمانی اور تعبیر مصنف نے خود کی ہے اس لیے اسے ایک مستقل تالیف کی حیثیت حاصل ہے۔ اصل انگریزی کتاب ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی تھی اور آج تک اسے مختلف صورتوں میں برابر داد و تحسین ملتی رہی ہے۔

’دیدہ آبِ رواں‘ جہلم کی دلاویز کہانی ہے۔ جہلم محض ایک دریا نہیں بلکہ ایک رنگا رنگ تاریخ کی مسحور گن جہاں وزیبائی سے آراستہ جغرافیہ اور ایک پُر اسرار تہذیب و تمدن کی علامت ہے۔ مصنف کا تخلیقی ذہن اسے ضائع فطرت کے شاہکار کی حیثیت سے دیکھتا ہے جیسا کہ وہ لکھتے ہیں:

”دریائے جہلم کشمیر کے رنگ منچ پر کھیلے جانے والے قدرت کے تحریر کردہ نائک کامرکزی کردار ہے جسے کئی چھوٹی بڑی ندیاں معاون کردار کے روپ میں جلا بخشی ہیں۔“

(ص ۴۱)

کشمیر کی پیچیدہ اور تہہ دار تہذیب اور اس کی اتار چڑھاؤ سے بھرپور تاریخ کو جہلم

سے جدا کر کے دیکھا نہیں جاسکتا۔ مصنف خود لکھتے ہیں اور بجا طور پر لکھتے ہیں:
 ”کشمیر اور جہلم ہم معنی ہیں اور ایک کی شناخت دوسرے کے
 بغیر نامکمل ہے۔“

(ص ۹۹)

یہ حقیقت ہر صاحبِ ادراک پر روشن ہے کہ آب اور آبگاہوں اور حیات و تہذیب
 انسانی کا پھولی دامن کا ساتھ ہے۔ قرآن حکیم کا یہ ارشاد ہے کہ وجعلنا من الماء کل شیء حی (سورہ
 انبیاء) یعنی یہ کہ ہم نے پیدا کیا پانی سے ہر جاندار شے کو حیاتیاتی (biological) اور تہذیبی
 تمام معنوں پہ محیط ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ دنیا کی تمام بڑی تہذیبیں آب گاہوں ہی کے قرب
 و جوار میں پیدا بھی ہوئی ہیں اور پروان بھی چڑھی ہیں۔ وادی نیل کی تہذیب ہو یا وادی سندھ
 کی ڈیوب کے ارد گرد تہذیبوں کے نشوونما کی بات ہو یا گنگ و جمن کی فہوں میں پروان چڑھنے
 والے تمدنوں کی داستان ہو پانی کو ہر جگہ محور کی حیثیت حاصل ہے۔ خالد بشیر احمد کی کتاب
 دریائے جہلم کو ایک ایسے محور کے طور پر پیش کرتی ہے جس کے گرد دیوالا، ثقافت اور ادب
 کششِ ثقل سے بندھے ہوئے سیاروں کی طرح محو گردش ہیں۔

ایک ایسی حکایت سرائی کے لیے کہ جس میں تاریخ، جغرافیہ، ادب، ثقافت اور دیوالا
 عناصر ترکیبی کی حیثیت میں شامل ہوں 'دریا' سے زیادہ کوئی موزوں علامت ہو ہی نہیں سکتی۔
 'دریا دنیا' فطرت کی اُن مخصوص علامتوں (symbols) میں سے ایک ہے جو جامعیت اور
 تکمیل کے تصورات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ بیج کا ایک دانہ مٹی کے اندر مدفون ہو جاتا ہے
 اور پھر ایک حیاتِ نو کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، برگ و بار لاتا ہے اور بالآخر ثمر پختہ کی صورت
 میں پھر ہمیں بیج عنایت کرتا ہے اور پھر ایک نیا تخلیقی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ ہر تکمیل ایک نئی
 ابتداء کی شکل اختیار کرتی ہے اور اپنی زبانِ حال سے مشہور انگریزی شاعری۔ ایس۔ ایلینٹ
 کے الفاظ میں زمرہ سچ ہوتی ہے: In my beginning is my end. بالکل اسی طرح
 دریا کا پانی عملِ تبخیر (evaporation) کے ذریعے سمندر کے کطن سے فضائے آسمان کی طرف
 پرواز کرتا ہے اور پھر بادلوں کی صورت اختیار کر کے پانی بن کر نازل ہوتا ہے اور دریا کی صورت

میں دھرتی کا سینہ چیرتے ہوئے اور فضاؤں کو اپنے نعمات سے لبریز کرتے ہوئے دوڑتا چلا جاتا ہے تا آنکہ یہ پھر سمندر کی گود میں سو جاتا ہے مگر یہ آسودگی عارضی ہوتی ہے۔ تیغیر کا عمل پھر شروع ہو جاتا ہے اور پانی پھر بادلوں سے برس کر دریا بن جاتا ہے۔

’دیدہ آب رواں‘ کا مطالعہ کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کا تخلیقی شعور تحت الشعور کی سطح پر اسی علامتِ دوام و تسلسل کی بازیافت کے عمل میں مصروف ہے۔

’دریا‘ کا ہم کشمیریوں کے اجتماعی لا شعور (unconscious collective) کے ساتھ بھی ایک مخصوص تعلق ہے۔ برصغیر میں بالعموم اور کشمیر میں بالخصوص دوسرے وسائل و ذخائر آب کے ساتھ تقدیس اور پاکیزگی کے تصورات وابستہ ہیں۔ تقدیس اور پاکیزگی کے ان ہی تصورات کو دیومالا کی زبان میں اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ گویا ندی ایک دیوی ہو اور اس کا اسی طرح سے احترام کیا جانا چاہیے کہ یہ کوئی مقدس ہستی ہو۔ دیومالا کی زبان اور شاعری کی زبان میں یہ امر مشترک ہے کہ دونوں مجرّ و تصورات کو ٹھوس اشکال کے استعاروں میں بیان کرتی ہیں۔ دریا اور دوسری آبگاہوں کی اس تقدیس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہم انہیں آلودہ کرنا ایک گناہ سمجھتے تھے اور انہیں پاکیزہ رکھنا ایک مذہبی فریضہ تصور کرتے تھے۔ افسوس کہ مادی غلبہ نے آہستہ آہستہ ان معصومانہ تصورات کو ہمارے اذہان سے محو کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب گاہیں آلودہ اور مسموم ہو رہی ہیں۔ ہمارا جہلم جو بقول خالد بشیر احمد تیزی کے ساتھ ایک بدرو کی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ اس کی ایک اندوہناک مثال ہے۔ خالد بشیر احمد صاحب کے الفاظ:

’کچھ عرصہ قبل ایک مقامی اخبار میں خبر چھپی کہ ایک پریشان حال شخص خودکشی کے ارادے سے امیر اکدل سے جہلم میں کود گیا لیکن دریا میں اتنا پانی ہی نہ تھا کہ اس کے غم اپنے اندر سمو لیتا۔ چنانچہ وہ آدمی دریا کی تہہ کے ساتھ ٹکرایا، اٹھ کھڑا ہوا اور کپڑے جھاڑ کر گھر لوٹا‘

(ص ۲۱۵)

’کشمیر کی ثقافت کی علامت کے طور پر جہلم آج بھی اتنا ہی توانا

ہے جتنا کہ پہلے کبھی رہا ہے لیکن ایک دریا کی حیثیت سے یہ تیزی سے
اپنی انفرادیت کھو رہا ہے۔

(ص ۲۱۶)

’دیدہ آبِ رواں‘ تخلیق بھی ہے اور ایک وقع اور قابلِ قدر تحقیقی کارنامہ بھی۔ اس
سے وہ طالب علم اور محقق بھی مستفید ہو سکتے ہیں جو دریائے جہلم کے متعلق جامع معلومات
حاصل کرنا چاہتے ہوں اور کشمیر کے اساطیر، اس کی تاریخ، اس کی ثقافت اور اس کے ادب سے
دلچسپی رکھتے ہوں، اور وہ لوگ بھی کہ جو ادبی ذوق سے متصف ہوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک
عام قاری بھی اس سے بھرپور حظ اٹھا سکتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ معلومات کا ایک انمول خزانہ
ہے۔

زندہ روڈ کشمیر

پروفیسر قدوس جاوید

’دیدہ آب رواں‘ ایک حساس اور محب وطن کشمیری قلم کار کے عرقِ انفعال کا ایک قطرہ ہے۔ جو لفظ و معنی میں پھیل کر ایک مستقل تصنیف کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

خالد بشیر احمد نے دیدہ آب رواں میں کشمیر کی ۵۷ سالہ تاریخ اور ثقافت سے متعلق راج ترنگی اور نیل مت پوران سے ڈاکٹر اسٹائن اور ڈریو تک کی دور از کار اور منصوبہ بند تشریحات و مفروضات کے ارتداد و اکتشاف کے عمل سے گزرتے ہوئے کشمیر کے وجود و شہود سے لے کر ادب، ثقافت، معیشت اور سماجیات تک کی طرفوں کو جدید ترین تحقیقات و معلومات کے حوالے سے بے نقاب کیا ہے۔ خالد بشیر احمد ایک معتبر اور صاحب بصیرت ادیب ہیں۔ دیدہ آب رواں لکھ کر انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر فن کار یا ادیب کا جذبہ صادق، تحقیقی شعور پختہ اور نگاہ حقیقت ریز ہو تو تاریخ و تہذیب کو بھی ادبی تخلیق کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا جاسکتا ہے۔

خالد بشیر احمد نے کشمیر کی زندہ، متحرک اور رواں علامت جہلم کو جس طرح کشمیر کی تاریخی ثقافتی اور مذہبی حتیٰ کہ تعلیمی، لسانی، ادبی و فنی انسلالات کے ساتھ پیش کیا ہے وہ یقیناً کشمیر سے متعلق تاریخ نگاری میں ہی نہیں، اردو ادب میں بھی اضافہ کہلانے کا حق رکھتا ہے۔ کشمیر اہل کشمیر اور کشمیریت کے حوالے سے جہلم کیا حیثیت رکھتا ہے، خالد بشیر احمد اس کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اس کا اظہار انہوں نے ’دیدہ آب رواں‘ کے آغاز میں ہی سبب تصنیف

ہے جتنا کہ پہلے کبھی رہا ہے لیکن ایک دریا کی حیثیت سے یہ تیزی سے
اپنی انفرادیت کھو رہا ہے۔

(ص ۲۱۶)

’دیدہ آبِ روان‘ تخلیق بھی ہے اور ایک وقع اور قابلِ قدر تحقیقی کارنامہ بھی۔ اس
سے وہ طالب علم اور محقق بھی مستفید ہو سکتے ہیں جو دریائے جہلم کے متعلق جامع معلومات
حاصل کرنا چاہتے ہوں اور کشمیر کے اساطیر، اس کی تاریخ، اس کی ثقافت اور اس کے ادب سے
دلچسپی رکھتے ہوں، اور وہ لوگ بھی کہ جو ادبی ذوق سے متصف ہوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک
عام قاری بھی اس سے بھرپور حظ اٹھا سکتا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ معلومات کا ایک انمول خزانہ
ہے۔

زندہ روڈ کشمیر

پروفیسر قدوس جاوید

’دیدہ آبِ رواں‘ ایک حساس اور محبتِ وطن کشمیری قلم کار کے عرقِ انفعال کا ایک قطرہ ہے۔ جو لفظ و معنی میں پھیل کر ایک مستقل تصنیف کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

خالد بشیر احمد نے دیدہ آبِ رواں میں کشمیر کی ۵۰ ہزار سالہ تاریخ اور ثقافت سے متعلق راجِ ترنگنی اور نیل مت پوران سے ڈاکٹر اسٹائن اور ڈریو تک کی دور از کار اور منصوبہ بند تشریحات و مفروضات کے ارتداد و اکتشاف کے عمل سے گزرتے ہوئے کشمیر کے وجود و شہود سے لے کر ادب، ثقافت، معیشت اور سماجیات تک کی طرفوں کو جدید ترین تحقیقات و معلومات کے حوالے سے بے نقاب کیا ہے۔ خالد بشیر احمد ایک معتبر اور صاحبِ بصیرت ادیب ہیں۔ دیدہ آبِ رواں لکھ کر انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر فنکار یا ادیب کا جذبہ صادق، تحقیقی شعور پختہ اور نگاہِ حقیقت ریز ہو تو تاریخ و تہذیب کو بھی ادبی تخلیق کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا جاسکتا ہے

خالد بشیر احمد نے کشمیر کی زندہ، متحرک اور رواں علامت جہلم کو جس طرح کشمیر کی تاریخی ثقافتی اور مذہبی حتیٰ کہ تعلیمی، لسانی، ادبی و فنی انسلالات کے ساتھ پیش کیا ہے وہ یقیناً کشمیر سے متعلق تاریخ نگاری میں ہی نہیں، اردو ادب میں بھی اضافہ کھلانے کا حق رکھتا ہے۔ کشمیر اہل کشمیر اور کشمیریہ کے حوالے سے جہلم کیا ’حیثیت‘ رکھتا ہے، خالد بشیر احمد اس کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اس کا اظہار انہوں نے ’دیدہ آبِ رواں‘ کے آغاز میں ہی سببِ تصنیف

کی وضاحت کرتے ہوئے واضح لفظوں میں گردیا ہے۔

”جہلم ایک دریا ہی نہیں بلکہ کشمیر کی پہچان ہے۔ اسے ایک عام دریا تصور کرنا کشمیر کی تاریخ، ثقافت، اساطیر اور ادب سے ناشناسی کے مترادف ہے۔ اس زمین سے متعلق شاید ہی کوئی پہلو ہو جس کے ساتھ جہلم کا براہ راست تعلق نہیں۔ صدیوں سے کشمیر میں پیش آنے والے واقعات کا یہ دریا چشم دید گواہ اور اپنے کناروں پر آباد ایک منفرد تہذیب کا محافظ ہے۔“

خالد کے اس بیان میں تازہ کار بصیرتوں کا شدید احساس ہے اور ساتھ ہی صدیوں پر محیط کشمیر کے سادہ اور معصوم باسیوں کی حرماں اور محرومیوں کا کرب بھی۔ اسے قدرت کی ستم ظریفی ہی کہیں گے کہ دریاؤں، پہاڑوں، سبزہ زاروں، باغوں اور چشموں کی اس بے نظیر دھرتی پر، میدانی علاقوں سے کوئی بھی گروہ لاؤ لشکر کے ساتھ آتا اور اپنی عیاریوں اور مکاریوں سے کام لے کر اس خطے پر قابض ہو جاتا اور پھر مقامی آبادی پر ایسے ایسے مظالم توڑتا جن کی مثالیں شاید انڈمان کی سیلوں جیل اور ابو غریب (عراق) کے عقوبت خانوں کی دستاویزوں میں ملیں تو ملیں دنیا کے کسی اور ملک کی تاریخ میں شاید ہی ملیں۔ پہلے مغل آئے، پھر افغان اور سکھ آئے اور ان سبھوں کے بعد جب گلاب سنگھ نے ڈوگرہ راج قائم کیا تو پھر ظلم و جبر کی رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی۔ ڈوگرہ عہد حکومت میں اہل کشمیر کے سماجی، معاشی اور اخلاقی استحصال کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خالد بشیر احمد لکھتے ہیں:

”..... اس آمرانہ نظام سلطنت نے نہ صرف لوگوں کو معاشی بد حالی سے دوچار کر دیا بلکہ اخلاقی اقدار کو بھی پامال کر دیا تھا۔ حکمران طبقے کے لیے وادی ایک عیش گاہ بن گئی تھی اور وہ ہر طرح کی سماجی خرابیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جسم فروشی کے کاروبار کو حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ ڈوگرہ حکمران گلاب سنگھ اور پرتاپ سنگھ طوائفوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے اور حکومت جسم فروشی

عورتوں اور دلالوں سے باضابطہ ٹیکس وصول کرتی تھی۔ اس طرح حاصل ہونے والی آمدنی حکومت کے خزانہ میں جمع ہوتی تھی۔ سرکاری حوصلہ افزائی کے طفیل اخلاقی اقدار کی دھجیاں اڑ رہی تھیں۔ ابتر صورتحال کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۸۸۰ء میں صرف سرینگر شہر میں ۲۰ ہزار جسم فروش عورتیں موجود تھیں۔“

اگر اس اقتباس کو ظلم کے ان واقعات کے ساتھ جوڑ کر دیکھا جائے جو کشمیر کی تاریخ کی کتابوں سے زیادہ نسل در نسل اہل کشمیر کے اجتماعی شعور میں موجود ہیں تو ’دیدہ آب رواں‘ کی معنویت کی تفہیم میں آسانی ہوگی۔ اگر جرمن فلسفی ایڈمنڈ ہسرل (Edmund Husserl) کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خالد بشیر احمد نے اپنی تصنیف میں حقائق کے اصل ادراک کے حوالے سے، کشمیر کی تاریخ سے متعلق عوامی شعور اور ادب کے درمیان سے موجود ترتیب کو الٹ دیا ہے۔ سابقہ ترتیب یا روایت یہ تھی کہ طے شدہ حقائق و مفروضات کی روشنی میں ادب کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ لیکن ’دیدہ آب رواں‘ میں خالد بشیر احمد کا تخلیقی و تجرباتی رویہ ایسا ہے جو قاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ادب (دیدہ آب رواں) کی روشنی میں اول تو مصنف کے شعور کی جہتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر یہ دیکھے کہ مصنف نے کشمیر کی تاریخ و ثقافت سے متعلق حقائق و مفروضات کو کن کن زاویوں سے دیکھا اور سمجھا ہے اور پھر اپنی تخلیقیت اور بصیرتوں سے کام لے کر کن نئے حقائق کی بازیافت کی ہے۔ خالد بشیر احمد نے کشمیر کی تاریخ کے بنیادی ماخذات کی تہیں ادھیڑتے ہوئے لکھا ہے:

”کشمیر کی سیاسی اور جغرافیائی تاریخ کو دیومالائی پیراہن پہنایا گیا ہے۔ یہ حقائق اور واقعات کے ساتھ کچھ اس طرح خلط ملط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہے۔ کشمیر کی تاریخ کے اولین ماخذ جن پر مورخین بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ نیل مت پوران اور راج ترنگنی ہیں۔ دونوں سنسکرت زبان میں تحریر کی گئی ہیں۔ چھٹی یا ساتویں صدی عیسوی میں تحریر کردہ نیل مت پوران اصل میں ایک مذہبی نصاب ہے جس میں وادی کے ہندوؤں کے مقدس مقامات اور رسوم و تہوار پر بات کی گئی ہے جبکہ راج ترنگنی تاریخ، مخصوص عقائد اور شاعری کا گھول

ہے اور اپنے مواد کے لیے نیل مت پوران پر بہت زیادتی مختصر ہے۔ دونوں ماخذ اگرچہ ادبی لحاظ سے خاصے کی چیزیں ہیں تاہم انہیں تاریخ کے مستند اور بے لاگ حوالے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

خالد بشیر احمد خاص طور پر راج ترنگنی کو مستند اور بے لاگ تاریخ ماننے سے انکار کرتے ہوئے اسے کشمیر کے وجود کو ایک مخصوص مذہب کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش قرار دیتے ہیں۔ راج ترنگنی کی بنیاد نیل مت پوران سے مستعار داستان پر رکھی گئی ہے اور سستی سر جھیل، راکھشس جلا دھو، کشپ رشی، بھگوان شوا اور پاروتی اور ترشول کے حوالے سے 'وتتا' (جو کشمیر کے قدیم دریا جہلم کا ہی ایک نام ہے) کے وجود میں آنے کا افسانہ تراشا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں پنڈت کلہن نے 'وتتا' کو کشمیر کا دریا قرار دیا ہے وہیں کشمیر کے ہی ایک مصنف سوم دیو نے اپنی مشہور تصنیف 'کتھاسرت ساگر' میں 'وتتا' کو اُجینی (وسطی بھارت کا شہر اجین) میں بہنے والا دریا کہا ہے۔ اسی طرح کشمیر کے دریا کے چند دوسرے ناموں مثلاً 'وتتھ'، 'پہت'، 'ہائی ڈس پس' اور جہلم وغیرہ کے لغوی اور اساطیر کی معنی و مفہوم کی وضاحت بھی خالد بشیر احمد نے کشمیری، سنسکرت اور عبرانی زبانوں میں موجود ان الفاظ (ناموں) سے مشابہ الفاظ کے حوالے سے کی ہے۔ خالد بشیر احمد نے 'پہت' یا بیتھ پورہ جیسے الفاظ کے عبرانی مشتق پر بحث کرتے ہوئے عزیز کا کشمیری کے دلائل کا حوالہ دیا ہے اور ساتھ ہی کشمیر میں یہودیوں کی آمد اور آباد کاری کے مسئلہ کو بھی ایک تحقیق طلب موضوع قرار دیا ہے۔ خالد بشیر احمد نے جی ایم ڈی صوفی کے حوالے سے یہ کہہ کہ اس تنازعہ کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے کہ 'جہلم' لفظ کا آغاز مسلمانوں نے کیا۔ پنڈت کلہن سے 150 سال پہلے عبدالرحمن البیرونی نے جہلم کا نام 'جیلام' لکھا ہے۔ شاہمیری دور کے مورخ شری ورنے اسے 'جیلامی' کے نام سے یاد کیا ہے۔ موثر لغت 'فرہنگ آصفیہ' (سید احمد دہلوی) میں بھی لفظ 'جہلم' اسم کے طور پر درج ہے ان سارے تحقیقی و تنقیدی مباحث سے دو باتیں خاص طور پر سامنے آتی ہیں۔ اول یہ کہ جہلم ہی کشمیر کا مرکزی دریا ہے اور کشمیر کی شناخت کا استعارہ بھی۔ دوم یہ کہ کشمیر کے حوالے سے ابھی تک کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی ہے جسے ہر پہلو سے اعتبار کا درجہ حاصل ہو۔ یہ شکایت شاعر کشمیر مہجور کو

بھی تھی چنانچہ کشمیر کے مشہور محقق و نقاد محمد یوسف ٹینگ کے حوالے سے یہ بات سامنے آچکی ہے کہ مہجور نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ شیخ محمد عبداللہ اور بخشی غلام محمد (وزیر اعظم و نائب وزیر اعظم) دونوں نے یہ مسودہ دیکھا تھا اور شیخ محمد عبداللہ اسی سلسلے میں مہجور کو 1950 میں دہلی بھی لے گئے تھے تاکہ مزید ضروری مواد کی فراہمی ہو سکے۔

اس میں شک نہیں کہ کشمیر کی تاریخ کے حوالے سے مغربی مصنفین کے علاوہ خود کشمیر کے مؤرخین و مصنفین مثلاً محمد الدین فوق، عبدالقیوم رفیقی، ڈاکٹر اکبر حیدری، فدا محمد حسنین، پروفیسر اسحق خان، پروفیسر محمد اشرف اور ڈاکٹر فاروق فیاض وغیرہ نے بھی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن خالد بشیر احمد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ’دیدہ آب رواں‘ میں کشمیر کی جدید اور اکتشافی تاریخ تو پیش کی ہے لیکن تاریخت (Historicity) کے روایتی اصولوں کی بجائے نو تاریخت Neo Historicity کی ہمہ جہت متعدد مثالیں دیدہ آب رواں سے نقل کی جاسکتی ہیں۔ صرف یہ چند جملے دیکھیے۔ خالد بشیر احمد کی تاریخ نویسی، تخلیقیت، ثقافتی آگہی اور اسلوب کا اندازہ ہو جائے گا:

”دریائے جہلم کشمیر کے رنگ منچ پر کھیلے جانے والے قدرت کے تحریر کردہ نائک کا مرکزی کردار ہے... ہزار ہا سال سے جاری اس نائک کے کردار وادی کے منظر نامے کا ٹوٹ حصہ ہیں۔ جغرافیائی معنوں میں جہلم صرف دریا نہیں بلکہ ایک مکمل نظام ہے جو کشمیر کو نہ صرف ذخیرہ عطا کرتا ہے بلکہ اس کے لیے نکاس آب کا جال بھی ترتیب دیتا ہے۔ یہ دریا جنوبی کشمیر کے دیری ناگ قصبہ میں پیر پنچال پہاڑ کے دامن میں سطح سمندر سے 1860 میٹر بلندی پر صنوبر کے درختوں کے بیچ پھوٹنے والے ایک چشمے سے جنم لیتا ہے۔“

ارسطو نے تاریخ کو شعر و ادب سے کمتر درجہ دیا ہے کیونکہ اس کے خیال میں تاریخ خالصتاً خارجی واقعات پر مشتمل ہوتی ہے جبکہ شعر و ادب تصوّر و تخیل اور اظہار بیان کے بال و پر کے سہارے واقعیت کی منزل سے آگے نکل کر ان صورتوں پر بھی حاوی ہو جاتا ہے جو قرین قیاس ہوں۔ ارسطو کا نظریہ تاریخ نویسی آج بھی غلط نہیں لیکن بہت آگے جا کر ابن خلدون نے چودھویں صدی میں تاریخ نویسی کا جو ایک نیا تصور پیش کیا تھا اس کے رو سے تاریخ صرف اور

محض واقعات کا بیان نہیں اور نہ ہی لڑشتہ واقعات کے ہر جائزے کو تاریخ کا منصب عطا کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ نویسی کے لیے متعلقہ زمین، قوم اور ثقافت کے حوالے سے حقائق و کوائف کی بھرپور آگہی، واضح تاریخی نظریہ، اظہار و بیان کی قوت، تصوّر و تخیل کی بلند پروازی مطالعہ و مشاہدہ کی گہرائی و ہمہ جہتی وغیرہ بہت ساری خوبیوں کا حامل ہونا لازمی ہے اور دیدہ آبِ رواں کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ خالد بشیر احمد کے یہاں یہ سارے امتیازات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ خالد بشیر احمد کی تصنیف یہ تاثر دیتی ہے کہ کشمیر کی کوئی معتبر تاریخ ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے۔ اسے خالد بشیر احمد کا نظریہ تاریخ کہہ سکتے ہیں لیکن دیدہ آبِ رواں نرے خارجی واقعات سے بندھی تصنیف نہیں ہے۔ خالد بشیر احمد جہلم کے حوالے سے کشمیر کی تاریخ و ثقافت کی انفرادیت نمایاں کرنے کی غرض سے اساطیر و علامات، روایات و مفروضات کو کمالِ دیدہ وری کے ساتھ تصرف میں لاتے ہیں۔ اسی طرح واقعات کے انتخاب اور ترتیب میں پختہ کار تخلیقیت کی رنگ آمیزی نے دیدہ آبِ رواں میں واقعاتی ماضی سے زیادہ امکانی ماضی کو نمایاں کیا ہے۔ تمام تر معنوی تہہ داری اور جمالیاتی پہلو داری کے ساتھ۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں تاریخ و ثقافت ادب کے قالب میں داخل ہو گئی ہے۔

یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ خالد بشیر احمد نے کشمیر کی سماجی و ثقافتی زندگی کے معتبر نظام (System) کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ کشمیر کے حقیقی خد و خال کی بازیافت بھی ہو سکے اور اہل کشمیر کی تحت الشعور کی سرگرمیوں کے اسرار تک بھی پہنچا جاسکے۔ اس ضمن میں خالد بشیر احمد نے اوّل تو کشمیری معاشرہ اور ثقافت کے متعدد دظواہر یعنی قیام، طعام، رسم، رواج، عقائد و اوہام، شادی بیاہ، کاشتکاری، ماہی گیری اور تجارت تک کے طور طریقوں کا بڑی باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور پھر ان سب کو جہلم کے ذریعہ آپس میں مربوط کر دیا ہے۔ دراصل خالد بشیر احمد نے مشہور ماہر بشریات لیوی اسٹراس (Levi Straus) کی طرح ہی اساطیر کی ترتیب کے پیچیدہ عمل سے گزر کر ہی کشمیر کی سماجی و ثقافتی زندگی کے نظم کو جہلم سے متعلق اساطیر کی روشنی میں، جہلم کو ایک 'مٹھ' کے طور پر برت کر ڈھونڈا ہے۔ جہلم بذاتِ خود ایک زندہ 'مٹھ' ہے جو اہل کشمیر کے لیے ایک قوت، ایک درس کا حکم رکھتا ہے۔ لیوی اسٹراس کی طرح

خالد بشیر احمد نے بھی یہ واضح کیا ہے کہ جب تک کوئی ثقافت وحدانی رہتی ہے، مٹھ کی اصل میں تبدیلی نہیں ہوتی اور اگر بیرونی اثرات کے سبب کشمیر کی ثقافت خالصتاً وحدانی نہیں رہ گئی اس لئے کشمیر کے زندہ اور متحرک 'مٹھ'، جہلم کی اصل میں بھی رد و بدل تو ہوا لیکن جہلم کی ہمہ جہت معنویت آج بھی برقرار ہے۔ اسی بناء پر خالد بشیر احمد نے بجا طور پر لکھا ہے کہ 'جہلم ایک دریا ہی نہیں بلکہ کشمیر کی پہچان ہے۔ اس زمین سے متعلق شاید ہی کوئی پہلو یا زاویہ ہو جس کے ساتھ جہلم کا براہ راست تعلق نہیں'۔

دیدہ آبِ رواں کشمیر کی عصری، سماجی و ثقافتی صورتحال کے تناظر میں ایک پختہ کار شاعر، ادیب اور دانشور خالد بشیر احمد کے مدبرانہ ردِ عمل سے عبارت ہے۔ دراصل 1947 کے بعد خوابوں کی شکستگی اور امیدوں کی نارسائیوں کے سبب کشمیری تخلیقیت اور دانشوری میں قومی تہذیب، تاریخ اور تشخص کے حوالے سے جوشدید مرکز (Centripetal) جذبات و احساسات پیدا ہوئے تھے وہ نویں دہائی کے آخر تک آتے آتے کشمیری معاشرت اور سیاست ہی نہیں ادب و ثقافت میں بھی مختلف و متضاد اظہاری رویوں میں ڈھلنے لگے۔ ایک مثبت اور تعمیری رویہ کشمیر کی تاریخ و ثقافت کے تناظر میں، کشمیر کے ثقافتی افراند و امتیاز کے تحفظ اور تشکیل جدید کا بھی ہے۔ دیدہ آبِ رواں اسی رویہ کی غماز ہے۔ خالد بشیر احمد نے یہ کارنامہ جہلم کو ایک زندہ، متحرک اور صد پہلو مٹھ کے طور پر برت کر انجام دیا ہے، وہ بھی اس معیار کے ساتھ کہ دیدہ آبِ رواں سے رجوع کیے بغیر کشمیر شناسی کے کسی بھی عمل کو اعتبار حاصل کرنے میں دشواری ہوگی۔

محض واقعات کا بیان نہیں اور نہ ہی گزشتہ واقعات کے ہر جائزے کو تاریخ کا منصب عطا کیا جاسکتا ہے۔ تاریخ نویسی کے لیے متعلقہ زمین، قوم اور ثقافت کے حوالے سے حقائق و کوائف کی بھرپور آگہی، واضح تاریخی نظریہ، اظہار و بیان کی قوت، تصوّر و تخیل کی بلند پروازی مطالعہ و مشاہدہ کی گہرائی و ہمہ جہتی وغیرہ بہت ساری خوبیوں کا حامل ہونا لازمی ہے اور دیدہ آبِ رواں کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ خالد بشیر احمد کے یہاں یہ سارے امتیازات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ خالد بشیر احمد کی تصنیف یہ تاثر دیتی ہے کہ کشمیر کی کوئی معتبر تاریخ ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے۔ اسے خالد بشیر احمد کا نظریہ تاریخ کہہ سکتے ہیں لیکن دیدہ آبِ رواں نرے خارجی واقعات سے بندھی تصنیف نہیں ہے۔ خالد بشیر احمد جہلم کے حوالے سے کشمیر کی تاریخ و ثقافت کی انفرادیت نمایاں کرنے کی غرض سے اساطیر و علامات، روایات و مفروضات کو کمالِ دیدہ وری کے ساتھ تصرف میں لاتے ہیں۔ اسی طرح واقعات کے انتخاب اور ترتیب میں پختہ کار تخلیقیت کی رنگ آمیزی نے دیدہ آبِ رواں میں واقعاتی ماضی سے زیادہ امکانی ماضی کو نمایاں کیا ہے۔ تمام تر معنوی تہہ داری اور جمالیاتی پہلو داری کے ساتھ۔ اور یہ وہ مقام ہے جہاں تاریخ و ثقافت ادب کے قالب میں داخل ہو گئی ہے۔

یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ خالد بشیر احمد نے کشمیر کی سماجی و ثقافتی زندگی کے معتبر نظام (System) کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ کشمیر کے حقیقی خد و خال کی بازیافت بھی ہو سکے اور اہل کشمیر کی تحت الشعور کی سرگرمیوں کے اسرار تک بھی پہنچا جاسکے۔ اس ضمن میں خالد بشیر احمد نے اوّل تو کشمیری معاشرہ اور ثقافت کے متعدد دظواہر یعنی قیام، طعام، رسم، رواج، عقائد و اوہام، شادی بیاہ، کاشتکاری، ماہی گیری اور تجارت تک کے طور طریقوں کا بڑی باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا ہے اور پھر ان سب کو جہلم کے ذریعہ آپس میں مربوط کر دیا ہے۔ دراصل خالد بشیر احمد نے مشہور ماہر بشریات لیوی اسٹراس (Levi Straus) کی طرح ہی اساطیر کی ترتیب کے پیچیدہ عمل سے گزر کر ہی کشمیر کی سماجی و ثقافتی زندگی کے نظم کو جہلم سے متعلق اساطیر کی روشنی میں، جہلم کو ایک 'متھ' کے طور پر برت کر ڈھونڈا ہے۔ جہلم بذاتِ خود ایک زندہ 'متھ' ہے جو اہل کشمیر کے لیے ایک قوت، ایک درس کا حکم رکھتا ہے۔ لیوی اسٹراس کی طرح

خالد بشیر احمد نے بھی یہ واضح کیا ہے کہ جب تک کوئی ثقافت وحدانی رہتی ہے، مٹھ کی اصل میں تبدیلی نہیں ہوتی اور اگر بیرونی اثرات کے سبب کشمیر کی ثقافت خالصتاً وحدانی نہیں رہ گئی اس لئے کشمیر کے زندہ اور متحرک 'مٹھ'، جہلم کی اصل میں بھی رد و بدل تو ہوا لیکن جہلم کی ہمہ جہت معنویت آج بھی برقرار ہے۔ اسی بناء پر خالد بشیر احمد نے بجا طور پر لکھا ہے کہ 'جہلم ایک دریا ہی نہیں بلکہ کشمیر کی پہچان ہے۔ اس زمین سے متعلق شاید ہی کوئی پہلو یا زاویہ ہو جس کے ساتھ جہلم کا براہ راست تعلق نہیں'۔

دیدہ آب رواں کشمیر کی عصری، سماجی و ثقافتی صورتحال کے تناظر میں ایک پختہ کار شاعر، ادیب اور دانشور خالد بشیر احمد کے مدبرانہ ردِ عمل سے عبارت ہے۔ دراصل 1947 کے بعد خوابوں کی شکستگی اور امیدوں کی نارسائیوں کے سبب کشمیری تخلیقیت اور دانشوری میں قومی تہذیب، تاریخ اور تشخص کے حوالے سے جوشدید مرکز (Centripetal) جذبات و احساسات پیدا ہوئے تھے وہ نویں دہائی کے آخر تک آتے آتے کشمیری معاشرت اور سیاست ہی نہیں اب و ثقافت میں بھی مختلف و متضاد اظہاری رویوں میں ڈھلنے لگے۔ ایک مثبت اور تعمیری رویہ کشمیر کی تاریخ و ثقافت کے تناظر میں، کشمیر کے ثقافتی افراند و امتیاز کے تحفظ اور تشکیل جدید کا بھی ہے۔ 'دیدہ آب رواں' اسی رویہ کی غماز ہے۔ خالد بشیر احمد نے یہ کارنامہ جہلم کو ایک زندہ متحرک اور صد پہلو مٹھ کے طور پر برت کر انجام دیا ہے، وہ بھی اس معیار کے ساتھ کہ دیدہ آب رواں سے رجوع کیے بغیر کشمیر شناسی کے کسی بھی عمل کو اعتبار حاصل کرنے میں دشواری ہوگی۔

دریائے جہلم کی مستند تاریخ

پروفیسر محمد اشرف وانی

خالد بشیر احمد کی تصنیف 'دیدہ آب رواں' تقریباً ایک دہائی سے زیادہ کی عرق ریزی کا ثمرہ ہے۔ یہ نہ صرف دریائے جہلم کی ایک مستند تاریخ ہے بلکہ جہلم کی بدولت اور جہلم کے کناروں پر جو تہذیب و تمدن وجود میں آیا اور پنپا یہ اُس کو پرت در پرت کھول دیتی ہے۔ میں نے خوشی خوشی اس کتاب کا مطالعہ شروع سے لیکر آخر تک کیا کیونکہ یہ میرے نزدیک ایک مستند تاریخ کی تصنیف ہے جو ایک ایسے دوست کا کام ہے جو پیشہ سے مورخ نہیں ہے۔ اس درجہ کے معیاری کام کی توقع بالعموم ایک پیدائشی شاعر اور ادیب سے نہیں کی جاسکتی کیونکہ شعراء اور ادباء فکری طور پر شاعرانہ تخیلات کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ ایسے کام کی اُمید نہ تو ایک صحافی سے اور نہ ہی سیاست کے ماہر سے کی جاسکتی ہے جنہیں کسی تاریخی واقعہ کی تہہ تک جانے اور اُس کے اصل محرکات کا پتہ لگانے کی عمومی طور پر کوئی تربیت حاصل نہیں ہوتی۔

خالد بشیر احمد نے اس درجہ کی تاریخ کی کتاب لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ نہ نفسہ ایک یکتائے روزگار شاعر و ادیب، صحافی اور ماہر سیاست ہیں جو اپنا میدانِ عمل چھوڑے بغیر ہی مورخین کی برداری میں اپنا نام ثبت کروانے کے اہل ہیں۔ اُن کا یہ کام بلاشبہ قابل رشک ہے۔ اس کتاب نے مجھے کئی طرح سے متاثر کیا ہے۔ سب سے پہلے اس نے مجھے مورخوں کا اکثر دہرایا جانے والا محاورہ یاد دلایا کہ

Fact is like a sack, it won't stand up until you put something into it.
Facts do not speak themselves. It is the historian who makes them

to speak خالد بشیر صاحب نے جب تک دریائے جہلم کو قوتِ گویائی نہیں بخشی تب تک وہ محض ایک بہتا ہوا دریا تھا۔ قریب قریب ایک مردہ حقیقت جو معانی سے عاری تھی۔ اس دریا سے معانی کے موتی تلاش کر کے خالد بشیر احمد نے جہلم کو نہ صرف لسانِ ناطق بخشی بلکہ اُسے نقطۂ ارتقا بنا کر پوری کشمیر کی تاریخ کو طبقات الارض کے دور سے لیکر جدید دور تک اس کے ارد گرد گھمایا۔ ایک مورخ کی پہچان اس کی نئی insight یعنی کسی زیرِ نظر موضوع کو نئے زاویے سے جانچنے پر منحصر ہوتی ہے۔

اگر اس نقطہٴ نظر سے دیکھا جائے تو خالد صاحب ایک پختہ کار مورخ ثابت ہوئے کیونکہ انہوں نے تاریخِ کشمیر کا ایک نیا فیکٹر یعنی جہلم فیکٹر اُجاگر کیا۔ یہ بات ہمیں دورِ جدید کے ایک مشہور تاریخ داں فرڈیننڈ براڈیل Frednand Braudel کی The Medeteranian and Meditarian کی یاد تازہ کرتی ہے۔ براڈیل کی طرح ہی خالد صاحب وادی کی جملہ عقائد، اساطیر، اساطیری ادب، گاؤں اور شہروں کی آباد کاری، شاعرانہ حسیت، سماجی طبقہ واریت، طرزِ زندگی، معیشت، ٹیکنالوجی، زبان، لوک کہانیاں، اجتماعی مزاج، شناخت، سیاست اور گورننس کو دریا ئے جہلم کے پس منظر میں رکھ کر جانچتے ہیں۔ وہ نہایت کامیابی کے ساتھ جہلم اور کشمیر کے مجموعی ماحول کے درمیان باہمی روابط کو استوار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک نئے نظریے کے قائل ہیں اور وہ ہے Jhelum Theory of Kashmir History جو بڑی حد تک ماضی میں رونما ہونے والے واقعات کے کیوں اور کیسے، کے ہمارے فہم و ادراک میں وسعت پیدا کرتا ہے۔

کتاب کا دوسرا متاثر کرنے والا پہلو یہ ہے کہ اس کی اساس بُنیادی ماخذ کے طویل و عریض سلسلے پر رکھی گئی ہے اور اس کے ماخذ بڑی حد تک نہ صرف روایتی ہیں مثلاً آثارِ قدیمہ، ہم عصر تاریخی مخطوطات، عقیدت مندانہ ادب، سفر نامے، سرکاری دستاویزات بلکہ انہوں نے معلومات کو غیر روایتی ماخذ کی بنیاد بھی فراہم کی ہے۔ کتاب کی تصنیف مختلف النوع قارئین کو ذہن میں رکھ کر عمل میں لائی گئی ہے۔ مورخین، جو عام طور پر واقعات کے وقوع پذیر ہونے کے اسباب و علل میں دلچسپی رکھتے ہیں، کے لیے یہ کتاب مورخ اور واقعات کے درمیان مکالمہ ہے

جو ایک شہر اور مضروہ ہونے کے ساتھ ساتھ غور و فکر کا آلہ ہے جو مزید اور تازہ تحقیق و جستجو کا غماز ہے۔ جغرافیہ دان حضرات جو جغرافیہ کو تہذیبوں اور تمدنوں کے ارتقاء کا بنیادی سبب تصور کرتے ہیں، کے لیے یہ کتاب اس بات کی دلیل ہے کہ کشمیری سماج، تمدن، معیشت، سیاست، ذہنیت وغیرہ ایسے مختلف پہلوؤں کا صحیح فہم و ادراک تب تک ممکن نہیں جب تک دریائے جہلم کو ذہن میں نہ رکھا جائے۔ زبان و ادب کے طالب علم کے لیے جو دوسرے امور کے علاوہ زبان کی اصل اور شعراءِ ادباء میں تحریک پیدا کرنے والے اسباب کی کھوج میں رہتا ہے یہ کتاب اس بات کا کھلا بیاض ہے کہ کیسے جہلم نے کشمیری زبان کے ذخیرہ الفاظ کو مالا مال کیا اور مقامی وغیرہ مقامی شعراء کو اچھا خاصا منظوم کلام وضع کرنے پر ابھارا جو دریائے جہلم کے مختلف گوشوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک سول انجینئر کے لیے یہ کتاب ٹیکنالوجی برائے تعمیر پل کی منظم دستاویز ہے جو ناؤ سٹیو ٹیکنالوجی (کشتیوں کو جوڑ کر بنائے جانے والے پل) سے لے کر باقاعدہ پلوں کی تعمیر اور پھر جدید دور کے سیمنٹ سے بنے پلوں تک احاطہ کرتی ہے۔

وہ لوگ جو سیلابوں سے متاثر ہوئے ہیں یا وہ جن کی ذمہ داری سیلابوں کی روک تھام ہے کہ یہ کتاب ماضی رفتہ سے لیکر آج کے دور تک تباہ کن سیلابوں کا خاکہ پیش کرتی ہے اور یہ معلومات دو طرح سے مفید ہیں۔ ایک یہ اُن سے جدید دور میں کیسے رہنمائی حاصل کی جائے اور دوم سیلابوں سے کیسے بچا جائے۔ ماحولیاتی ماہر اور ایک منتظم کے لیے یہ کتاب ایک تنبیہ ہے کہ دریائے جہلم عنقریب ایک گٹر میں تبدیل ہونے والا ہے جب کہ ماہرین اقتصادیات کے لیے یہ جہلم کی اقتصادی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ ماہر سماجیات کے لیے یہ کشمیری معاشرے سے متعلق ایک ہمہ جہت معلومات کا خزانہ ہے۔ ایک عام قاری کے لیے یہ کتاب تاریخ کشمیر کے مختلف پہلوؤں سے متعلق اطلاعات کا بیش بہا خزانہ ہے جو سلیس اسلوب میں ناول کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ مجموعی طور پر جائے تو یہ کتاب اہل وطن کے لیے لکھی گئی ہے تاکہ ان میں Sense of belonging اور مضبوطی کی جائے۔ میری خواہش ہے کہ خالد بشیر احمد اپنے اس مشن کو بنائے رکھیں اور اپنے مادر وطن کی تاریخ کے نئے مناظر ہمارے سامنے لا کر ہمارے حال اور مستقبل کو سنوارنے میں اپنا دستِ تعاون پیش کرتے رہیں۔

دیدہ آبِ رواں۔ محققانہ ژرف نگاہی

پروفیسر محمد اسد اللہ دوانی

خالد بشیر احمد کا ایک ادبی کارنامہ کشمیر اور جہلم کے تعلق سے ان کی اہم اور مستند تحقیق 'دیدہ آبِ رواں' ہے جو ان کے ایک معتبر ادیب مؤرخ اور باوقار محقق ہونے کی دلیل ہے۔ اردو زبان میں اس معلومات افزا کتاب کے منصہ شہود پر آنے کے پس پردہ اُن کی اپنی ہی انگریزی تصنیف 'جہلم'.... دی ریور تھر و مائی بیک یارڈ ہے جسے اہل نظر محققین اور مورخین نے کشمیر کی تاریخ میں 'جہلم فیکٹر' میں ایک اہم اضافہ قرار دیا ہے۔ ۲۳۸ صفحات کی حامل یہ کتاب انگریزی کی طرح اردو میں بھی دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے صفحہ تین پر موجود یہ عبارت 'کشمیر کی سرزمین، تاریخ، اساطیر، ادب، ثقافت اور معیشت کے بیچ بہتے دریائے جہلم کی سرگزشت' اس کتاب کا مکمل آئینہ ہے۔ صفحہ پانچ پر 'والدین مرحومین کے نام' سے انتساب ہے اور صفحہ سات سے بارہ تک 'ترتیب' کے عنوان کے تحت مشمولات کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تین صفحات پر مبنی مصنف کا تحریر کردہ 'حرفِ اوّل' ہے اور اس کے بعد کشمیر، اساطیر، معاونین، سفر، ثقافت، ادب، سیلاب، پل، آلودگی، اور معیشت کے عنوانات کے تحت کتاب ہذا کے دس باب ہیں اور ہر باب کے متعدد ذیلی یا ضمنی ابواب ہیں۔ یوں تو خالد بشیر احمد نے ہر باب کے اختتام پر 'حوالہ جات' کے ضمن میں اُن تمام کتب اور رسائل کی تفصیل دی ہے جن سے انہوں نے متعلقہ باب تحریر کرتے اہم اور ضروری معلومات اخذ کی ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے کتاب کے آخر میں 'کتابیات' کے عنوان کے تحت کتب، جرائد اور

جو ایک شمر آور مضروضہ ہونے کے ساتھ ساتھ نور و گل کا آلہ ہے جو مزید اور تازہ تحقیق و جستجو کا غماز ہے۔ جغرافیہ دان حضرات جو جغرافیہ کو تہذیبوں اور تمدنوں کے ارتقاء کا بنیادی سبب تصور کرتے ہیں، کے لیے یہ کتاب اس بات کی دلیل ہے کہ کشمیری سماج، تمدن، معیشت، سیاست، ذہنیت وغیرہ ایسے مختلف پہلوؤں کا صحیح فہم و ادراک تب تک ممکن نہیں جب تک دریائے جہلم کو ذہن میں نہ رکھا جائے۔ زبان و ادب کے طالب علم کے لیے جو دوسرے امور کے علاوہ زبان کی اصل اور شعراء ادباء میں تحریک پیدا کرنے والے اسباب کی کھوج میں رہتا ہے یہ کتاب اس بات کا کھلابیاض ہے کہ کیسے جہلم نے کشمیری زبان کے ذخیرہ الفاظ کو مالا مال کیا اور مقامی وغیرہ مقامی شعراء کو اچھا خاصا منظوم کلام وضع کرنے پر ابھارا جو دریائے جہلم کے مختلف گوشوں کی عکاسی کرتا ہے۔ ایک سول انجینئر کے لیے یہ کتاب ٹیکنالوجی برائے تعمیر پل کی منظم دستاویز ہے جو ناؤ سٹیو ٹیکنالوجی (کشتیوں کو جوڑ کر بنائے جانے والے پل) سے لے کر باقاعدہ پلوں کی تعمیر اور پھر جدید دور کے سیمنٹ سے بنے پلوں تک احاطہ کرتی ہے۔

وہ لوگ جو سیلابوں سے متاثر ہوئے ہیں یا وہ جن کی ذمہ داری سیلابوں کی روک تھام ہے کہ یہ کتاب ماضی رفتہ سے لیکر آج کے دور تک تباہ کن سیلابوں کا خاکہ پیش کرتی ہے اور یہ معلومات دو طرح سے مفید ہیں۔ ایک یہ اُن سے جدید دور میں کیسے رہنمائی حاصل کی جائے اور دوم سیلابوں سے کیسے بچا جائے۔ ماحولیاتی ماہر اور ایک منتظم کے لیے یہ کتاب ایک تنبیہ ہے کہ دریائے جہلم عنقریب ایک گٹر میں تبدیل ہونے والا ہے جب کہ ماہرین اقتصادیات کے لیے یہ جہلم کی اقتصادی اہمیت کو اجاگر کرتی ہے۔ ماہر سماجیات کے لیے یہ کشمیری معاشرے سے متعلق ایک ہمہ جہت معلومات کا خزانہ ہے۔ ایک عام قاری کے لیے یہ کتاب تاریخ کشمیر کے مختلف پہلوؤں سے متعلق اطلاعات کا بیش بہا خزانہ ہے جو سلیس اسلوب میں ناول کی طرز پر لکھی گئی ہے۔ مجموعی طور پر جائے تو یہ کتاب اہل وطن کے لیے لکھی گئی ہے تاکہ ان میں Sense of belonging اور مضبوطی کی جائے۔ میری خواہش ہے کہ خالد بشیر احمد اپنے اس مشن کو بنائے رکھیں اور اپنے مادر وطن کی تاریخ کے نئے مناظر ہمارے سامنے لا کر ہمارے حال اور مستقبل کو سنوارنے میں اپنا دست تعاون پیش کرتے رہیں۔

دیدہ آبِ رواں - محققانہ ژرف نگاہی

پروفیسر محمد اسد اللہ دوانی

خالد بشیر احمد کا ایک ادبی کارنامہ کشمیر اور جہلم کے تعلق سے ان کی اہم اور مستند تحقیق 'دیدہ آبِ رواں' ہے جو ان کے ایک معتبر ادیب مورخ اور باوقار محقق ہونے کی دلیل ہے۔ اردو زبان میں اس معلومات افزا کتاب کے منصہ شہود پر آنے کے پس پردہ ان کی اپنی ہی انگریزی تصنیف 'جہلم'..... دی ریور تھر و مائی بیک یارڈ ہے جسے اہل نظر محققین اور مورخین نے کشمیر کی تاریخ میں 'جہلم فیکٹر' میں ایک اہم اضافہ قرار دیا ہے۔ ۲۴۸ صفحات کی حامل یہ کتاب انگریزی کی طرح اردو میں بھی دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے صفحہ تین پر موجود یہ عبارت 'کشمیر کی سرزمین، تاریخ، اساطیر، ادب، ثقافت اور معیشت کے بیچ بہتے دریائے جہلم کی سرگزشت' اس کتاب کا مکمل آئینہ ہے۔ صفحہ پانچ پر والدین مرحومین کے نام سے انتساب ہے اور صفحہ سات سے بارہ تک 'ترتیب' کے عنوان کے تحت مشمولات کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے تین صفحات پر مبنی مصنف کا تحریر کردہ 'حرفِ اول' ہے اور اس کے بعد 'کشمیر، اساطیر، معاونین، سفر، ثقافت، ادب، سیلاب، پل، آلودگی، اور معیشت' کے عنوانات کے تحت کتاب ہذا کے دس باب ہیں اور ہر باب کے متعہذ ذیلی یا ضمنی ابواب ہیں۔ یوں تو خالد بشیر احمد نے ہر باب کے اختتام پر 'حوالہ جات' کے ضمن میں ان تمام کتب اور رسائل کی تفصیل دی ہے جن سے انہوں نے متعلقہ باب تحریر کرتے اہم اور ضروری معلومات اخذ کی ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے کتاب کے آخر میں 'کتابیات' کے عنوان کے تحت کتب، جرائد اور

سرکاری رپورٹوں کی تفصیل بھی دی ہے جس سے کتاب کی اہمیت اور افادیت کے ساتھ ساتھ اس کے استناد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

’دیدہ آب رواں‘ کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد قاری کو خالد بشیر احمد کی محققانہ ژرف نگاہی اور مؤرخانہ موشگافیوں کے ساتھ ساتھ اُن کی شاعرانہ بصیرت اور ادیبانہ صلاحیتوں کا بھی معترف ہونا پڑتا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے توسط سے دریائے جہلم کو ایک جیتا جاگتا روپ عطا کیا ہے۔ یہ دریا وادی کشمیر کی شہ رگ ہے، یہ کشمیری عوام کا بالبالا مذهب و ملت اور رنگ و نسل ایک امتیازی نشان ہے، اس میں ماں کی ممتا اور باپ کی پرانہ شفقت ہے، یہ حیات بخش اور روح پرور ہے، یہ یہاں کے عوام کے عیبوں کی بے لوث پردہ پوشی کرتا ہے اور اپنے خزانے سے کتنے ہی لوگوں کو روزی روٹی فراہم کرتا ہے۔ دلتا، دیتھ، بہت، ہائی ڈیس پس یا جہلم اور کشمیر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ دستیاب تاریخی مواد کے مطابق قدیم زمانے سے ہی دریائے جہلم کشمیر اور یہاں کے عوام کے لیے کس قدر اہم رہا ہے اس کا اندازہ خالد بشیر احمد کی تصنیف ’دیدہ آب رواں‘ کے مطالعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

’یہ دریا جنوبی کشمیر کے ویری ناگ قصبہ میں پیر پینچال پہاڑ کے دامن میں سطح سمندر سے ۱۸۶۰ میٹر کی بلندی پر صنوبر کے درختوں کے بیچ پھوٹنے والے ایک چشمے سے جنم لیتا ہے‘

جہلم اپنے سرچشمہ ویری ناگ قصبہ سے لے کر پاکستان میں دریائے چناب کے ساتھ ملنے تک ۲۴۲ کلومیٹر کا طویل سفر طے کرتا ہے۔ خالد بشیر احمد دریا کے اس سفر کے تعلق سے اپنے خاص اسلوب میں تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

’جہلم نے یہاں کے عوام کی زندگی اور معیشت کے فروغ کے علاوہ اپنے بہاؤ کے راستے میں منظر نامے کی خوب صورتی میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ عام دریا سے کہیں بڑھ کر جہلم اپنی زمین پیدائش کی سب سے توانا شناخت ہے اور مقامی تہذیب کی مٹی میں اپنی گہری

جڑیں رکھتا ہے۔ اس نے ایک محبوبہ کی طرح مقامی لوگوں کو مسرت کے لمحات بھی عطا کیے اور تشویش سے بھی ہم کنار کیا، غم میں بھی ساتھ دیا اور خوشی میں بھی شریک رہا۔ یہ دریا اُن کے عروج و زوال اور کشمکش کا چشم دید گواہ ہے اور کشمیری اساطیر، تاریخ، تمدن، معیشت، سماجیات، غرض ہر پہلو کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

’دیدہ آبِ رواں‘ کہنے کو تو وادی کشمیر، اس کی تاریخ، اساطیر، ادب، ثقافت اور معیشت کے بیچ بہتے دریائے جہلم کی سرگزشت ہے لیکن سرگزشت سے بڑھ کر یہ جہلم، کشمیر اور اس سے ملحق علاقہ جات کی ایک نادر تاریخ بھی ہے اور مجموعی طور پر کشمیر سے متعلق لکھی گئی تواریخی کتب میں ایک اہم اضافہ بھی۔ کتاب کے ڈسٹ کور کے اندرون میں دی گئی یہ عبارت نہ صرف اس بات کی شاہد ہے بلکہ اس کی مزید وضاحت بھی کرتی ہے۔

’دیدہ آبِ رواں‘ کشمیر پر لکھی گئی پہلی کتاب ہے جس میں دریائے جہلم کے حوالے سے وادی کی تاریخ، اساطیر، ثقافت، ادب، معیشت، غرض ہر پہلو پر معتبر بات کی گئی ہے۔ قدیم کتابوں، تاریخ، مخطوطات، سفر ناموں اور سائنسی، تحقیقی اور ادبی مطالعات اور ایسے حوالوں نے کتاب کو اس موضوع پر نہ صرف سند کا درجہ عطا کیا ہے بلکہ کشمیر کی تاریخ میں جہلم کے ایک نئے باب کا بھی اضافہ کیا ہے۔

زیر نظر کتاب پہلی مرتبہ جہلم کو اساطیر کی زنجیروں سے آزاد کر کے اس کے کردار کو پرت در پرت کھول دیتی ہے اور دریا کے رواں پانی میں سے صدیوں پر محیط کشمیر کی زندگی کا عکس پیش کرتی ہے۔

’دیدہ آبِ رواں‘ کو خالد بشیر احمد نے منصہ شہود پر معرض وجود میں لانے کے لیے کشمیر کی تاریخ کے اچھا سمندر میں غوطہ زنی کی ہے اور کشمیر اور جہلم سے متعلق گوہر آبدار نکال لائے ہیں۔ یوں یہ تاریخی دستاویز خالد بشیر احمد کے علمی تحیر، تاریخ کے وسیع اور گہرے مطالعے، ذاتی تجربات، ہمہ گیر مشاہدات اور فکر آمیز نتائج کا حاصل ہے۔ اس کی پیش کش میں ان کا اسلوب نگارش بھی بڑا مسحور کن اور دل چسپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے شائع ہوتے ہی

سماجی، تاریخی اور ادبی حلقوں بالخصوص کشمیر اور کشمیریات سے دل چسپی رکھنے والوں نے اس کتاب کی بے پناہ پذیرائی کی ہے اور اس طرح کا کارہائے نمایاں انجام دینے پر صاحب کتاب کو تحسین بھی پیش کی ہے۔ اہل رائے نے جہاں اس کی سراہنا کی ہے وہاں اخبارات نے بھی قابل قدر تبصرے شائع کیے ہیں۔ کتاب کے ڈسٹ کور کی پشت پر اس کتاب کے بارے میں شائع شدہ آراء کے مطالعے سے کتاب کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پروفیسر غلام رسول ملک سابق صدر شعبہ انگریزی کشمیر یونیورسٹی سری نگر خالد بشیر احمد کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں

’ایک مستند اور فرحت بخش کار نمایاں عبارت کرنے پر مبارک باد۔ یہ ایک مسور کن تحریر ہے جو پڑھنے والے کے علم کو ضیا اور اضافہ عطا کرتی ہے۔ میں بخوشی اس کی صحت، عالمانہ وزن اور زبان کی درستگی کی تصدیق کرتا ہوں۔‘

پروفیسر محمد اشرف صدر شعبہ تاریخ کشمیر یونیورسٹی سری نگر دیدہ آب رواں، کو موڑخ اور اس کے حقائق کے درمیان ایک مکالمہ گردانتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

’تاریخ دانوں کے لیے جو واقعات کے ’کیوں‘ اور ’کیسے‘ رونما ہونے میں دلچسپی رکھتے ہیں، یہ کتاب موڑخ اور اس کے حقائق کے درمیان ایک مکالمہ ہے.... اس سے تاریخ کشمیر میں ’جہلم فیکٹر‘ کا اضافہ ہوا ہے۔‘

’کشمیر ادب روز کے تبصرہ نگار نے اس کتاب کو ایک ثقافتی سفر نامہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

’یہ کتاب ثقافتی سفر نامہ ہے جو قاری کو سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی دریا کی گزرگاہ کی ہی نہیں بلکہ کشمیر کی ثقافت اور بوقلموں کی سیر کراتی ہے۔‘

’ٹریبون‘ اخبار کے مبصر نے اپنی رائے یوں پیش کی ہے:

’دریا کے کناروں کے ساتھ ساتھ صدیوں سے پیش آئے

واقعات کا احاطہ موضوع کی روانی کو ایک خوب صورت پس منظر فراہم کرتا ہے۔

’کشمیر نامنر‘ کے کالم نگار نے ان الفاظ میں اس کتاب کی سراہنا کی ہے:

’کتاب وادی کشمیر کے اہم دریا کی تصویر ہے جس میں خالد بشیر احمد نے آسان نثر اور شاعرانہ حسیت سے تاریخ، ثقافت اور سماجی مزاج کی نقش کاری کی ہے۔‘

المختصر ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ’دیدہ آب رواں‘ کشمیر اور جہلم سے متعلق معلومات کا ایک بیش بہا گنجینہ ہے۔ اس کا سرورق جہلم کے دونوں کناروں پر استادہ سری نگر شہر کی عمارات کی ایک دیدہ زیب تصویر ہے جس کے پس منظر میں نیل گوں آسمان کی جانب بلند ہوتا ہوا باری پر بت یا کوہ ماراں کا پُر شکوہ قلعہ بھی نظر آتا ہے۔ ڈسٹ کور پر بھی یہی تصویر ہے۔ سرورق یا جلد کی اندرونی جانب اور پشت کی دونوں اطراف صاحب کتاب کا تعارف مع تصویر اور کتاب کے بارے میں جو معلومات دی گئی ہیں وہ ڈسٹ کور پر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ جہلم، اس کی گزرگاہوں اور اس کے ساحلوں سے متعلق سولہ نادر و نایاب تصویریں بھی اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں جن میں سے ’دریائے جہلم کی پیدائش۔ چشمہ ویری ناگ، دریائے جہلم کی گزرگاہ، سری نگر کے قدیم شہر کے بچوں بیچ بہتا ہوا دریا، سری نگر شہر میں داخل ہونے سے پہلے سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا دریا، جہلم، برف باری کے بعد جہلم کے کنارے سری نگر میں بنڈکادل کش منظر، کشمیر کی مقدس زیارت گاہ خانقاہ معلیٰ کی ایک سو سالہ پرانی تصویر، جہلم کے پانیوں میں کشتیوں کا جلوس، پاکستان میں جہلم پر طویل ترین پل، وغیرہ قابل ذکر ہیں جو اس کتاب کی اہمیت کو دوبالا کرتی ہیں۔ گراں بازاری کے اس دور میں ایسی بصیرت افروز، معلومات افزا، دیدہ زیب اور پُر مغز کتاب کی قیمت ساڑھے پانچ سو بہت ہی مناسب ہے۔

کشمیر اور کشمیریات سے متعلق خالد بشیر احمد کی اس تحقیقی اور معلوماتی کتاب کے غائر مطالعے کے بعد قاری کی زبان پر بے ساختہ عرفی کا یہ شعر آ جاتا ہے۔

اگر فردوس بر رُوئے زمیں است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

”دیدہ آبِ رواں“ کی ادبی اہمیت

ڈاکٹر فریدہ کول

”دیدہ آبِ رواں“ خالد بشیر صاحب کا ایک ادبی کارنامہ ہے۔ یہ کشمیر اور کشمیریت سے منسلک دراصل ایک تاریخی مطالعہ ہے جو پانچ ہزار سالوں پر مشتمل کشمیریت کا احاطہ کرتا ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ اُن کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا ایک حسین اور دلکش امتزاج پایا جاتا ہے۔ جسے کشمیر کے اردو ادب یا دبستان کا ایک نادر، انوکھا اور گراں قدر سرمایہ تصور کیا جائے گا۔ مذکورہ کتاب کو تاریخ اور تخلیق کے دو آئینہ کا مرکب کہنا میرے خیال میں زیادہ بہتر رہے گا جس میں یہاں کی تاریخ کو ادبی رنگ و آہنگ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تاریخ بھی تخلیق میں ڈھل کر بصیرت اور مسرت کا سرچشمہ بن گئی ہے۔

”دیدہ آبِ رواں“ ایک ایسا مرکب استعارہ ہے جو کشمیریت کے صدر رنگ جلوؤں کی طرح تہہ دار اور معنی آفرین ہے۔ دراصل یہ استعارہ وادی کشمیر میں مختلف النوع حالات واقعات کا ایک ایسا بہتا ہوا دریا ہے جو کشمیری تہذیب و تمدن، تاریخ، معیشت اور علم و ادب کا گہوارہ رہ چکا ہے۔ نہ صرف اتنا بلکہ یہ جسم و جان رکھنے والا دریا، کیفیات، جذبات اور احساسات میں غرق خراماں خراماں بہتا ہوا وہ جہلم ہے جو نہ صرف روح افزاء، شاداب اور ذرخیز مناظر پیش کرتا ہے بلکہ یہ فکر و احساس میں بھی ذرخیزیت نمود پذیر کرنے والا ایسا دریا ہے جس کی چیدہ چیدہ مثالیں اور حوالے کتاب میں درج ہیں۔ شاعر مشرق علامہ اقبال اس سر زمین کشمیر میں ”مٹی کی نمی“ کو ذرخیزیت کے مترادف گردانتے ہیں اور خالد صاحب مذکورہ

کتاب میں اسی مطلوبہ ذرخیزیت کے دریا کو بہاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ بات وہ فخر کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ یہ ذرخیزیت نہ صرف یہاں کے نظاروں میں پائی جاتی ہے بلکہ یہاں کی تاریخ، تمدن، علم و ادب میں بھی اس کا اثر و نفوذ اس قدر گہرا نظر آتا ہے۔ کہ رنگارنگ علوم و فنون کی مرکزیت بھی اسی جہلم سے وابستہ ہے یہ کشمیر کی شناخت اور پہچان کا منبع بھی ہے اور مخزن بھی۔

”دیدہ آب رواں“ کا دوسرا مفہوم کشمیر کی غلامی، پستی، زبوں حالی اور مختلف ادوار میں مختلف حکمرانوں کے ظلم و تشدد کی سرگزشت بھی ہے جس کا بیان پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے اور قاری کی آنکھوں کے سامنے وہ پورا نقشہ پھر جاتا ہے جہاں بیرونی سیاست کاروں نے کشمیری قوم کو ایک محکوم، غلام اور مظلوم قوم کی صف میں لاکھڑا کر دیا۔

اکیسویں صدی میں ایسا مستند اور معتبر تاریخی کارنامہ اس درجہ گہرے مطالعہ کے ساتھ پیش کرنا قابل تحسین کارنامہ ہے۔ نیل مت پران، راج ترنگنی اور مشہور و معروف سیاحوں کی وادی میں آمد کی نیز ان کے شاعرانہ اور افسانوی تاثرات کو یکجا کر کے ان کو سلیقہ مندی کے ساتھ برتنا ان کی تحقیقی کاوشوں کا بین ثبوت ہے جو ان کی تنقیدی سوچہ بوجھ، سادہ سلیس اور راست انداز بیان میں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ انداز بیان ان کے صحافتی اسلوب کو مترشح کرتا ہے۔ کتاب میں جگہ جگہ ان کے قلم کی جاذبیت، ایجازیت، چستی، شگفتگی اور شائستگی نے ایسا دوامی تاثر پیدا کیا ہے کہ قاری کتاب کی بار بار ورق گردانی کرنے لگتا ہے اور وہ اس کا مطالعہ اسی ذوق و شوق کے ساتھ کرنا چاہتا ہے جس ذوق و شوق کے ساتھ مصنف نے یہ کتاب تحریر کی ہے۔

دریائے جہلم کا مرکب استعارہ دراصل ان کو اس لیے پیارا اور خوب صورت لگتا ہے کہ انہوں نے اپنے بچپن کا حسین دور جہلم کے انہی کناروں پر گزارا ہے جہاں ان کا پرانا گھر واقع تھا۔ اسی لیے دریائے جہلم کے ساتھ ان کی اس قدر جذباتی وابستگی ہے جو تخلیق کتاب کا مرکزی محور بھی ہے۔ فکر اور جذبے کی یہی ہم آہنگی کتاب کو ایک شاہکار کا درجہ عطا کرتی ہے۔ غرض کہ یہ ان کے مطالعہ حسن کی جلوہ آرائیاں ہیں جو قاری کو بصیرت اور مسرت سے ایک ساتھ

ظفر مند کرتی ہیں۔ اردو ادب کے تاثر آلی میدان میں جہاں علامہ شبلی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ وہاں اس کی کوپورا کرنے کے لیے خالد صاحب اس صف میں خندہ پیشانی کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں چنانچہ اُن کے قلم نے تاریخی حوالوں اور شواہد کو اس طرح برتا ہے کہ جو نتائج اور تاثرات سامنے آئے ہیں وہ ہر صورت میں گراں قدر، قابل قبول اور ساتھ ہی معنویت اور افادیت کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔ جہلم کی آپ بیتی کو انہوں نے جگ بیتی میں منتقل کر کے جہاں بحیثیت مورخ اپنا حق ادا کیا ہے۔ وہاں بحیثیت ایک مجھے ہوئے ادیب اور کچھ ہوئے نقاد کی طرح اردو کے تخلیقی ادب میں بھی اضافہ کیا ہے۔ آخر میں سعد احمد سحر کا درج ذیل شعر کتاب کی نذر کرتی ہوں۔

ہماری نسل کتابوں میں پڑھ کے چونکے گی
کہ آدمی کو کبھی پیار آدمی سے تھا

تاثرات

۱۔ آپ کی فکر میں تازگی، تخیل میں تنوع اور ادائیگی میں ندرت ہے۔
ڈاکٹر سہیل آغا

۲۔ آپ کے کلام کی خوبی اس کی بے پناہ تازگی ہے۔

بلراج کوئل

۳۔ آپ کے یہاں لب و لہجہ کی تازگی آپ کے فکری رجحان سے ہم آہنگ ہے۔

ندا فاضلی

۴۔ آپ کی شاعری کو پڑھ کر ایک نوع کی تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

فضا ابن فیضی

۵۔ چند احباب جیسے مخمور سعیدی اور بشیر بدر وغیرہ نے جدید غزل کے بارے میں یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ جدید غزل اپنے امکانات ختم کر چکی ہے۔ میں نے کہا ابھی خالد بشیر جیسے غزل گو موجود ہیں جو اس کے ختم شدہ امکانات کی تجدید بھی کر رہے ہیں اور اسے استحکام بھی بخش رہے ہیں۔

اپنی اُنکلی تھامے گھر سے نکلا تھا

لوٹا اپنا آپ گنوا کے اپنے ساتھ

میں نے یہ شعر سنایا، لوگ قائل ہو گئے۔

مصور سبزواری

۶۔ مجھے تو کسی کے یہاں سچی لگن اور خیرہ لگن تابناکی دیکھ کر جو اندرونی مسرت ہوتی ہے۔ آپ کی کتاب نے مجھے اس مسرت سے دوچار کیا۔

پرکاش فکری

آپ کے اشعار میں الفاظ کے حلقہ فائدہ استعمال کی مثالیں ملتی ہیں جو اچھی شاعری کی ضمانت ہیں۔

علاقہ شہلی

۸۔ خالد بشیر کی آواز جدید تر غزل کی تندرست و توانا آواز ہے۔

محمد ابوصالح

۹۔ اس مجموعے (صدائے نیم شب) کے بیشتر اشعار ایسے ہیں جنہیں انتخاب میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

رضوان احمد خان

۱۰۔ خالد بشیر نئے فکر و احساس کے شاعر ہیں۔ ان کے لہجے زبان اور طرز فکر میں زبردست تازہ کاری موجود ہے۔ ان کا لہجہ زبان اور اسلوب اپنا ہے اور پہاڑی ندی کی طرح خالص بھی۔

ڈاکٹر فرید پربتی

۱۱۔ خالد بشیر احمد ایک صاف ستھرے اسلوب کے شاعر ہیں۔

ڈاکٹر شفیق سوپوری

۱۲۔ خالد بشیر احمد صاحب کی تازہ تصنیف 'دیدہ آب رواں' پر جب میں نے نکل شام ڈھلے ایک نظر دوڑائی تو ایسا لگا جیسے میرے آگے ایک نہایت نادر واقعہ، ایک عجب کرشمہ وقوع میں آیا ہو۔ بہتے پانی کو آنکھ سے تعبیر کرنا بجائے خود ایک تخلیقی اچھبا ہے۔

پروفیسر رحمن راہی

۱۳۔ خالد بشیر احمد جانے مانے اور محترم شاعر ہیں اور شاعری کے بعد نثر کی طرف آنا اور اتنی خوبصورت نثر لکھنا کہ کچھ لمحوں کے لئے اُن کی شاعری تیرے ذہن سے اُتر جاتی ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ایسا نثر نگار ریاست نے پیدا کیا ہے جس کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

۱۴۔ خالد بشیر احمد نے اس درجہ کی تاریخ کی کتاب 'دیدہ آبِ رواں' لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ یہ نفسہ ایک یکتائے روزگار شاعر و ادیب، صحافی اور ماہر سیاست ہیں جو اپنا میدانِ عمل چھوڑے بغیر ہی مورخین کی برادری میں اپنا نام ثبت کروانے کے اہل ہیں۔ اُن کا یہ کلام بلاشبہ قابلِ رشک ہے۔

پروفیسر محمد اشرف وانی

۱۵۔ 'دیدہ آبِ رواں' کشمیر کی عصری سماجی و ثقافتی صورتِ حال کے تناظر میں ایک پختہ کار شاعر، ادیب اور دانشور خالد بشیر احمد کے مدِّ برانہ ردِ عمل سے عبارت ہے۔

ڈاکٹر قدوس جاوید

۱۶۔ 'دیدہ آبِ رواں' تخلیق بھی ہے اور ایک وقیع اور قابلِ قدر تخلیقی کارنامہ بھی۔

ڈاکٹر جی آر ملک

سخن ہائے خوشبو

شاعری کیا ہے کہ اک عمر گزاری ہم نے
چند الفاظ کو امکان و اثر دینے میں

(بانی)

۱۴۔ خالد بشیر احمد نے اس اورجیکل تاریخ کی کتاب 'دیدہ آبِ رواں' لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ وہ بہ نفسہ ایک یکتائے روزگار شاعر و ادیب، صحافی اور ماہر سیاست ہیں جو اپنا میدانِ عمل چھوڑے بغیر ہی مورخین کی برادری میں اپنا نام ثبت کروانے کے اہل ہیں۔ اُن کا یہ کلام بلاشبہ قابلِ رشک ہے۔

پروفیسر محمد اشرف وانی

۱۵۔ 'دیدہ آبِ رواں' کشمیر کی عصری سماجی و ثقافتی صورتِ حال کے تناظر میں ایک پختہ کار شاعر، ادیب اور دانشور خالد بشیر احمد کے مدِّ برانہ ردِ عمل سے عبارت ہے۔

ڈاکٹر قدوس جاوید

۱۶۔ 'دیدہ آبِ رواں' تخلیق بھی ہے اور ایک وقیع اور قابلِ قدر تخلیقی کارنامہ بھی۔

ڈاکٹر جی آر ملک

سخن ہائے خوشبو

شاعری کیا ہے کہ اک عمر گزاری ہم نے
چند الفاظ کو امکان و اثر دینے میں

(بانی)

حمد

وہ پیاس دیتا ہے تو اُس کے بعد پانی بھی
اسی یقین پہ ہے میری خوش گمانی بھی

اُسی کے حکم سے چلتی ہے جنگلوں میں ہوا
وہی جو دیتا ہے دریاؤں کو روانی بھی

یہ رنگ سارے اُسی کے زمیں پہ پکھرے ہیں
ہرا بھی، لال بھی، دھانی بھی، ارغوانی بھی

اُسی کے نام سے گھلتے ہیں باب ذہنوں کے
اُسی کی بخششیں الفاظ بھی، معانی بھی

اُسی نے بیج کو دی ہے حیات، بادل میں
پُھپائی برق بھی، سایہ بھی اور پانی بھی

نہیں ہے اُس کے سوا لایقِ سجود کوئی
وہ لا شریک بھی، واحد بھی، غیر فانی بھی

نعت

مدینے کی طرف جو سارے رستے جا رہے تھے
نظر میں اُس شہر کے خواب بستے جا رہے تھے

تڑپ ایسی کہ سر پٹ دوڑتی جاتی تھی خواہش
جباب ایسا زمیں میں پاؤں گڑتے جا رہے تھے

میرے سرکار کی خوش خلیقوں کے سامنے کیسے
عدو اللہ کے خیمے اکھڑتے جا رہے تھے

میری چشمِ دُعا اُس در پہ جتنی دیر جا ٹھہری
میرے عصیاں قد و قامت میں گھٹتے جا رہے تھے

میری اوقات اور پھر مدحتِ شانِ محمد ﷺ
دُورِ شوق میں یہ شعر بنتے جا رہے تھے

دُعا

وہ عزم و حوصلہ ہمیں اے ذوالجلال دے
سارا جہان جس کی ہمیشہ مثال دے

ہم پر ہمارے بعد بھی دُنیا کو ناز ہو
اے ربِ کائنات ہمیں وہ کمال دے

وہ ذہن کر عطا کہ زمانہ سنوار دیں
وہ ہاتھ دے کہ تارے فلک سے اُتار دیں

جو کام ہم کریں وہ آپ اپنی مثال ہو
جو لفظ ہم کہیں وہ فضائیں نکھار دیں

ایسا کبھی جہاں میں نہ پروردگار ہو
تیرے بوا کسی پہ کوئی انحصار ہو

غزلیں

منظر بدل گیا تو اذیت ہوئی فزوں
تم کیا گئے کہ آنکھ کی وحشت ہوئی فزوں

یوں بھی دیارِ دل میں رواں تھی ہوائے خوف
پتہ ہلا تو رات کی دہشت ہوئی فزوں

میں اپنے دل کے ہاتھ ہی مضروب ہو گیا
تجھ سے تو صرف درد کی شدت ہوئی فزوں

کچھ کم نہیں تھے بیش بہا میرے راتِ دن
لیکن تمہارے لمس سے قیمت ہوئی فزوں

کچھ رنگ و بو سے شام تھی آتش بہ دستِ دل
اور کچھ تیرے سخن سے تمازت ہوئی فزوں

دُعا

وہ عزم و حوصلہ ہمیں اے دُوجلال دے
سارا جہان جس کی ہمیشہ مثال دے

ہم پر ہمارے بعد بھی دُنیا کو ناز ہو
اے ربِ کائنات ہمیں وہ کمال دے

وہ ذہن کر عطا کہ زمانہ سنوار دیں
وہ ہاتھ دے کہ تارے فلک سے اُتار دیں

جو کام ہم کریں وہ آپ اپنی مثال ہو
جو لفظ ہم کہیں وہ فضائیں نکھار دیں

ایسا کبھی جہاں میں نہ پروردگار ہو
تیرے سوا کسی پہ کوئی انحصار ہو

غزلیں

منظر بدل گیا تو اذیت ہوئی فزوں
تم کیا گئے کہ آنکھ کی وحشت ہوئی فزوں

یوں بھی دیارِ دل میں رواں تھی ہوائے خوف
پتہ ہلا تو رات کی دہشت ہوئی فزوں

میں اپنے دل کے ہاتھ ہی مضروب ہو گیا
تجھ سے تو صرف درد کی شدت ہوئی فزوں

کچھ کم نہیں تھے بیش بہا میرے راتِ دن
لیکن تمہارے لمس سے قیمت ہوئی فزوں

کچھ رنگ و بو سے شام تھی آتش بہ دستِ دل
اور کچھ تیرے سخن سے تمازت ہوئی فزوں

جو کچھ ہوا ہے وہ تیرے میرے قیاس میں تھا
ہوا تھی تیز اور انگارہ خشک گھاس میں تھا

اب اس سے زیادہ کیا حالات کو بگڑنا تھا
پناہ جسم میں آہوئے جاں ہر اس میں تھا

جو سانحہ تھا وہ پھیلا دہائیوں پر تھا
اور اس کا تذکرہ چھوٹے سے اقتباس میں تھا

میرے سوال میں تھا سادگی کا آمیزہ
تیرا جواب بڑے مشتعل لباس میں تھا

غموں سے اب مجھے رشتے نبھانے آتے ہیں
وہ ایک دور تھا جس میں بڑا اداس میں تھا

اگرچہ دل کو بہت اس سے خوش گمانی ہے
میں جانتا ہوں ، یہ بادل بغیر پانی ہے

وہ طاق پر جلے یا رہگذر میں روشن ہو
چراغ سے ہوا کی دشمنی پرانی ہے

میرے لہو سے ہی اُٹھی ہے اختلاف کی موج
کبھی جو میں نے تجھے بھولنے کی ٹھانی ہے

تیرے کلام سے دن خوشبوؤں میں ڈوب گیا
تیرے خیال سے شب ہو رہی سہانی ہے

زیاں ہے اس میں تو یونہی سہی ، مگر میں نے
جہاں پہ عقل کی سُننی تھی ، دِل کی مانی ہے

نہ ہمیں خیر سے مطلب ہے نہ شر سے کوئی
ہمکو واقف رکھے بس تیری خبر سے کوئی

اے میرے دوست تجھے یاد ہے تیری خاطر
لوٹ کر آیا کئی بار سفر سے کوئی

صاحبِ عزّت و توقیر ہوں ، ڈر لگتا ہے
چھین لے جائے نہ دستار کو سر سے کوئی

میری باتوں پہ زمانے کو یقین آئے گا
تجھ کو دیکھے تو سہی میری نظر سے کوئی

جانِ من! عزّت سادات بھی کوئی شے ہے
یوں دبے پاؤں نہیں آتا ہے گھر سے کوئی

میں حق پہ ہوں مگر کوئی گواہ ساتھ نہیں
سفر ہے دشت کا اور زادِ راہ ساتھ نہیں

تمہارے شہر میں آیا ہوں تیرے کہنے پر
مگر رفیقِ جاں وہ تیری چاہ ساتھ نہیں

مجھے تو راستوں کی دشتوں کا ہے ادراک
میرے سفر میں کوئی مہر و ماہ ساتھ نہیں

میں دل کی سلطنتِ تنخیر کرنے نکلا ہوں
کوئی زرہ نہیں ، کوئی سپاہ ساتھ نہیں

مُسافرانِ شب اس کو چراغ جانتے ہیں
تیرا خیال کوئی خواہ مخواہ ساتھ نہیں

وصل کی شب تھی بہت تکلیف دہ ڈھلتی ہوئی
خیمہ دل میں ہو جیسے آگ سی لگتی ہوئی

ہم نے پہلی بار دیکھا ہے تمہارے ساتھ ہی
رنگِ محو گفتگو اور خوشبوئیں چلتی ہوئی

میں کہ ناداں تھا بنا سوچے کیا اظہارِ عشق
تُجھ جہاں دیدہ سے لیکن کیسے یہ غلطی ہوئی

خواب چتے تھے تمہاری ذات سے منسوب تھے
خواہشیں ساری تمہارے نام پر پلتی ہوئی

کچھ مصائب ہم پہ اترے جو کسی کے نام تھے
کچھ بلائیں اپنے سر سے دیکھ لی ٹلتی ہوئی

نہیں ہے دل کو خوںے رنگ و بُو اب کیا کیا جائے
تمہاری جستجو ہے گو بہ کو اب کیا کیا جائے

اٹھانا پڑ رہی ہے اب ہزیمت دل کے ہی ہاتھوں
کہ میرا دوست ہے میرا عذو اب کیا کیا جائے

وہ اپنی ہٹ پہ قائم ہے ہم اپنی ضد لئے بیٹھے
نہیں کھلتا ہے باب گفتگو اب کیا کیا جائے

میرے چہرے سے میرا حال سارے لوگ پڑھتے ہیں
میرا دشمن ہے میرا شیشہ رُو اب کیا کیا جائے

میں یہ جنگ آخری لمحوں میں تھا بس جیتنے والا
کہیں سے سامنے آیا ہے تُو اب کیا کیا جائے

سفرِ کٹھن ہے میرا رہنما ہے میرے ساتھ
کہ دشتِ خار میں ماں کی دُعا ہے میرے ساتھ

یہ کس کی قُربتوں کا معجزہ نصیب میں ہے
تجھلستی ریت پہ لکس ہوا ہے میرے ساتھ

تو آئے یا نہ آئے تیرے اختیار میں ہے
میرے تو پاؤں سے لپٹی انا ہے میرے ساتھ

میں سادہ دل کہ جیتی بازیاں بھی ہارتا ہوں
یہ المیہ تو بڑی دیر کا ہے میرے ساتھ

کچھ اور مجھکو ملا ہو نہ ہو وراثت میں
میرے بزرگوں کی طرزِ وفا ہے میرے ساتھ

ذرا سی دیر میں پانسہ پلٹ بھی سکتا ہے
جو اپنی بات پہ قائم ہے ہٹ بھی سکتا ہے

اسی یقین پہ زندہ ہے خوش گمانِ وفا
جو سر پہ ہجر کا بادل ہے چھٹ بھی سکتا ہے

نہیں ہے چیزِ حُسنِ لازوال کوئی بھی اب
یہ چہرہ گردِ زمانہ سے اٹ بھی سکتا ہے

فسادِ موج میں کشتی کو جو کنارہ دے
سکوتِ آب میں اُس کو اُلٹ بھی سکتا ہے

کسے دوام ، رُخ یار ہو کہ ماہِ تمام
فسونِ حُسن بتدریج گھٹ بھی سکتا ہے

پابہ بولاں شہر میں تقصیر کیا ، تعزیر کیا
سوچ بھی محصور ہو تو پاؤں کی زنجیر کیا

تازہ فرماں یہ ہوا جاری کہ سب مطلوب ہیں
طفل کیا ، خاتون کیا اور نوجوان کیا پیر کیا

ابتلا کا دور ہے اہل حرم مشکل میں ہیں
کابل و بغداد کیا ، گجرات کیا ، کشمیر کیا

میں کہ میرے ہاتھ سے تلوار میری چھن گئی
اب سر بازار میری عزت و توقیر کیا

ہم ہی ناداں زیرِ دام خوش بیانی آگئے
ورنہ تیرے عہد کیا تھے اور ہے تقصیر کیا

ہے دلِ یار بہت تنگ کہ گھر لگتا ہے
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

میں تو دشمن سے اکیلے ہی نیٹ بھی لوں گا
بس کہ دانائی احباب سے ڈر لگتا ہے

رنج لوگوں کو بہت ہوتا ہے تجھ سے مل کر
یوں تو آئینہ نہیں ہے تو مگر لگتا ہے

اُس کے ہونے کا جہاں کوئی بھی امکان نہیں
دیدہ شوق کو وہ شخص ادھر لگتا ہے

اُن سے جو میری ملاقاتیں ہوئی ہیں محدود
میرے یاروں کو یہ سب تیرا اثر لگتا ہے

بہار ہو کہ خزاں آئینہ ہے آئینہ
جو دیکھتا ہے وہی بولتا ہے آئینہ

ہے کوئی اور بھی سچ بولنے کا عادی ہو؟
بس ایک تم ہو یا پھر دوسرا ہے آئینہ

وہ ایک چہرہ جسے پھر کبھی نہیں دیکھا
وہ ایک چہرہ بہت ڈھونڈتا ہے آئینہ

اب ایسے شخص کا جس سے کوئی نہیں ملتا
اکیلے گھر میں بڑا آسرا ہے آئینہ

اسی لئے میں کبھی اس کے منہ نہیں لگتا
میں جانتا ہوں بہت سر دھرا ہے آئینہ

تُم ہی تُم ہو تو کوئی دوسرا کیا
یہ طے ہے تو دوبارہ پوچھنا کیا

مجھے اچھے بہت لگنے لگے ہو
میرے دل پر کوئی جادو کیا کیا

میں یونہی بے وجہ خوش ہو رہا ہوں
تمہارے ساتھ بھی ایسا ہوا کیا

یہ کیوں شک کی نظر سے دیکھتے ہو
کسی نے میرے بارے میں کہا کیا

فضا دل کی مہکنے لگ گئی ہے
کوئی اس گھر میں آکر بس گیا کیا

مرحلہ عشق کا ہے یا کہ جنوں کا کوئی
دل سے پہلو نہیں وابستہ سکوں کا کوئی

عمر بھر کون نبھاتا ہے مراسم ایسے؟
ہو نہ ہو غم سے ہے رشتہ میرا خوں کا کوئی

اب تیری باتیں بھی لگتی ہیں سنی سی پہلے
کیا ہوا رنگ جو تھا ان میں فسوں کا کوئی

دلِ خوش فہم تیرے ہاتھ سے بازی نکلی
اب یہ موقعہ تیری 'ہاں' کا ہے نہ 'ہوں' کا کوئی

میرے ہی لب سے یہ الفاظ ادا ہونے تھے
مجھ سے ہی رشتہ تھا آشفۃ سروں کا کوئی

تُم ہی تُم ہو تو کوئی دوسرا کیا
یہ طے ہے تو دوبارہ پوچھنا کیا

مجھے اچھے بہت لگنے لگے ہو
میرے دل پر کوئی جادو کیا کیا

میں یونہی بے وجہ خوش ہو رہا ہوں
تمہارے ساتھ بھی ایسا ہوا کیا

یہ کیوں شک کی نظر سے دیکھتے ہو
کسی نے میرے بارے میں کہا کیا

فضا دل کی مہکنے لگ گئی ہے
کوئی اس گھر میں آکر بس گیا کیا

مرحلہ عشق کا ہے یا کہ جنوں کا کوئی
دل سے پہلو نہیں وابستہ سکوں کا کوئی

عمر بھر کون نبھاتا ہے مراسم ایسے؟
ہونہ ہو غم سے ہے رشتہ میرا خوں کا کوئی

اب تیری باتیں بھی لگتی ہیں سنی سی پہلے
کیا ہوا رنگ جو تھا ان میں فسوں کا کوئی

دلِ خوش فہم تیرے ہاتھ سے بازی نکلی
اب یہ موقعہ تیری 'ہاں' کا ہے نہ 'ہوں' کا کوئی

میرے ہی لب سے یہ الفاظ ادا ہونے تھے
مجھ سے ہی رشتہ تھا آشفۃ سروں کا کوئی

رہا نہ تجھ پہ سرِ مُو بھی اعتبار ہوا
کیا جو پیراہنِ شہر تار تار ہوا

کوئی چراغِ جلائے اسی کی تاک میں ہے
ابھی سکون سے کرتی ہے انتظار ہوا

ہم ایسے سادہ دلوں کے لئے کہاں ٹھہرے
یہ دُنیا داروں کی ہمدرد و یارِ غار ہوا

کھلی زمین کے کچے گھروں پہ کیا موقوف
اُکھاڑ لے گئی جنگل سے دیودار ہوا

ابھی ذہن میں تمہارا خیال آیا ہی
لپٹ گئی ہے میرے ساتھ خوشبودار ہوا

میری دشمن ہے ہمیشہ سے یہ جھول ہوا
گھر سے نکلوں تو اڑاتی ہے بہت دھول ہوا

اس طرف آئے ہوئے ایک زمانہ گذرا
کیا میرے شہر کو بالکل ہی گئی بھول ہوا

گھر ہو جنگل میں کوئی پاس پڑوسی بھی نہ ہو
ملنے آئے کبھی تتلی تو کبھی بھول ، ہوا

شہر دل میں تیرے ہمراہ چلے مثلِ کنیر
بڑی آہستہ قدم ، اور بڑی معقول ہوا

کچھ تو آسودگی دل کا بھی واجب ہے خراج
چھت مکانوں کی اٹھا لیتی ہے محمول ہوا

میرا دشمن تو کوئی فاتحِ افلاک نہ تھا
میں جو ہارا ہوں تو بس یہ کہ میں چالاک نہ تھا

ڈوبنے والے تو مشاق تھے تیرا کی میں
وہ جو پار اُترا ہے دریا کے وہ تیراک نہ تھا

اس لئے مجھ سے زمانے کو تھی بے حد رنجش
میں ہی یاروں میں کوئی صاحبِ ادراک نہ تھا

غم سے ٹوٹا تھا مگر کس کو نظر آنا تھا
دل میرا دل تھا تیرا دیدہ نمناک نہ تھا

صاحبِ خانہ کو مشکل تھی کہ کیا کیا پہنوں
در پہ سائل تھا کہ منت کش پوشاک نہ تھا

ہوا تھی تیز لیکن زور کم تھا
شجر پہ خوف اس کا اور کم تھا

تیری جانب سفر میں کر رہا تھا
مگر عزم سفر منہ زور کم تھا

یہ جنگل وجد میں کیوں آ گیا ہے
اکیلا رقص میں کیا مور کم تھا

تمہارے شہر میں چرچا وہی ہے
مگر اس مرتبہ کچھ شور کم تھا

میں کیوں لٹنے پہ آمادہ ہوا ہوں
تیری نیت میں شامل چور کم تھا

گلاب پھول ہے اور ایک استعارہ بھی
یہی سراغ ہے خوشبو کا بھی، تمہارا بھی

یہ کون کشتی دل پر سوار آتا ہے
کہ فرشِ راہ ہے دریا بھی اور کنارہ بھی

تمہارے آنے سے خوشبو بچائیں کھلتی تھی
کبھی تو کھولو درِ گفتگو دوبارہ بھی

اُسی نے خواب دکھایا تھا میری آنکھوں کو
کیا اُسی نے وہی خواب پارہ پارہ بھی

کچھ ابتلا میں تمہیں اہل فلسطین نہیں
تمہارے حال سا ہے ہو بہو ہمارا بھی

وہ میرا دوست ہے اور دشمنوں کی صف میں ہے
وہ رزم گہہ میں ہے سو دل میرا ہدف میں ہے

خلوص ہر کسی انسان میں نہیں ہوتا
یہ وہ گہر ہے جو ملتا کسی صدف میں ہے

جہاں سے آج بھی ہے احتمالِ شر موجود
سپاہِ دل میرا خوش فہم اُس طرف میں ہے

نُخن سے پُھول کھلانا بھی کوئی ممکن ہے؟
مگر یہ معجزہ اُس شخص کے شغف میں ہے

میں تشنہ لب ہوں اور صحرائے بیکراں میں ہوں
بس ایک قطرہٴ امکاں صدائے دف میں ہے

محل میں عیش و طرب ہے تو سازشیں بھی ہیں
یہ دل ہے، اس میں وساوس بھی خواہشیں بھی ہیں

ہمارے نام کی میزان تو برابر ہے
اگر سزائیں ہیں اس میں، نوازشیں بھی ہیں

عجیب شہر ہے دل جنگلوں سے لگتا ہوا
کہیں پہ دھوپ، کہیں ہلکی بارشیں بھی ہیں

یہ کیسا رشتہ ہے؟ میرے لہو میں اُس کے لئے
عداوتیں بھی کئی ہیں، شفا رشیں بھی ہیں

میرا یہ فیصلہ ہے اُس کے پاس لوٹوں گا
پھر اُس کے خط میں کچھ ایسی گزارشیں بھی ہیں

ہجومِ یاس میں جو دوستوں کو دیکھا ہے
کہ جیسے تیرگی میں جگنوؤں کو دیکھا ہے

ہمارے عہد کے بچوں سے خوف جاتا رہا
انہوں نے سامنے سے المیوں کو دیکھا ہے

نہ جانے آج کیوں یہ دل بہت اچھلتا ہے
کہ جیسے پہلی دفعہ بادلوں کو دیکھا ہے

ہمیں تو جب بھی کوئی مرحلہ رہا درپیش
نظر بچاتے ہوئے محسنوں کو دیکھا ہے

تجھے خبر تو ہوگی رُوح کیسے کھلتی ہے
اگر تو بارشوں میں جنگلوں کو دیکھا ہے

محل میں عیش و طرب ہے تو سازشیں بھی ہیں
یہ دل ہے، اس میں وساوس بھی خواہشیں بھی ہیں

ہمارے نام کی میزان تو برابر ہے
اگر سزائیں ہیں اس میں، نوازشیں بھی ہیں

عجیب شہر ہے دل جنگلوں سے لگتا ہوا
کہیں پہ دھوپ، کہیں ہلکی بارشیں بھی ہیں

یہ کیسا رشتہ ہے؟ میرے لہو میں اُس کے لئے
عداوتیں بھی کئی ہیں، شفا رشیں بھی ہیں

میرا یہ فیصلہ ہے اُس کے پاس لوٹوں گا
پھر اُس کے خط میں کچھ ایسی گذارشیں بھی ہیں

ہجومِ یاس میں جو دوستوں کو دیکھا ہے
کہ جیسے تیرگی میں جگنوؤں کو دیکھا ہے

ہمارے عہد کے بچوں سے خوف جاتا رہا
انہوں نے سامنے سے المیوں کو دیکھا ہے

نہ جانے آج کیوں یہ دل بہت اچھلتا ہے
کہ جیسے پہلی دفعہ بادلوں کو دیکھا ہے

ہمیں تو جب بھی کوئی مرحلہ رہا درپیش
نظر بچاتے ہوئے محسنوں کو دیکھا ہے

تجھے خبر تو ہوگی رُوح کیسے کھلتی ہے
اگر تو بارشوں میں جنگلوں کو دیکھا ہے

چمن کی زینتیں اُس کو سلام کرتی ہیں
تو خوشبوئیں بھی اُسی سے کلام کرتی ہیں

اُسی پتے پہ بہاریں پیام بھیجتی ہیں
اور تتلیاں اُسی در پر قیام کرتی ہیں

وہ شاہزادہ دل اور سارے میٹھے سخن
یہ مہ وِشانِ شہر اُس کے نام کرتی ہیں

غردِ حُسن ہے اُس سے تو ماہ پارائیں
دُعائیں اُس کے لئے صُبح و شام کرتی ہیں

ہے مہ زخوں کی دُعا اُن کے خواب میں آئے
سو اُن کی چاہتیں یہ اہتمام کرتی ہیں

گلابِ جسم سے، خوشبو تمام لب سے ہے
وہ شخص جیسے گلوں کے حسبِ نسب سے ہے

دیارِ خواب کے ہم شبِ گزیدہ لوگوں کے
دلوں میں خوفِ بہت ابتدائے شب سے ہے

ترے لئے ہیں شگفتہ چمنِ مراسم کے
کسی سے رنج اگر ہے ترے سبب سے ہے

کہاں بھٹک گئی ہے کونپلوں کی رُت تو بھی
نہالِ دل کو ترا انتظار کب سے ہے

شکایتیں بھی اُسی سے زیادہ ہیں میری
قریب تر جو میرے دوستوں میں سب سے ہے

سوارِ آب کے زیرِ نظر کنارہ ہے
سفیرِ دشت کی آنکھوں میں خواب پارہ ہے

کبھی کبھی اُنقِ دل پہ جو چمکتا ہے
تیرے خیال کے جگنو کا اک شرارہ ہے

وہ شخص پھول سا خوش رنگ بھی، ملائم بھی
کہ جس کے ہوتے سکوں دل کا پارہ پارہ ہے

کہوں تو بات یگانے کا احتمال بھی ہے
میں چپ رہوں تو مرا اُس میں بھی خسارہ ہے

ہزار خواب اور اتنی ہی زخمِ تعبیریں
حسابِ زیست کا یہ میرا گوشوارہ ہے

دیکھا جو کچھ اُس سے زیادہ اور بھی ہے
آنکھوں سے منظر کا وعدہ اور بھی ہے

میرے زخم نہ دھو، تھوڑا صبر کرو
مرا بدن ایذا آمادہ اور بھی ہے

عشق میں لٹنے پٹنے کا غم کچھ بھی نہیں
اس رستے میں دل کا ارادہ اور بھی ہے

صورت سے معصوم تو تھا ہی لیکن وہ
بات کا سچا 'دل کا سادہ اور بھی ہے

اپنا عزم سمیٹو میرے ہمسفر
رستہ پہلے سے اُفتادہ اور بھی ہے

جنگل، بارش، بھینی خوشبو، گھاس ہری
ایسا منظر اور آنکھوں کی پیاس ہری

دل کے رشتے ٹوٹنے سے کب بھولتے ہیں
ان پھولوں میں رہتی ہے یو باس ہری

ریگستان سے لوٹنے والا جانتا ہے
رت آتی ہے کیوں آنکھوں کو راس ہری

ہریالی اور تیرے لمس کا ذکر ہی کیا
دھوپ بھی آئے ہو کر تیرے پاس ہری

آٹھ برس کا گھر سے نکلا کیا سمجھے؟
دروازے پر بوڑھی ماں کی آس ہری

میں نے دستک دی، دروازہ بند رہا
پھر بھی عشق مرا شیرازہ بند رہا

باقی سارے لوگ توکل کر گزرے
میں ہی ایک جگہ اندازہ بند رہا

میری آنکھوں پر بھی گردِ ہوس رہی
اور تمہارا نقص بھی غازہ بند رہا

برسوں میرا یک طرفہ اظہارِ شوق
یعنی گنبد میں آوازہ بند رہا

کہتے کہتے بات ادھوری رہنے دی
کھلتے کھلتے غنچہ تازہ بند رہا

یہ حدِ محبت ہے تو اعجازِ وفا بھی
جو اُس نے کہا ہی نہیں وہ میں نے سنا بھی

خوابوں نے تو پہلے ہی سے کھولی تھی طنائیں
اس شہر میں سہمی ہوئی آتی ہے ہوا بھی

اک روتھی مسرت کی تہہِ قلب بھی جاری
اور دل کہ ملاقات پہ تھا مجھ سے خفا بھی

پھولوں نے بھی خوشبوئیں چھپالی ہیں تہوں میں
اب خال ہی آتی ہے پرندوں کی صدا بھی

اُوزون کے پردے میں یہ جو چھید ہوا ہے
ممکن ہے اُتر آئے گی تاثیرِ دُعا بھی

نکاس آبِ تکلم محال اُس نے کیا
میں لاجواب تھا، ایسا سوال اُس نے کیا

جو بات کی وہی دل توڑ دینے والی کی
میں چپ رہا ہوں تو اس کا ملال اُس نے کیا

تمام لذتوں کو تلخیوں میں گھول دیا
کہ ایک سا میرا ہجر و وصال اُس نے کیا

یہ کوئی ایک یا دو، چار دن کی بات نہیں
کہ انتظار بہت ماہ و سال اُس نے کیا

تیرا خیال بڑا خوشنما پرندہ تھا
مگر اٹھان میں ہی انتقال اُس نے کیا

وفا کا دور ہے جب سے زوال آمادہ
یہ دل ہوا ہے زیادہ وصال آمادہ

عجیب رُت میں گلوں پر بہار آئی ہے
پرندِ شوق کہ ہے انتقال آمادہ

بڑی لطیف تھی وہ بات جس کے سننے سے
لہو بدن میں ہوا ہے اُبال آمادہ

کوئی خُج، کوئی کوشش بھی کارگر نہ ہوئی
مزاجِ یار بہت ہے ملال آمادہ

گذر نہ جائیں، انہیں روک لو کہ اب بھی ہیں
رفاقوں کے لئے ماہ و سال آمادہ

لہو لہو تھے مناظر گھروں سے آگے بھی
لٹا چکے تھے بہت کچھ سروں سے آگے بھی

کہانی کار ! میرے شہر کے حوالے سے
نظر اٹھاتے شفق منظروں سے آگے بھی

ہوا کا رخ بھی مخالف، گھنیرے بادل بھی
پرندے ! سوچ لے اپنے پروں سے آگے بھی

تمام رنج تجھی سے، مسرتیں بھی تری
گیا نہیں میں تیرے محوروں سے آگے بھی

جہاں کی حد کوئی یہ بحر ریگ و خار نہیں
گلاب کھلتے ہیں ان بنجروں سے آگے بھی

وہ خواب رکھتا ہے، آنکھیں نکال دیتا ہے
اور اس ستم پہ بھی چپ کا سوال دیتا ہے

اس اشتیاق میں ساحل پہ آ کے بیٹھا ہوں
کہ دیکھیں آج کیا دریا اُچھال دیتا ہے

نہ آؤ اس کے کہے میں کہ عشق سوداگر
زیر سکوں کے عوض میں وہاں دیتا ہے

وہ برگ گل کی طرح خار و خس سے خوشبوئیں
نچوڑ کر مجھے حیرت میں ڈال دیتا ہے

ابھی بھی گاؤں کے چوپال میں بزرگ کوئی
وفا کے باب میں میری مثال دیتا ہے

حسین لہجہ مگر اشتعال لفظوں میں
گنوا دی بات سب بے اعتدال لفظوں میں

نخن ہے سادہ مگر صاف دیکھ لیتا ہوں
چھپا ہوا ہے جو رنگِ ملال لفظوں میں

زمانہ معترف ہے اُس کے حُسن کا لیکن
میں جانتا ہوں اُسے بے مثال لفظوں میں

یہ دل نہ مانے مگر اعتبار کرتا ہوں
میٹر اُس کو ہے ایسا کمال لفظوں میں

مجھے خبر ہے زباں ساتھ دے نہ پائے گی
سو لکھ کے رکھ دیا ہے عرضِ حال لفظوں میں

احتیاط لازم ہے، پیش و پس نہ ہو جائے
اُس کی پھر میرے دل پر دسترس نہ ہو جائے

دوستی کا کمپیوٹر، اطمینان سے بھائی
اس کے سافٹ ویئر کو وائرس نہ ہو جائے

بانجھ ہو گئے بادل، ندیاں بھی سُکھی ہیں
یہ ہری بھری وادیِ خار و خس نہ ہو جائے

کوئی کہہ نہیں سکتا اُس کے من میں کیا آئے
جو نہیں ہوا برسوں اس برس نہ ہو جائے

زلزلوں کی زد پہ ہے اور زمیں بھی کچی ہے
معبود مراسم کا خمِ کلکس نہ ہو جائے

گلاب چہرے پہ رنگِ ملال روشن ہے
طلوعِ ماہ کے باہم زوال روشن ہے

شبِ سیاہ میں جگنو سا جھلملاتا ہے
جو دل میں ایک ستارہ خیال روشن ہے

ہنسا تو ہے وہ مگر اس ہنسی کے بارے میں
لبِ دماغ چراغِ سوال روشن ہے

بُجز زیاں نہیں کچھ بھی کسی سے کہنے میں
مرے خُدا پہ میرا سارا حال روشن ہے

بُھلا دیا ہے مگر خوابِ بن کے لوٹے گا
کہ اُس کے کرتبوں کا احتمال روشن ہے

ہدف وہ تھا مگر زیرِ عتاب میں ہی تھا
کُناہ اُس نے کیا، آبِ آب میں ہی تھا

بقائے امن کو اک جان کی ضرورت تھی
سو، دوستوں کی نظر میں جواب میں ہی تھا

مجھے ہی کشتیِ دل پر بڑا بھروسہ تھا
سرِ کنارِ یقین زیرِ آب میں ہی تھا

بجھی تھی آگ تو اکھڑی ہوئی طنائیں تھیں
پتہ چلا کہ گرفتارِ خواب میں ہی تھا

سفر میں اور بھی ہمراہ تھے میرے لیکن
کہ مَبتلائے کششِ سراب میں ہی تھا

دستک نہیں کسی کی، یہ جھونکا ہوا کا ہے
زنجیرِ در کے ساتھ پھر دھوکا ہوا کا ہے

خوشبو ترے بدن کی میرے دل کی خواہشیں
اس وصلِ ناتمام میں کیا کیا ہوا کا ہے

دلہیز کا چراغ بُجھانے کے کھیل میں
تیرا بھی ہاتھ ہے کہ یہ تنہا ہوا کا ہے؟

اب اس طویل جس کا کچھ دن کا ساتھ ہے
اس شہر سے گزرنے کا وعدہ ہوا کا ہے

تیری طرف جو یاد کی کھڑکی گھلی رہی
اس میں قصور مجھ سے زیادہ ہوا کا ہے

ہوتا نہیں ہوائے بلا کا نزول کم
اس گل زمیں پہ کھلتے نہیں پھر بھی پھول کم

یہ لوگ اپنے بیٹوں کو قبروں میں ڈال کر
ہوتے ہیں حادثات سے اب دل ملول کم

سیرابی زمین وطن کا خیال ہے
اپنے لہو کا پیش نظر ہے حصول کم

آنے لگے ہیں صاف نظر رہ گزیر کے موڑ
ہوتی گئی لہو کی مہواروں سے دھول کم

ایسے سفر میں اپنے عزائم سے کہہ رکھو
آئے گا کوئی لمحہ رد و قبول کم

وہی خلا کی حکایت، سراب کے قصے
مری حیات کے قصے ہیں خواب کے قصے

کبھی کسی نے کیا خوشبو کا رنگ دیکھا ہے
کہے سُنے ہیں یہ سارے کتاب کے قصے

ہوا گزر گئی بارش کے درمیاں ایسے
اڑا کے لے گئے جنگلی گلاب کے قصے

مری کتاب کسی نے پڑھی نہیں لیکن
زبانِ عام پہ ہیں انتساب کے قصے

کبھی تو ذکرِ لب و چشم بھی کرو کوئی
یہ کیا سناتے ہو خالی عذاب کے قصے

اُتر گئے دریا میں پھر گہرائی کا اندازہ کیا
جس سے باہر جانا ہے تو کھڑکی کیا ، دروازہ کیا

کس دشمن لشکر کی نازک خوابوں پر یلغار ہوئی
پکھر گیا ہے اتنی جلدی بستی کا شیرازہ کیا

مدت سے جو بند پڑے تھے سارے درتے کھول دیئے
اب کمرے میں در آئیں گی دیکھو ہوا میں تازہ کیا

لبی تان کے سونے والو ! تم کو جگانے کی خاطر
صورِ اسرافیل کی مانند آئے گا آوازہ کیا

یہ تو ہے کہ مثال بھی کوئی اپنے پیچھے رہ جائے
ورنہ سفرِ عشق میں کوئی غلطی کیا ، خمیازہ کیا

آنکھوں میں وصلِ رُت کا سفر دیر تک رہا
آبِ رواں پہ عکسِ شجر دیر تک رہا

آیا، گیا وہ مثلِ شرر تھوڑی دیر میں
لیکن جہاں میں اُس کا ہنر دیر تک رہا

کچھ قرب ہم سفر کا نشہ بھی شریک تھا
اور کچھ طلسمِ راہ گزر دیر تک رہا

آنکھیں بچھائے روزِ دیوار کے سوا
دستک کے انتظار میں در دیر تک رہا

اُس کے سخن نے پھول کھلائے ہزار رنگ
خُشبو کا جان و دل پہ اثر دیر تک رہا

تھکن سفر کی ابھی سرحد بدن میں ہے
کئی دنوں سے کوئی اجنبی وطن میں ہے

قرین جاں کھلے بین جیسے یاسمین و گلاب
یہ کس کمال کی خوشبو گل سخن میں ہے

نہا رہی ہے دھنک بھیگتے درختوں میں
خیال یار کوئی مور ہے کہ بن میں ہے

لہو میں رنگ اترنے لگا ہے موسم کا
ہوا وائر کا اک رقص جان و تن میں ہے

ذرا سی بات پہ کیا دل کو آبدیدہ کریں
یہ بے وفائی تو اس شہر کے چلن میں ہے

ہوا پہ لکھتا ہوا ہے دائم نوازشیں ہیں
سمندروں کے سفر میں سبزے کی خواہشیں ہیں

اُجاڑ کر جو یہاں کے آنگن چلا گیا ہے
نئی نئی بستیوں میں اُس کی رہائشیں ہیں

اُسے میں شاید ہلاک کر کے بھلا بھی دیتا
مگر مرے ہی لہو میں اُس کی سفارشیں ہیں

ہرے بھرے موسموں کی کس نے بشارتیں دیں
کہ چشم دیوار و در میں سمٹی سگزارشیں ہیں

میں اپنے اندر شریر لڑکا لئے چلا ہوں
مرے قریب و جوار میں کیا نمائشیں ہیں

کہہ دے، ورنہ لب پر بول اٹک جائیں گے
بھاری برف میں گھر آنگن سب ڈھک جائیں گے

ہم ہی پتھر مارنے کا فن بھول نہ جائیں
کوئی رُت میں شاخوں پر پھل پک جائیں گے

ہجرت کا اک چکر اپنے پاؤں میں ہے
جانے کس صحرا میں آکر تھک جائیں گے

آنکھوں پر جب یاد کا موسم چھا جائے گا
دل آنگن میں سرسوں بھول مہک جائیں گے

جانے والا آگے تنہا سفر کرے گا
یہ احباب تو ساتھ لحد ہی تک جائیں گے

حریفِ موج ہوا رکھ کے جستجو کے چراغ
 بجھا دیئے ہیں بہت ہم نے آرزو کے چراغ

یہ راستے کہ نہیں یونہی اس طرح روشن
 کسی نے ان میں جلا رکھے ہیں لہو کے چراغ

صبا و گل سے ہی موسم کوئی حسین نہیں
 ترے خن سے بھی روشن ہیں رنگ و بو کے چراغ

مرے وطن میں سپاہِ جنوں کے ہاتھوں نے
 گلی گلی میں فردزاں کئے ہیں ہو کے چراغ

ملے بھی اُس سے مگر کس طرح کے موسم میں
 دُھواں دُھواں ہیں رہ و رسمِ گفتگو کے چراغ

ہوائے زرد تھی، موسم بڑا بے اعتباری تھا
اب ان حالات میں آنا مگر بے اختیاری تھا

فصیلِ شہر پر لہرا رہا تھا امن کا پرچم
دروں شہر لیکن راستوں سے خون جاری تھا

نگاہوں نے لیا پیغام کی ترسیل کا ذمہ
لبوں پر احتیاطاً جب سکوتِ مرگ جاری تھا

کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ کیا مقتول پہ گندری
سبھی کہتے رہے قاتل کا فعلِ اضطرابی تھا

نگاہِ دل سے ہی اُس شخص کی پہچان ممکن تھی
تخاطبِ دوستانہ تھا، تکلمِ کاروباری تھا

بُریدہ جسموں کے یہ اشتہارِ کن کے ہیں
کہاں کی میتیں، یہ سوگوارِ کن کے ہیں

کسی کا سر گیا ہے اور کسی کی عزت بھی
زمینِ گل تیرے دل میں مزارِ کن کے ہیں

ہتھیلیوں پہ سروں کو لئے گزرتے ہیں
حسبِ نسب سے طلبگارِ دارِ کن کے ہیں

بلا کی آندھیوں میں کون یہ شمار کرے
یہ پھولِ کن کے ہیں، یہ برگِ دبارِ کن کے ہیں

یہ کن کی آنکھیں درپچوں سے لگ کے روتی ہیں
یہ خوابِ غُنجے سرِ رہگذارِ کن کے ہیں

آنگن آنگن ، کُچہ کُچہ ایک سراب
اس بستی کا سارا نقشہ ایک سراب

تیری یادوں کی صورت ہے میرے پاس
میری آنکھیں ایک جزیرہ ، ایک سراب

آنے والے کل کے ساحل پر اکثر
میں نے ڈیرہ ڈالے دیکھا ایک سراب

آج بھی میں نے سورج ، چاند کی خواہش کی
آج بھی جھولی میں لے آیا ایک سراب

رات ہوا نے مجھ سے پوچھا تیرا نام
میں نے ریت کے ڈھیر پہ لکھا 'ایک سراب'

وہ فصلِ سر ہے جہاں تک نگاہ جاتی ہے
جو رہگذر ہے وہی قتل گاہ جاتی ہے

عذابِ جاں ہیں یہ سارے وصال خواہش کے
دلوں سے دُور مگر کب یہ چاہ جاتی ہے

زمین پہ موسمِ ظلم و ستم ہے وہ جس کے
دھوئیں میں دیدہ ہر مہر و ماہ جاتی ہے

یہ وہ جگہ ہے جہاں چشمِ خون روتی ہے
ہوا بھی آ کے یہاں، دل تباہ جاتی ہے

جلا کے کشتیاں اب اس پہ غور کیا کرنا
کہ واپسی کے لئے کون راہ جاتی ہے

اور سب پانی ہی پانی تھا، کناراً تُو تھا
یعنی مُنہ زور سمندر میں سہارا تُو تھا

پھر کسی رنگ کی بینائی میرے پاس نہ تھی
میری آنکھوں میں دھنک رنگ نظارا تُو تھا

ایسی ہلچل تھی کہ سب روند رہے تھے مجھکو
اس طلاطم میں جسے میں نے پُکارا تُو تھا

میرا صحرائے بدن دُھوپِ پجاری نکلا
ورنہ یہ طے ہے کہ بارش کا اشارہ تُو تھا

یوں تو اس سوچ سمندر پہ کئی عکس اُگے
میں نے جس چاند کو آنگن میں اُتارا تُو تھا

صرف لہجہ ہی جارحانہ ہے
میری نیت دوستانہ ہے

اک تصور کھلی کلی جیسا
میرے افکار کا بہانہ ہے

ہے بظاہر سکوت چہرے پر
ایک طوفاں درونِ خانہ ہے

تیری تحریر کے وہ دو ٹکٹے
جن میں پوشیدہ اک زمانہ ہے

ٹوٹ کر دشمنی بھائی ہے
اب محبت بھی والہانہ ہے

یہ کیا کہ موسموں کا چلن بھی مرے لئے
ماتھے پہ دوستی کے شکن بھی مرے لئے

تنہائیوں کی تند ہوائیں بھی مرے نام
بے خواب کروٹوں کی جلن بھی مرے لئے

میرے لئے ہے کرب نشیب و فراز کا
ہموار راستوں کی تھکن بھی مرے لئے

سرسبز ہو رہی ہیں اُجالوں کی خواہشیں
اُس پر یہ دوپہر کا گھن بھی مرے لئے

دن کے لئے لکھا ہے نگاہوں کو انتخاب
راتوں کو انتشارِ بدن بھی مرے لئے

دُھوپ میں کیسا زہر بھرا ہے
سورج کس بستی چمکا ہے

لنگڑا کُتّا سوچ رہا ہے
سارا گاؤں کدھر گیا ہے

تم لفظوں سے کھیل رہے ہو
میں نے شہر کا شہر لکھا ہے

دل کی بستی کیا بستی ہے
گھر آنگن سونا سونا ہے

تم کیا جانو اک دیوانہ
بارش میں یوں کیوں بیٹھا ہے

تتلیوں کا شمار کرتا ہے
جانے کب سے سڑک پہ لٹکا ہے

کتنے ہاتھوں گزر گیا ہوگا
میری نظروں میں جو رسالہ ہے

بند کمرے میں جھانک کر سورج
کھڑکیوں سے لپٹ کے ہنتا ہے

کیا مسافر نواز بستی ہے
اُس کے اندر جو شہر بستا ہے

شب پہاڑی سفر ہے میلوں کا
اک مددگار کا وسیلہ ہے

صبح کا سورج یہاں تنہائیاں پھیلانے گا
رات کی تاریکیوں میں ہی نگرِ مٹ جائے گا

پانیوں پر فوج کا پہرہ کڑا ہو جائے گا
ایک قطرے کے لئے ہر شخص کو ترسائے گا

گھر کی دیواریں سبھی اندر سے ہونگی مُنہدم
اور دروازے پہ تالا جھولتا رہ جائے گا

بے تحاشا رات کے اندھے سفر میں بھاگ جا
کچھ نہیں معلوم لے کر کیا سویرا آئے گا

خواہشوں کے بیکراں صحرا سے شاید آج پھر
دل کے دروازے تلک کوئی نہ کوئی آئے گا

کچھ دِن اور ٹھہرنا ہوگا
جینا مرنا ایک سا ہوگا

بستی بستی دُھول اُڑے گی
دیکھنے والا اندھا ہوگا

تم جس پر کھڑکی کھولو گے
وہ آواز کا دھوکا ہوگا

پہلی بارش کی چھینٹوں سے
اُس کا من ہریالا ہوگا

روشنی میرے گھر ٹھہرے گی
سُورج دیکھ کے جلتا ہوگا

میں بہت دُور گیا ہوں اب تک
تم سے لیکن نہ جُدا ہوں اب تک

یوں میرا نام نہ اُونچا کرنا
میں کئی بار گرا ہوں اب تک

میرے بارے میں کوئی رائے نہ دو
میں نہ خود سے بھی کھلا ہوں اب تک

تم سے اک بار ملا تھا شاید
تم سے سو بار ملا ہوں اب تک

اُس نے آواز نہیں دی مجھکو
اور میں بھی نہ گیا ہوں اب تک

زخم پھولوں سے کھلیں درد ہوا لے آئے
موسم گل تیری یادوں کو اڑا لے آئے

تیرگی راس میرے دل کو بہت آئی تھی
کون آیا کہ اندھیروں میں اُجالے آئے

کیا خبر ہے کہ کہاں وقت کی نظریں بدلیں
اپنے اشکوں کے خزانوں کو سنبھالے آئے

ایک دل اور زمانے کے ہزاروں پہرے
ہم ہی جانیں اسے کس طرح بچالے آئے

اپنے ماحول میں غیروں نے مجھے دفن کیا
بعد مدت کے میرے جاننے والے آئے

میرے پاؤں سے لپٹ کر مرا سایہ بھی تھا
سارے لشکر میں تو آسیب زدہ میں ہی تھا

میرے ہی شانوں پہ بندوق رکھی تھی سب نے
مجھ پہ ہی خوف حریفوں کا بڑا طاری تھا

اُس کو بھی مجھ سے بچھڑنے کا برابر غم ہے
میرا، اُسکا جو تعلق تھا وہ بس سطحی تھا

میں نے لکھا تھا در و بام پہ اپنا ہی نام
چھوٹی باتوں کو بھلا دینے کا میں عادی تھا

سارے منظر مری آنکھوں کو بھلے لگتے تھے
میں گئی رُت میں عجب طرز کا جذباتی تھا

وہ ایک راز جو کل تک دلوں کے اندر تھا
 عیاں ہوا تو ہر اک آدمی کے لب پر تھا

کوئی تو شخص تھا میرے قریب رہتا تھا
 کوئی خیال مرے راستوں کا رہبر تھا

عجیب لوگ تھے خوابوں کی بات کرتے تھے
 گزروں کے فاصلے پر دشمنوں کا لشکر تھا

تمام وقت نظر ہٹ گئی نہ ہونٹ پہلے
 بڑا عجیب ملاقات کا وہ منظر تھا

میں اپنے آپ سے بھاگا تو گم ہوا ایسے
 کوئی تو نام تھا پیہم مری زباں پر تھا

اب یہ لگتا ہے کہ وہ کچھ کچھ مرے ایسا ہی تھا
ہاں یونہی میری طرح وہ شخص بھی تنہا ہی تھا

تیری آوازوں کے سائے بھی بڑے ہمدرد تھے
اس طرح تنہائیوں کا سامنا پہلا ہی تھا

جس کے چہرے پر ہمیشہ پھول ہی کھلتے رہے
اُس کے سپنے میں مگر اک زخم بھی گہرا ہی تھا

مس کی خوشبو ہواؤں میں کہاں سے آگئی
میرے ہونٹوں پر کسی کا نام بس آیا ہی تھا

دُور تک پت جھڑ کا موسم دیکھ کر دل رو دیا
میں نے یادوں کے درپچوں کو ابھی کھولا ہی تھا

پھر وہ گم گشتہ مسافر کی ندا کیسی ہے
ریگزاروں میں یہ پانی کی صدا کیسی ہے

میری فصلوں پہ ذرا دیر نہ سورج چمکا
اجنبی شہر کی سی آب و ہوا کیسی ہے

دور تک کچھ بھی نہیں، سایہ نہیں، شکل نہیں
چچہاٹ سی منڈیروں پہ بتا کیسی ہے

میں اسی سوچ میں اب حرفِ دُعا بھول گیا
ہاتھ میں نے بھی اٹھائے ہیں دُعا کیسی ہے

وہ شناسا تھا کہ مانوس نہیں تھا مجھ سے
ناشناسائی میں خوشبوئے وفا کیسی ہے

تنہائیوں میں کیسے حسیں رنگ بھر گیا
اور پھر ہوا کے دوش پہ جانے کدھر گیا

دریا کے پانیوں پہ کوئی نقش چھوڑ دیں
اس شوق میں بھی ایک زمانہ گزر گیا

ایسا ہجوم شہر خیالات سے اٹھا
پل بھر میں ساری بستیاں ویران کر گیا

وہ فن شناس جس کی زمانے میں دھوم تھی
اچھا ہوا کہ وقت سے پہلے ہی مر گیا

تیرے غموں نے دل میں وہ رستہ بنا لیا
ساحل کو کاٹ کاٹ کر دریا ٹھہر گیا

رات کو بارش سے بھیگا ہوں
ٹوٹی چھت کے گھر جینا ہوں

تنہا پیڑ ہوں چوراہے کا
بچوں کی زد میں آیا ہوں

خود اپنا ہمسایہ بن کر
میں اپنے اندر رہتا ہوں

میں بھی پھل دینے والا تھا
اب کی آندھی سے اکھڑا ہوں

کچی پگڈنڈی سے ہو کر
یہ کس بستی میں آیا ہوں

تُو مرا خوف، تیری ذات کا ڈر ہوں میں بھی
ترے آنگن میں کھڑا ایک شجر ہوں میں بھی

بارہا آنکھ نے منزل کے نشان دیکھ لئے
بارہا سوچ کے مصروف سفر ہوں میں بھی

سب سے پہلے تو مجھے تُو نے ہی محسوس کیا
ترے ہی خواب جزیرے کا بشر ہوں میں بھی

تُو وہی دُھوپ جو کمرے میں پہنچ ہی نہ سکی
تری خاطر جو منع ہے وہ ثمر ہوں میں بھی

جس طرف جانے میں آسیب کا ڈر رہتا ہے
ایک سونی سی حویلی کا وہ در ہوں میں بھی

پھر کسی معجزہ شب پہ یقین سا کیوں ہے
ایک آوارہ منزل کا بھروسہ کیوں ہے

میں ہوں آواز تجھے قید نہ کر خوابوں میں
تُو ہوا ہے تو میرے در پہ ٹھہرتا کیوں ہے

میرا قاتل ہے کہ ہے میرا مسیحا کہدے
یوں میرے پاس کئی روپ بدلتا کیوں ہے

دل وہ بنجر کہ کوئی چاہ نہیں اُگتی ہے
ایسی ویران زمینوں سے گذرتا کیوں ہے

رات بھر رہتا ہے پھر ضبط کی لہروں میں تناؤ
میری تنہائی کے ساحل پہ اُترتا کیوں ہے

تمام روح کے رشتے بھلائے بیٹھا ہوں
میں اپنی ذات کے پتھر کے نیچے آیا ہوں

وہ میرا جسم سمیٹے گا کس طرح آخر
میں زرد رُت کی طرح برگ برگ بکھرا ہوں

غموں کی بارشوں میں دل بہت اُچاٹ ہوا
اب اپنا چہرہ پروں میں چھپائے رہتا ہوں

میرے مزاج کو راہوں کے موڑ بھاتے ہیں
میں سیدھے راستوں پر جانے کیوں بھٹکتا ہوں

تمام رات ستاروں سے گفتگو کی ہے
بڑے حسین خیالوں میں دن کو سویا ہوں

طوفان کے بعد زور ہواؤں میں کم ہوا
تیری وفا کا دور بڑا موسمی رہا

ایسا ہوا کہ راستے سر سبز ہو گئے
اک پیڑ برگ برگ کھڑا سُکھتا گیا

تنہائیوں کے بعد ملاقات کیا ہوئی
پھر وہ سکوتِ آب میں ہلچل مچا گیا

حالانکہ خد و خال تراشے بہت صحیح
لیکن میں اپنے آپ کو چہرہ نہ دے سکا

اپنے کئے پہ دل بھی پشیمان ہے مگر
سیلاب تھا کہ مجھ کو بہا کر اتر گیا

بڑی پیاس تھی سب بُجھا کر اڑا
وہاں ایک جوڑا پرندوں کا تھا

درختوں پہ رس دار پھل لگ گئے
بتدریج موسم سُہانا ہوا

کوئی لطف اُس سمت جانے میں ہے
نہیں تو یہ لوگوں کو کیا ہو گیا

ہواؤں کے جھونکے گذر بھی گئے
میں فٹ پاتھ پر دیکھتا ہی رہا

کوئی لفظ کہنے کی فرصت نہ تھی
زبانوں کے ذمے بڑا کام تھا

صدائیں آتی ہیں چہرہ نظر نہیں آتا
وہ شخص خوبیوں والا نظر نہیں آتا

یہ زلزلہ بھی تباہی مچا گیا کیسی
مکان کھڑا تو ہے کمرہ نظر نہیں آتا

میں جی رہا ہوں ابھی رات کے مناظر میں
مگر وہ شخص بھلا سا نظر نہیں آتا

وہی سماں ہے، وہی پیڑ ہے، وہی موسم
گئے برس کا پرندہ نظر نہیں آتا

کسے پُکارے اب دشتِ نا اُمیدی میں
یہاں تو دُور تک سایہ نظر نہیں آتا

ہر ملاقات میں پہلے سے جدا لگتا ہے
یہ ترے جسم پہ موسم کا اثر سا کیا ہے

جھنڈ کے جھنڈ اُداسی کے پرندے اُترے
دل کسی ٹھہری ہوئی جھیل کا منظر سا ہے

تیرے گاؤں میں اُسی یاد کی پگڈنڈی پر
اب بھی آہٹ سے کوئی شخص ٹھٹھک جاتا ہے

وہ جو بچھڑا ہے تو اک لفظ نہ بھیجا لکھ کر
پچھلے موسم میں مجھے اُس نے بہت چاہا ہے

اب مرے ذہن میں اُس گھر کی بھی تصویر نہیں
ایک سایہ ہے کہ کھڑکی سے لگا رہتا ہے

صحرائے زندگی میں کوئی نقشِ پا نہ تھا
میرے ہوا مجھے کوئی پہچانتا نہ تھا

شب کی فِصیل سامنے پھیلی ہوئی تو تھی
سورجِ تقصّرات کا اُترا ہوانہ تھا

میں بے ضمیر رہ کے بڑا معتبر ہا
میں نے پیسروں کا اثر ہی لیا نہ تھا

خوشبو تھی یا ہوا تھی مرے دل کے آس پاس
کیا تھا کہ جس کا نام بھی سوچا گیا نہ تھا

اَب اُس کے میرے درمیاں کوئی گلہ نہیں
ہم نے مخالفت کی حدوں کو پُھوا نہ تھا

تمام شب دستکوں پہ دستک وہ دے رہا تھا
میں گھر کا دروازہ بند کرتے ہی سو گیا تھا

سمندروں کی تہوں میں موتی چھپتے ہوئے تھے
مگر میں ساحل کی سمت آتے تھکا ہوا تھا

تمام منظر ذہن سے میرے اُتر گئے تھے
یہ گھر کرائے کا اب کے خالی سا لگ رہا تھا

سُنائی دیتی تھیں مضطرب سی صدائیں شب بھر
کوئی پرندہ کہ راستے میں بھٹک گیا تھا

وہ بھی ابھی اپنے ہی کسی کی تلاش میں تھا
مجھے ہی اب کے کسی کا خود پرگماں ہوا تھا

یہ کربِ ذات کے رکن راستوں پہ نکلا ہوں
کئی دنوں سے میں خود سے خفا خفا سا ہوں

مرے حروف کے معنی نہ کھل سکے اُن پر
میں لفظ لفظ تمنا لئے بھگتا ہوں

شعاعِ وصل سے اب مجھ کو کچھ تمازت دے
اُداسیوں کے تختیاں سے ہو کے آیا ہوں

اُجڑ گیا ہے وہ سارا نگر خیالوں کا
گئے برس جہاں چھاؤں گزار آیا ہوں

اس اشتراک میں کیا خاک پائیداری ہے
چراغ میں نے جلائے ہوا تمہاری ہے

مرا شہر میرے بچپن سے کچھ نہیں بدلا
وہ نہر خون جو پہلے تھی، اب بھی جاری ہے

قسم سے دل سا منافق کوئی نہیں دیکھا
جو خوش بہت ہے مگر ماننے سے عاری ہے

یہ طے ہے ہم کہ اک عفریت کے نوالے ہیں
یہ دیکھنا ہے کہ فی الوقت کس کی باری ہے

میں تجھ سے خفا ہوں کوئی ایسا بھی نہیں تھا
حالانکہ یہ لہجہ تیرا لہجہ بھی نہیں تھا

گھلنے لگے جو دل کے درپے تو یہ جانا
اس شخص سا پہلے کوئی دیکھا بھی نہیں تھا

یہ بھی کہ تصور کے کئی باب وا ہوئے
یہ بھی کہ تیرا کوئی بھروسہ بھی نہیں تھا

پیچھے کوئی باقی نہ رہا نقش قدم کا
پھر آگے کہیں جانے کا رستہ بھی نہیں تھا

چراغِ راہ تیری چاہ کو بنا کر کے
مجھے تلاش کروں دل کو رہنما کر کے

مجھے قبول ہے ہر فیصلہ مگر ڈر ہے
وہ اپنی بات سے ہٹتا ہے فیصلہ کر کے

میں جانتا ہوں کہ یہ کام سخت مشکل ہے
تو دیکھتا ہوں چلو اس کی ابتدا کر کے

وہ اور میرے لئے معرکے میں کود پڑے؟
یہ معجزہ بھی ہوا ہے خدا خدا کر کے

دل وہ پاگل ہے میری بات کہاں مانتا ہے
ہاں جہاں تیرا حوالہ ہو وہاں مانتا ہے

ایک بس آپ ہی شک میں ہیں گرفتار ابھی
ورنہ جو بات میں کہتا ہوں جہاں مانتا ہے

جسم تو عمر کے حملے سے ہے پسپائی میں
ایک دل ہے کہ ابھی خود کو جواں مانتا ہے

اعتبار ہم میں جو باہم ہے مثال ایسی ہے
میں اگر آگ کہوں گا تو دھواں مانتا ہے

کبھی جو اُس نے مجھے اپنے دھیان میں رکھا
زمیں کی چیز کو آسمان میں رکھا

وہ چاہتا تو مجھے سرفراز کر دیتا
میرے خدا نے مجھے امتحان میں رکھا

بحث میں جب اُسے کچھ راستہ نہیں سوجھا
پُرانی باتوں کو پھر درمیان میں رکھا

تمہاری یاد کو دل میں بٹھا کے ایسا ہے
دیا جلایا اور خس کے مکان میں رکھا

غموں کا جادہ دل پر سفر محال کروں
پھر اُس کے بعد میں جاناں تیرا خیال کروں

کبھی تو دوسرے کو بولنے کا موقعہ دو
میرا بھی چاہتا ہے دل کوئی سوال کروں

تمہارے طرز تکلم سے آشنا ہوں میں
سو کتنی بار تیری بات کا ملال کروں

بس ایک باریہ طے ہو کہ میرے ساتھ ہو تم
بہار رُت کو میں آمادہ وصال کروں

لگا رہتا ہے کھٹکا رات کا آرام سے پہلے
پرندے لوٹتے ہیں گھونسلوں میں شام سے پہلے

خُدا جانے کہ یہ کچھ جانتے بھی ہیں یا پھر یو نہی
تمہارا نام بھی لیتے ہیں میرے نام سے پہلے

جہاں ہم تم ملے تھے اب وہ پیپل ایک تیرتھ ہے
وہاں اب لڑکیاں جاتی ہیں گھر کے کام سے پہلے

مجھے اے مُنصفو تم سے شکایت بھی نہیں کوئی
گلہ یہ ہے سزا دی ہے کسی الزام سے پہلے

ہاتھ اس کے ہو لگا جیسے دھینے کوئی
بات کرتا ہے تو جھڑتا ہے گنہ کوئی

ہم سے حالات نے اس طرح نبھایا رشتہ
مختلف دیکھا نہ دن ، سال ، مہینہ کوئی

پوں تو دیکھی ہیں شریفوں میں بھی کتنی چیزیں
مجھ سا اچھا نہیں دیکھا ہے کمینہ کوئی

حسن کے ساتھ ضروری نہیں دانش بھی ہو
ایسی ہوتی ہے حسینوں میں حسینہ کوئی

یوں نہ تھا جو رو جفا تیری طرف سے پہلے
 کتنا معصوم تھا تو ایسے شغف سے پہلے

تیرا ہر تیر میرا راستہ پہچانتا ہے
 محوِ زیست تھا میں تیرا ہدف سے پہلے

ٹنچھ سے جب ربط نہ تھا کوئی تو دل تھا جیسے
 قطرہ آب، گھر قیدِ صدف سے پہلے

اب ہمیں نیند میں ہوتے ہوئے صدیاں بیتیں
 ہم کہ جو سوئے ہیں اصحابِ کہف سے پہلے

تمہارے غم سے اب میری شناسائی نہیں جاتی
سفر کیسا بھی ہو یہ آبلہ پائی نہیں جاتی

قبیلے میں کسی نے کی تھی بیعت دستِ قاتل پر
ہمارے نام سے اب تک یہ رسوائی نہیں جاتی

کوئی تکلیف ہو تو آنکھ گھر کی سمت اٹھتی ہے
دیارِ غیر میں غم کی دوا پائی نہیں جاتی

کوئی تنہا ہو تو اُس کا مدادِ سوچ سکتے ہیں
مگر ذہنوں میں بیٹھی ہو جو تنہائی نہیں جاتی

چراغاں سا ہوا دل کی گلی میں
عجب تھی روشنی اُس آدمی میں

وہی خوشبو، وہی ریشم سی باتیں
ابھی ہوں خواب کی آوارگی میں

پرندے ہجرتوں کے لوٹتے ہیں
مہک سی ہے ہواؤں کی نمی میں

کہاں پر ہو ستمبر کے مہینے
تمہاری یاد آئی جنوری میں

آنکھوں سے سارے خواب پڑا گئی ہوا
روشن دیئے تھے جن کو بجھا کر گئی ہوا

بس ایک ہی گلاب تھا آنکھوں کے زو برو
خوشبو تمام جس کی اڑا کر گئی ہوا

بجتی رہی ہیں رات بھر کمرے کی کھڑکیاں
احساسِ جبر یار جگا کر گئی ہوا

پھولوں کو چھو کے، سامنے آئی، سحر گئی
دروازے تری یاد کے وا کر گئی ہوا

یونہی کب کسی کا ہوا ہے کوئی
 محبت بھی کیا آسرا ہے کوئی

مہاجر پرندے ' ہوا ' خوشبوئیں
 کبھی روکنے سے رکا ہے کوئی

وہی تُو ' وہی تیری باتیں مگر
 مجھے کیوں لگا دوسرا ہے کوئی

یہ دل وہ خرابہ کہ جس میں کبھی
 میرے ساتھ برسوں رہا ہے کوئی

شگفتگی گلاب کی تیرے لبوں پہ ختم ہے
مرا جنونِ شوق بھی انہی حدوں پہ ختم ہے

کہ تیرے منکرین پہ تیری عنایتیں بہت
مگر عذابِ جسم و جان عاشقوں پہ ختم ہے

نہی تکی تھی رہگذر ہوئے انتقام کی
گھروں سے ابتدا ہوئی تو معبودوں پہ ختم ہے

بہت دنوں غلاؤں میں جو ہو رہی تھی بے سبب
وہ گردشِ خیال تیرے محوروں پہ ختم ہے

ایسے ہنگاموں میں کیا گھر جاؤں میں
کوئی پتھر ہی لگا کر آؤں میں

یاد کے سارے جزیرے بے نشان
اپنی کشتی کو کہاں لے جاؤں میں؟

جب کوئی ملنے کی صورت ہی نہ ہو
ایسی سماعت میں تجھے یاد آؤں میں

آسمانوں کے پرندوں کی طرح
اب ہواؤں کے سفر پر جاؤں میں

تحلیل جو خود سے یہ اندھیرا نہیں ہوتا
چڑیوں کے چہکنے سے سویرا نہیں ہوتا

ہم وہ کہ ٹھہرنے سے بہت خوف زدہ ہیں
ہم سے کسی دل میں بھی بسیرا نہیں ہوتا

برسوں سے میرا اُس سے تعلق تو ہے لیکن
یہ خواب میرے ساتھ ہے، میرا نہیں ہوتا

خُشبو ہے تو ہمسائے بھی معلوم کریں گے
یوں برگِ گلِ جاں کو پکھیرا نہیں ہوتا

ایک دن آواز پر گھل جائے گا در دیکھنا
پھر کبھی اندر سے یہ آسیب کا گھر دیکھنا

ہے فصیل شہر کے باہر سپاہ دشمنان
اے سپہ سالار ! اپنا لاؤ لشکر دیکھنا

کون بھولے گا بھلا وہ ریل کا پہلا سفر
سو بہانے سے وہی چہرہ مکرر دیکھنا

ڈوبنے والوں کو اپنے ناخدا پر چھوڑ دے
اس گھڑی تُم بادباں جلنے کا منظر دیکھنا

دل پر تیرے بجر کا موسم بار نہیں ہوتا
برگ گل پر قطرہ شبنم بار نہیں ہوتا

تیری کڑوی، کیلی باتیں سب منظور مجھے
زخم پہ لگنے والا مرہم بار نہیں ہوتا

اپنی اتا کے قتل پہ میں ہی پھوٹ کے رویا ہوں
دشمن کے مرنے کا ماتم بار نہیں ہوتا

کبھی کبھی تو لمس ہوا سے چوٹیں لگتی ہیں
کبھی تو دل پر پتھر سا غم بار نہیں ہوتا

بدن شکستہ ' ہوا کا دباؤ چاروں طرف
پھنسی ہے سیلِ حوادث میں ناؤ چاروں طرف

نظرِ نظر مجھے صحرا کی پیاس دیتی ہے
کبھی تو لمس کا پانی بہاؤ چاروں طرف

بس اک خیال کو کیا عمر بھر سنوارو گے
ہوا و ریت پہ شکلیں بناؤ چاروں طرف

کچھ اجنبی سے خیالاتِ دل میں در آئے
بدن کے شہر میں پھیلا تناؤ چاروں طرف

سینے میں کسک، آنکھ میں منظر نہیں کوئی
دے آگ کو دامن سے ہوا، ڈر نہیں کوئی

اک یاد کا بادل کہ تمازت سے بچائے
صحرا کے مسافر کے لئے گھر نہیں کوئی

آہٹ بھی ہے، دروازے کی زنجیر بھی ہلی
اور یہ بھی جانتا ہوں کہ باہر نہیں کوئی

اتنی سی مسافت کے لئے خوفِ سفر کیا؟
آ، تیرے میرے بچ سمندر نہیں کوئی

پیاں بھی ہے اور کچھ تسکین بھی
ہاتھ میں دُنیا بھی ہے اور دین بھی

خواب بچوں کے بنائے مَھول ہیں
ٹپڑھے میڑھے بھی مگر رنگین بھی

عشق ہے تو ناز برداری بھی ہے
اِس میں ہے اعزاز بھی، توہین بھی

ذائقہ بچے ہوئے ایام کا
تلخ بھی، نمکین بھی، شیریں بھی

دُشمنوں کے وار تو پہلے ہی سقا کا نہ تھے
دوستداری کے بکلاوے بھی ریا کارانہ تھے

پھر پرندوں کی طرح اُڑنے کو جی کرنے لگا
ایک دو پہلو گئے موسم کے ہمدردانہ تھے

جانے کیوں ہم سے نہ یہ خالی مکاں دیکھا گیا
یوں تو اس ہمسائیگی سے آج تک بیگانہ تھے

سبز موسم میں ہرے پتوں کو گرتے دیکھ کر
سوچتا ہوں اب، مرے شبہات بھی بے جانہ تھے

شکستِ قوتِ گفتار یعنی تیری خاموشی
ہوا کو کائناتی تلوار یعنی تیری خاموشی

کنارِ آب بھی ہے، چاندنی بھی، جذبہٴ دل بھی
مگر چھتی ہے میرے یار یعنی تیری خاموشی

جہاں ہم ہیں وہاں دکھ درد کا کیا کام ہے لیکن
وہی ہے در پئے آزار یعنی تیری خاموشی

یہی ہے جو کہ حائل ہے تمہارے میرے رستے میں
حریفِ بُرأتِ اظہار یعنی تیری خاموشی

کشتی ٹوٹ چکی تھی ، پانی گہرا تھا
میری آنکھوں میں اک خواب جزیرہ تھا

چاروں سمت ہوائیں اُس کو روتی ہیں
جانے کس کے نام وہ جھونکا لکھا تھا

مرے لئے تو سارے موسم ایک سے تھے
دریا پار اُتر کر آگے صحرا تھا

اک معصوم سی خواہش پر سو اندیشے
جادوگر کے قبضے میں شہزادہ تھا

گزر یہاں سے گیا اور ادھر نہیں آیا
نہالِ خواہشِ دل پر ثمر نہیں آیا

یہ کیسا دشت کا چکر ہے میرے پاؤں میں
سفر تمام ہوا اور گھر نہیں آیا

نہ جانے کیسی کشش ہے کہ گھر ہوئے خالی
یہاں سے جو بھی گیا لوٹ کر نہیں آیا

اُنڈ کے آئے ہیں اندیشہ ہائے دُور دراز
کئی دِنوں کا گیا ، نامہ بر نہیں آیا

سفر میں کچھ نہ کچھ رنج سفر بھی ہونا تھا
جو سر لیا ہے تو پھر دردِ سر بھی ہونا تھا

اُڑان کے لئے بس عزم ہی نہیں کافی
اُڑان کے لئے تو بال و پر بھی ہونا تھا

وہ ابتدا تھی تو یہ انتہا اُسی کی ہے
کہ دل کے درد کو دردِ جگر بھی ہونا تھا

کہاں لئے پھروں میں آرزوئے دل جاناں؟
یہ شوق پالنے کو ایک گھر بھی ہونا تھا

وہ مجھ سے منحرف میرے ہر اک سخن پر ہے
عجب مزاج کا اک شخص میرے اندر ہے

میں مبتلا ہوا کس کرب خود تلاشی میں
نہ راستہ ہے کوئی اور نہ میل پتھر ہے

اٹھا کے پھینک دوں ایسی جگہ ملے تو سہی
کئی دنوں سے میری آنکھ میں وہ منظر ہے

نہ جانے کونسے پل دشمنوں کی یورش ہو
فصیل ذات کے باہر غموں کا لشکر ہے

میں نے کل رات خواب دیکھا ہے
میرے در پر ہوا کا جھونکا ہے

بارشوں سے وہ خوب بھیگا ہے
دھوپ میں ایک شخص بیٹھا ہے

قہقہوں کی مہوار ہے گھر میں
اور چھت پر کوئی سسکتا ہے

بھیر کتنی ہے شاہراہوں پر
دیکھنے وہ بھی گھر سے نکلا ہے

وہ جس کو میرے چھونے سے بھی اجتناب تھا
کل رات کے سفر میں مرا ہمرکاب تھا

دریا نے اپنی پیاس بجھائی کچھ اس طرح
بستی میں صرف میرا مکاں زیرِ آب تھا

اُترا سڑک سڑک پہ خیالات کا ہجوم
پچھلے دنوں یہاں پہ بڑا انقلاب تھا

منظر تمام دِل کے اُفق پر رقم ہوا
روشن کسی کی یاد کا اک آفتاب تھا

کوئی شب بھر سرہانے جاگتا ہے
مرے اندر سمندر سو رہا ہے

ابھی کمرے میں ہلکی روشنی ہے
پس دیوار کوئی کھانتا ہے

پرندے ٹہنیوں سے اڑ چکے ہیں
وہ آگن میں کھڑا کچھ سوچتا ہے

وہ اپنا بوجھ سہتے تھک گیا تھا
مرے دامن میں آ کے پھل گرا ہے

یہ سانحہ بھی میری زندگی میں لکھا تھا
تمہارے سامنے ہو کر بھی کچھ نہ کہنا تھا

وہ اپنی موت کا منظر بھی کتنا بھونڈا تھا
میں اپنے آپ سے باہر نکل کے آیا تھا

نہ کوئی وعدہ نہ اُمید ہی مگر پھر بھی
سیاہ رات کو پلکوں پہ لیکے بیٹھا تھا

یہ تیرا نام ہتھیلی پہ اُگ گیا کیسے
کہ میں نے اس کے لئے اور نام سوچا تھا

کب تم سے محبت کا صلہ مانگ رہا ہوں
ناداں ہوں جفاؤں پہ جفا مانگ رہا ہوں

اس طرح تقاضوں پہ تو برہم نہ ہوا کر
محرومی قسمت کی وفا مانگ رہا ہوں

مجھ سے نہ مسیحائی کا احسان اُٹھے گا
جلتا ہوا پیکر ہوں، ہوا مانگ رہا ہوں

ہر چیز کے بٹنے کی گھڑی آن پڑی ہے
میں اپنے لئے اپنا خدا مانگ رہا ہوں

دیوار و در کے ساتھ یہاں گھر بدل گئے
آنکھیں کھلیں تو رات کے منظر بدل گئے

یا میں تمہارے شہر سے واقف نہیں ابھی
یا یہ ہوا کہ لوگ سراسر بدل گئے

ایسی تو بات خط میں کوئی تھی نہیں کہیں
الفاظ ڈاک میں کہیں یکسر بدل گئے

میرا تو کچھ نہیں ہے میں ویسے بھی کون ہوں
اس عہدِ آگہی کے پیسیر بدل گئے

آخری شب کے مسافر کو بتائے رکھنا
دشتِ تنہائی میں اک پھول کھلائے رکھنا

شب کے ستارے میں تحلیل نہ ہو جاؤں کہیں
اپنی دہلیز پہ اک دیپ جلانے رکھنا

میں بھٹکتا ہوں خلاؤں میں دُعاؤں کی طرح
رات کو دستِ دُعا آج اٹھائے رکھنا

میں اکیلا تری راہوں کا مسافر ہوں گا
ٹھنڈی چھاؤں کا کوئی پیڑ اُگائے رکھنا

شب کا شکوت توڑ دیں کچھ ہاؤ ہو کریں
آؤ زبانِ جسم میں کچھ گفتگو کریں

ڈھونڈیں وفا کی جنس کو بازارِ دہر میں
یعنی خلاء سے آرزوئے رنگ و بو کریں

اب کے ہوا کو لاد کے گھر میں ہی ڈال دیں
سڑکوں پر گھوم گھام کے کیا دو بدو کریں

اُٹھیئے کہ بارشوں کا کوئی اہتمام ہو
سیراب یہ زمین چلو گوبہ گُو کریں

سُورج بھی سب کے ساتھ تماشا یوں میں تھا
میرا بھی نام شہر کی رُسوائیوں میں تھا

اپنے ہی گھر میں مجھکو نہ پہچان مل سکی
میرا شمار بس یونہی پر چھائیوں میں تھا

وہ بھی بڑے وقار سے چوٹی پہ چڑھ گیا
نیچے بھی انتظار بہت کھائیوں میں تھا

پُر امن شہریوں کا مقرر ہوا امیر
کل سب کے پیش پیش جو بلوائیوں میں تھا

کوئی پتھر بھی نہیں، کوئی شگوفہ بھی نہیں
ایسا معمول سے باہر کبھی سوچا بھی نہیں

ایک مانوس صدا دل میں اُترتی سی ہوئی
اور اس سمت کوئی دیر سے گذرا بھی نہیں

دھوپ چھاؤں کی طرح لوگ یہاں ملتے ہیں
اس شہر کے کسی موسم کا بھروسہ بھی نہیں

تو تصور کی منڈیروں پر چمکتا طائر
آنکھ سے دور نہیں، ہاتھ میں آتا بھی نہیں

تُو آگیا کہ یہ آوازِ پا کا دھوکا ہے
 شعورِ ذات! مجھے انتظار تیرا ہے

فساد ہر طرف برپا ہے دل کی بستی میں
 ترا خیال بھی آکے کہاں پہ ٹھہرا ہے

میں دوسروں کی رفاقت کا اب بھی خوگر ہوں
 یہ کس کی روح کا میرے بدن پہ سایہ ہے

گذشتہ رات سے سُوکھے شجر کی ٹہنی پر
 وہ خوش جمال پرندہ بھی آکے بیٹھا ہے

دیرِ احساس گھلا بھی رکھنا
میرے حصے کی ہوا بھی رکھنا

یہ جو سامانِ سفر ہے ، اس میں
اپنی اتناں کی دُعا بھی رکھنا

شہرِ گنجان ہوا جاتا ہے
جیب میں گھر کا پتہ بھی رکھنا



حصولِ رزق میں پیشِ نظر تھی عزت بھی
چمکائی ہم نے بہت خود سری کی قیمت بھی

ہم ایسے کون تھے مُلکِ سُن کے شہزادے
خلاف تم بھی تھے ، دُنیا کو تھی عداوت بھی

ترے اثر میں میرا دل مری نہیں سُننا
رہی نہ آنکھ میں اس کی ذرا مروت بھی

خیال و خواب، یقین و گماں ہیں میرے ساتھ
تُو ساتھ ہے تو میرے جسم و جاں ہیں میرے ساتھ

یہ غم نہیں تُو میرے دشمنوں میں شامل ہے
یہ دست و بازو بھی میرے کہاں ہیں میرے ساتھ

میں اس سفر میں اکیلا نہیں رہا پل بھر
تمہاری یاد کے دریا رواں ہیں میرے ساتھ



ہوا سوار ہے خوشبو تو میرے گھر آئے
میں انتظار کروں اور وہ ادھر آئے

مجھے تو کوچہ جاناں سے ہو کے جانا ہے
سو میری راہ میں دیوار ہو کہ در آئے

یہ معجزہ تو مری چشم انتظار کا ہے
جہاں بھی دیکھوں مجھے تُو ہی تُو نظر آئے

مجھ سے دور نہیں تھا جب تک پاس نہ تھا
بس اتنی سی بات ہے تب احساس نہ تھا

برسوں بعد ملیں گے اور پہچان بھی لیں
ایسا سوچا تھا لیکن وشواس نہ تھا

تم بھی اپنے شہر میں ہی محصور رہے
میرے پاؤں میں بھی تب بن باس نہ تھا



نہ تیرے ہجر کا موسم، نہ اب وصال کی رُت ہے
یہ ماورائے غم و سرخوشی کمال کی رُت ہے

بزرگ باپ کا دل ڈوبتا، اُبھرتا ہے
جوان بیٹے کے خوں کے اُبال کی رُت ہے

اب اس فضا میں کوئی گنگو کہاں ہوگی
دلوں کے شہر میں اب بھی ملال کی رُت ہے

اُس کے سُخن نے پُھولوں سی خوشبو اُچھال دی
اور میں نے اُس کے پاؤں میں تلوار ڈال دی

یہ شہر یوں نہیں تھا کبھی قدر ناشناس
یہ کس نے اِسکی رُوح بدن سے نکال دی

میں خوش فہم رہا کہ میرا ذکر آئے گا
تم نے تو دوستی کی الگ ہی مثال دی



دستِ مہ و ش سے الگ، رنگِ حنا بے معنی
زندگی تجھ سے حسیں، تجھ سے جدا بے معنی

یہ کسی شخص کے ہونے سے ہی سب اچھا ہے
ورنہ خوشبوئے گل و لمسِ ہوا بے معنی

وہ کہ گردابِ سُخن تھا کہ نظر کا جادو
میں بڑی دیر کھڑا یونہی رہا بے معنی

میں خشکیوں پہ تھا لیکن حصارِ آب میں تھا
بڑا عجیب سا نشہ تری شراب میں تھا

مرا سوال بھی معصوم میرے جیسا تھا
مگر فساد کا پہلو تیرے جواب میں تھا

اسی بنا پہ ہوں گھر کے نصاب سے خارج
اک الف لیلوی قصہ مری کتاب میں تھا



خواب، حقیقت، پیکرِ جاں کا درد سراپا دونوں ہیں
ایک مسلسل جنگ کے درپے آب، جزیرہ دونوں، میں

کس کو روؤں، کس کو دُعا دوں، تیرا ہجر کہ ترا وصال
مجھ ایسے وا ماندہ دل کو خواب تماشا دونوں ہیں

تیرا میرا ایک مُقَدَّر، میں شاعر تو ایک خیال
اس ناطے سے گلیوں گلیوں میں آوارہ دونوں میں

چاند بھر پور تھا ، موسم تھا گلابوں والا
میرے ہمراہ وہی شخص تھا خوابوں والا

دوستوں والی کوئی بات نہیں ہے اُس میں
اُس کی ہر بات میں پہلو ہے کتابوں والا

ناؤ میں سب کو رہی سبز جزیرے کی تلاش
اور آسیب تھا مانجھی پہ سراہوں والا



سبز سہانے خواب کے پیچھے دوڑ پڑے ہیں میں اور وہ
ساحل ساحل ریت کے دریا پھانک رہے ہیں میں اور وہ

انجانے پن میں بھی میرا ، اُس کا ایک تعلق ہے
شام کو بس میں ایک ہی ساتھ سفر کرتے ہیں میں اور وہ

عیاری میں بھولے پن کی اتنی سی آمیزش ہے
چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی لڑ پڑتے ہیں میں اور وہ

چہچہاتے ہیں کئی روز پرندے دل میں
وہ جوق ملتا ہے تو کھلتے ہیں سویرے دل میں

اس طرف آئے سمندر کا مسافر کوئی
منتظر بیٹھے ہیں خاموش جزیرے دل میں

وہ بھی اک لفظ کہ تاثیر بلا رکھتا ہے
سبز موسم کی طرح رنگ پکھیرے دل میں



دُھوپ کے شہر میں اُمید شجر کیا معنی
گھر سے نکلے ہیں تو پھر زادِ سفر کیا معنی

اس تعاقب میں تو جنگل میں ہی رات ہونی تھی
آگ میں گود کے اب جان کا ڈر کیا معنی

اپنے گاؤں میں اُترنے کی خوشی لا محدود
گھر پہنچتے ہوئے یہ دیدہ تر کیا معنی

خوابوں سے کبھی آنکھ کے دو گھر نہیں بھرتے
بارش کے برسے سے سمندر نہیں بھرتے

الفاظ کبھی زخم کا مرہم بھی ہوئے ہیں؟
دریاؤں کی گہرائی کو کنکر نہیں بھرتے

حالات تو بھر دیتے ہیں رشتوں میں دراڑیں
یہ بات الگ ہے کہ برابر نہیں بھرتے



یہ مرحلہ بھی گُماں تھا کہ اپنے بس میں ہے
خبر کہاں تھی شر کوئی خار و خس میں ہے

اسے نہ ہاتھ دکھانا یہ کیا نجومی ہے
میلن بھی جس کو نہیں علم کس برس میں ہے

طلوع اشک سرِ چشم بات کر بھی گیا
ابھی زبان گرفتار پیش و پس میں ہے

انا کی شند ہواؤں میں آ پھنسا تھا میں
تمام عمر یوں سب سے خفا خفا تھا میں

بہت دنوں سے جسے دیکھنے کی خواہش تھی
وہ آفتاب جب نکلا تو سو رہا تھا میں

لبوں پہ کھل نہ سکے میرے خوشنما الفاظ
خزاں رسیدہ زمیں پر اُگا ہوا تھا میں



اس ایک بات کا اب فیصلہ ضروری ہے
قصور کس کا ہے یہ دیکھنا ضروری ہے

اب اس سے بچ کے گزرنا نہیں رہا ممکن
بہت کھٹن ہے مگر راستہ ضروری ہے

تمہارے نام ہی کا حوصلہ رہا باقی
طویل شب میں یہی حوصلہ ضروری ہے

زندگی کے ظلم سے اب سرگراں ہو جائیے
کچھ تو اپنے آپ پر بھی مہرباں ہو جائیے

لوحِ دُنیا پر کوئی تحریر ایسی چھوڑیے
اہلِ دُنیا کے لئے پھر جاوداں ہو جائیے

یا میری بد قسمتی کا ذکر رہنے دیجئے
یا حریفوں کے مقابل ہم زباں ہو جائیے



ابھی ہے ذہن میں میرے گئی رُتوں کی طرح
وہ میرا ساتھ نبھاتا ہے موسموں کی طرح

اسی نے وار کیا مجھ پہ دوستوں جیسا
یہ شخص پہلے ملا مجھ سے دشمنوں کی طرح

کوئی بھی چاہے مجھے اپنے نام اب کر لے
میں راستہ ہوں کھلا عام راستوں کی طرح

درد کبوتر ہے تو اور ٹھکانہ کیا
دل سا اچھا کوئی کبوتر خانہ کیا

قیس کے گھر کا پوچھتے ہو تو دشت چلو
شہر میں آکر ٹھہرے گا دیوانہ کیا



کسی قلم ، کسی قرطاس کی ضرورت کیا
میں تیرا ہوں تو اس بکواس کی ضرورت کیا

جوبات میں نے کی جذبے سے دھل کے نگلی ہے
اسے سمجھنے میں احساس کی ضرورت کیا



ہوائے تند کہ لرزیدہ کوہِ شرتک ہے
اور اس کا راستہ سیدھا ہمارے گھرتک ہے

مجھے یہ دُعم تھا میں بھی کوئی سکندر ہوں
اور اب گھلا کہ میرا حکم میرے درتک ہے

پھول کو پتھر بنائے ، سنگ کو پانی کرے
عشق وہ منتر ہے فانی شے کو لافانی کرے

مُفلسی کھودیتی ہے سب آدمی کا اعتبار
لفظ کو بے صوت کر دے ، حرف بے معانی کرے



صحرائے انتظار کی سب تشنگی مٹا
آنکھیں ملا کے دیکھ لے ابر گریز پا

کس کی تلاش تجھ کو پھراتی ہے گویہ گویا
آ ، مجھ سے کوئی بات کر اے موجہ ہوا



خوشبوؤں کے زیرِ سایہ ، تیلیوں کے درمیاں
میں نے اپنے خواب پالے ہیں گلوں کے درمیاں

مدتوں کے بعد اُس سے بات کرنا یوں لگا
نیند کی ہلکی سی جھپکی رت جگوں کے درمیاں

ہو ایسا ایک بھی لمحہ کبھی خُدا نہ کرے
ترا خیال رہے میری دسترس سے پرے

یہ زخم وہ ہے کبھی مُندل نہیں ہوتا
کبھی جہاں میں خُدا کسی کی ماں نہ مرے



وہ فسوں چہرہ سمجھنے میں ذرا دیر لگی
دراصل رنگ اُترنے میں ذرا دیر لگی

میں کہ تھا چشمِ براہ آپ کی آمد کا ولے
آپ کو گھر سے نکلنے میں ذرا دیر لگی



دیارِ خواب سے برسوں کے رابطے ٹوٹے
وہ کیا گیا میری نیندوں سے سلسلے ٹوٹے

کچھ اس طرح سے کہا اُس نے اب نہیں ملنا
میں دیکھتا ہی رہا دل کے حوصلے ٹوٹے

آئے گی اس طرف بھی ہوا راستے میں ہے
فی الحال میرے دل کا دیا راستے میں ہے



وہ ایک تلی جو پھولوں کے درمیان میں ہے
تیرا خیال میرے دل کے سائبان میں ہے



سُخن پہ بندشیں ہیں ، سوچنے پہ قدغن ہے
اور اس پہ ضد ہے کہ ماحول میں کھلا پن ہے



شراب لب نہ مئے وصلِ یار پیتے ہیں
خیال سونگھتے ہیں ، انتظار پیتے ہیں



ککش ہو ایسی کہ بے اختیار کھینچتا جاؤں
یہی ہو اب کہ میں اپنا مدار بھولتا جاؤں



ایسا کچھ ہو کہ کڑی دھوپ میں برسات بھی ہو
میں تمہیں بھولوں مگر تم سے ملاقات بھی ہو

خالد بشیر احمد جو کہ اردو ادب کے کہنہ مشق شاعر ہیں، اپنی مختلف شعری شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی اشاعت کے حوالے سے ان کی سرگرمیاں حالانکہ کم کم رہی ہیں لیکن انہوں نے شعری اور غزلی دونوں میں شہرت حاصل کی ہے، وہ قابل ستائش ہی نہیں بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ 'صدائے نیم شب' ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ ان کا دوسرا مجموعہ 'خواب پارہ' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ ان دونوں مجموعوں کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی پرکشتی دسترس ہے۔ جہاں تک صنف نثر پر ان کے قلم کی قدرت کا تعلق ہے تو وہ مکمل کے طور پر ان کی شعری آہستگی کے ساتھ ساتھ اردو ادب کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے جو کشمیر کی تاریخ پر مشتمل ہے۔ ان کے فن اور شخصیت کے تعلق سے یہ کتاب 'اشیاء اردو ادب' میں اہم اضافہ ہے۔

پروفیسر ضمیر انوار اہم
شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

خالد بشیر احمد بحیثیت شاعر اور ادبی شخصیت ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ میں بذات خود ان کی شاعری کا قدر دان ہوں۔ غزل کے طاقی نظام اور طاقی ساخت کا رچا ہوا شعروان کی غزلیہ شاعری میں جدت و قدرت کا چمکے جس فنکاری کے ساتھ میں جانتا ہے اس کی طاقتیں زیادہ سے زیادہ ہے۔

”مجھے تو کچھ جاناں سے ہو کے جانا ہے
سہمی راہ آئیں دیوانہ ہو کر دھڑکتے“

صرف یہی ایک شعر ان کی قادر الکلامی کے ثبوت کے طور پر پیش کر دینا کافی ہوگا۔ اردو غزل کی کائنات میں اپنے انفرادی نشان قائم کرنا ہر شاعر کا مقصد نہیں کیونکہ اس سے پہلے کہ شاعر اپنی غزل کے غزل کا صدیوں پرچہ نظام شعرا کو غزل کی غزل لکھنے پر مجبور کر دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شعرا کے لیے اپنی غزل کہنا ٹیڑھی کیر ثابت ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جن اہم ناقدین کے مضامین شامل کیے گئے ہیں ان کی قرات اور بذات خود خالد بشیر کے غزلیہ متن کے مطالعے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے خالد بشیر غزل کی شعری کائنات اور اس کے آسمان پر اپنے انفرادی ستارے ٹانگنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر مہلا بخش

صدر شعبہ اردو دیال سنگھ کالج، دیال پور یونیورسٹی، دیال پور

Tahreek-e-Adab

Urdu Ashiana, 167, Afaq Khan ka Ahata
Manduadeeh Bazar, Varanasi-221103 (U.P.) INDIA
Cell: 0091 - 993-595-7330
e-mail: jaweanwar@gmail.com